احسان اللہ

جماعتِ پنجاب کا دانا معمار

چشمہ میڈیا

احسان اللہ

جماعتِ پنجاب کا دانا معمار

برکت اللہ

چشمہ میڈیا

بار ______________ اول

۲۰۱۸ء

ihsānullāh. jamā'at-e-panjāb kā dānā memār
by Barkatullah

(An edited version of:
klīsiya-e-panjāb kā dānā memār.
ārch ḍīkan ehsānullāh)

© 2018 Chashma Media. This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NoDerivatives 4.0 International License.

Bible quotations are from UGV.
Editing, design and layout (2018) by
Chashma Media, www.chashmamedia.org

فہرست مضامین

1 نارووال کی جماعت 11

نارووال کا قصبہ 11

خواجگان کی قوم 12

اقتصادی حالت 14

مسیح کی جماعت کی ابتدا 15

مِشن سکول کا اثر 19

جماعت کی ترقی 24

شیخ احسان علی المسیح کا پیروکار ہو جاتا ہے 26

2 بٹالہ اور بنّوں کے ایّام 61

بٹالہ	61
سکول میں دوبارہ داخلہ	63
گناہ سے نجات کا احساس	66
بٹالہ میں اُستاد	69
بنّوں میں اُستاد	75
بیرنگ سکول میں دوبارہ خدمت	82
خادم بننے کی خواہش	84
بٹالہ میں تبلیغی خدمت کا آغاز	88
شادی	93
3 نارووال کو واپسی	98
نارووال آنے کی دعوت	98
نارووال میں خدمت کا آغاز	100
نارووال میں منادی کی راہنمائی	103
پورے پنجاب میں خدمت کا آغاز	105

4 اچھوت لوگوں کی مسیح تک تحریک 108

تحریک کی جڑیں 108

اچھوت لوگوں کو تعلیم دینے کا چیلنج 112

5 دبے ہوؤں کی تربیت 120

اُستادوں کی تربیت 121

ہر گاؤں میں سکول کا انتظام 125

نارووال میں بورڈنگ کا انتظام 126

مل کرمیلوں میں انجیل کا پرچار 129

ہدیہ دینے پر زور 131

مفت میں خدمت کرنے پر زور 132

6 نارووال میں تبلیغ 134

ڈیکن کا عہدہ 134

بھائی رحمت علی کو شک آتا ہے 137

وبائی بیماری کے دوران خدمت 159

دیہات میں روحانی تبدیلی 162
تعلیم اور صحبت سے شاگردیت 176
اہلیہ کی سکولوں میں خدمت 183
نارووال میں نئی عبادت گاہ کی تعمیر 186

7 پورے پنجاب کی خدمت 189
ممبئی کی کانفرنس (1893ء) 189
مرزائے قادیانی کے ساتھ مباحثہ 192
پریسٹ کے عُہدے پر تقرر 195
جنرل بوتھ کے ہمراہ 197

8 بیداری 210
خدمت کرنے کا نیا ولولہ 210
انگریزیت سے جہاد 212

9 سیالکوٹ کنونشن کا آغاز 247
نارووال 247

سیالکوٹ 255

ظفروال 259

نڈالہ 266

شکرگڑھ 271

دہلی تک کا دورہ 284

بوبک مرالی 294

واعظ کے ساتھ خدمت 296

کانگڑہ 299

راجا شام سنگھ کے ہاں تاج پورہ میں 301

چیت رام کا اثر 311

پشاور 314

آگراہ 316

الہ آباد 320

پسرور 322

بارہ پتھر سکول 327

یو۔پی مشن میں اپنی مدد آپ کی تحریک 330

چرچ مشن کا اختلاف 334

راول پنڈی 336

اہلیہ میں جنون کے پہلے نشان 341

دہلی تک کا دوبارہ دورہ 344

10۔یورپ اور امریکہ کا دورہ 349

امریکہ آنے کی دعوت 349

انگلینڈ کا دورہ 352

امریکہ کا دورہ 360

اہلیہ پر دیوانگی کا غلبہ 363

کینیڈا اور یورپ سے ہوکر واپسی 365

11 جھنگ بار کی خدمت 370

بیٹ من کی دعوت 370

جھنگ بار میں خدمت کا آغاز 375

جھنگ بار کا انتظام ٹھوس کرنے کے اقدام . . . 389
فرقہ بندی کے خلاف کوششیں 392
سرگودھا کا انتظام ٹھوس کرنے کے اقدام 394
چرچ مشن کی راہنمائی میں تبدیلیاں 396

12 شیخ رحمت علی کا عیسائی ہونا 400

زلزلہ اور وبا 400
عیسائی ہونے کا علانیہ اقرار 404
بپتسمہ اور یگانوں کا دباؤ 426
بیٹے برکت اللہ کی ایمان تک راہ 431
رحمت اللہ کی گواہی 444
رحمت اللہ کی محبت کا غلبہ 447

13 جھنگ بار کا مشنری انچارج 461

جھنگ بار پر تقرر 461
ملتان میں جلسے 465

دہرہ دون میں جلسے 466

غیر مسیحیوں سے مناظرے 468

جھنگ میں طلبا کے پریکٹیکل 473

14 اپنی مدد آپ کی تحریک 479

15 آرچ ڈیکن آف دہلی 489

آرچ ڈیکن کا عُہدہ 489

لکھنؤ کی کانفرنس (1911ء) 495

اپنی مدد آپ پر زور 497

ہولی ٹرینٹی پر تقرر 502

16 خدمت کے آخری ایّام 511

کینن کا عہدہ 511

کینن کے دورے 514

17 زندگی کے آخری ایّام 530

1
نارووال کی جماعت کا آغاز

نارووال کا قصبہ

اُنیسویں صدی کے وسط میں نارووال ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جو تحصیل رعیّہ ضلع سیالکوٹ میں واقع تھا۔ یہ قصبہ دریائے راوی کے شمال کی جانب چند میل پر واقع ہے۔ اُس زمانے میں نہ کوئی ریل تھی اور نہ پکّی سڑک تھی۔

کہتے ہیں کہ ساڑھے پانچ سَو سال ہوئے ضلع ملتان کے چند اروڑے ہندو خاندان سیّد جنیب اللہ کے ذریعے مسلمان ہو

کر مشرق کی جانب چل پڑے اور اِس جگہ رہائش پذیر ہو گئے۔ ایک جاٹ نارسنگھ نام بھی اُن کے ساتھ ہولیا جس کی وجہ سے اِس مقام کا نام نارووال پڑ گیا۔ سیّد جنیب اللّٰہ کی خانقاہ شہر کے باہر موجود ہے۔

خواجگان کی قوم

یہ مسلمان تاجر تھے۔ وہ خواجگان کہلاتے تھے اور جموں کے راجاؤں کے زیرِ حکومت تھے۔ وہ مذہب کے شیعہ تھے اور اِس مذہب کے دل دادہ۔ وہ نماز، روزہ اور دیگر رسوم کے سخت پابند تھے۔ ایّامِ مُحرّم میں تعزیہ نکالنا، ماتم کرنا اور مرثئے پڑھنا اُن کا معمول تھا۔

جس زمانے کا ہم ذکر کرتے ہیں نارووال کی آبادی دو تین ہزار سے زائد نہ تھی۔ قصبے کا بڑا بازار اِس کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا تھا۔ ایک حصّے میں قومِ خواجگان آباد تھی اور دوسرے حصّے میں ہندو، سکھ اور اہلِ سنّت بستے تھے۔ لیکن

دونوں حصّوں میں کسی قسم کی دُشمنی یا عداوت نہ تھی۔ اِس کے برعکس ہندوؤں، سِکّھوں اور شیعوں میں برادرانہ تعلّقات تھے، کیونکہ شیعہ توہّم پرستی اور قبر پرستی میں مبتلا تھے اور ہندو شیعہ ایک دوسرے کے مذہب میں گویا شریک تھے۔ شیعہ دیویوں کو پوجتے، چُٹیا رکھتے، تیرتھوں کو جاتے تھے جبکہ ہندو شیعہ مل کر پیروں فقیروں کو مانتے، جنیب اللّٰہ شاہ کی خانقاہ کی پرستش کرتے، تعزیہ پرستی میں حصّہ لیتے اور تعزیوں کے سامنے مَنّتیں مانتے تھے۔ دونوں مذہبوں کے چھوٹے بچّے بڑوں کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان "چچا" اور "تایا" کہتے تھے۔ ہندو مسجدوں میں جا کر مسلمانوں کی مشورتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقعے پر یا بیماری اور موت کے موقعے پر ہندو مسلمان برابر کے شریک ہوتے تھے۔

اقتصادی حالت

اُس زمانے میں قصبے میں روپئے پیسے کے سِکّے عام نہیں تھے۔ لوگ اناج ہی سے تجارت کرتے تھے۔ دھوبی کی دُھلائی، درزی کی سلائی، جولاہے کی اُجرت وغیرہ اناج ہی سے ادا کی جاتی تھی۔ صرافوں کی دکانوں پر کَوڑیوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا، اور ایک آنے میں 24 کَوڑیاں ملتی تھیں۔ بعض اوقات اِن کوڑیوں سے مال مول لیا جاتا تھا۔

خواجگان کی قوم تجارت پیشہ تھی، اورسب بیوپار تھے__ کوئی چھوٹا، کوئی بڑا۔ نارووال ایک دُوراُفتادہ قصبہ تھا۔ وہاں تک جانے کی سب سڑکیں کچّی تھیں، اور وہ ہرطرف سے ندی نالوں اور راوی دریا سے گِھرا ہوا تھا۔ لہٰذا اُن دنوں میں سفر کرنا عذاب تھا۔ لوگ قصبے کے باہر جانا نہیں چاہتے تھے، اور رفتہ رفتہ قوم کا اکثر حصّہ غریب اور نادار ہوگیا۔ لیکن کسی نے اِس قوم میں کبھی کسی کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔ بعض

خاندان تنگ آ کر لاہور، امرتسر، بٹالہ وغیرہ شہروں میں جا بسے جہاں وہ مال دار ہو گئے۔ بعض خاندانوں نے اِرد گِرد کے گاؤں میں ڈیرا جما لیا اور بیوپار کر کے خوش حال ہو گئے۔ کفایت شعاری اِس قوم کی خصوصیت تھی جس کا قُدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے افراد عموماً خوش حال رہے۔

مسیح کی جماعت کی ابتدا

ایک دن قومِ خواجگان کا چودھری شیخ حسین بخش حکومت کے لالچ سے تنگ آ کر سیالکوٹ گیا۔ وہاں اُس کی مُلاقات ایک پردیسی بنام فِٹس پیٹرِک[a] سے ہوئی جس نے اُسے انجیل جلیل کی خوش خبری سُنائی۔ اِس نجات بخش پیغام میں کچھ ایسا جادو تھا کہ اُس نے المسیح کے قدموں میں آنے کا فیصلہ کر لیا اور امرتسر جا کر 1854ء میں بپتسمہ پا لیا۔ جب وہ نارووال واپس آیا تو اُس کے اپنے اجنبی ہو گئے۔ اُسے طرح طرح کی

T.H. Fitzpatrick[a]

تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا، پر وہ ذرا نہ گھبرایا بلکہ مردانہ وار تمام مشکلات پر غالب آیا۔ اُس کی رات دن یہی دُعا تھی کہ اُس کے تینوں بیٹے بھی المسیح کے فرماں بردار ہو جائیں۔ اُس کا مسیحی نام پولُس رکھا گیا تھا، اورغیرت کے لحاظ سے یہ نام موزوں تھا۔ خدا نے اُس کی دُعا سُن لی اور اُس کی وفات (1870ء) سے پہلے اُس کا دوسرا بیٹا صادق مسیح فروری 1859ء میں اور پہلا بیٹا نُصرت اللہ اُسی سال کے دسمبر میں اپنی بیویوں سمیت خداوند مسیح کے قدموں میں آ گئے۔

تیسرا بیٹا 1876ء میں المسیح کا پیروکار ہو گیا۔ اُس کا نام علی محمد تھا۔ اُس کی عادت لڑائی جھگڑے کی تھی جس کی وجہ سے لوگ اُسے "کُپتّا" بُلایا کرتے تھے۔ مسیح کا پیروکار ہو کر اُس کی طبیعت ایسی بدل گئی کہ اُس کا نام "سُپتّا" پڑ گیا۔ میاں پولُس کا چوتھا بیٹا نِکّو شاہ سب کے بعد ایمان لایا۔

نارووال میں پہلے پہل دو پردیسیوں[a] کو انجیل جلیل کا پیغام سُنانے کا شرف حاصل ہوا۔ جس مقام پر آج کل عبادت گاہ کھڑی ہے اُس کے سامنے بَڑ کا ایک بڑا درخت ہوتا تھا۔ اِن مُنادوں نے اُس کے سائے میں نارووال کے باشندوں کو آرامِ جان کی خوش خبری سُنائی۔

1870ء میں بیٹ من[b] پہلی دفعہ اور پھر 1872ء میں نارووال آیا۔ بیٹ من بڑا زبردست مبشّر تھا۔ وہ نارووال کی روحوں کا پیاسا تھا۔ اُسے دن رات ایک ہی دُھن لگی تھی کہ کس طرح اُن ہزاروں روحوں کو اُن کے نجات دہندے کے قدموں میں لائے۔ اُس نے خواجگان کے محلّے میں رہائش اختیار کر لی اور انگریزی لباس کو خیر باد کہہ کر کُرتہ پاجامہ پہن لیا۔ جس مکان میں وہ رہتا تھا وہ کچا تھا۔ اُس کے گھر کا یہ حال تھا کہ ؎

---

[a] فِٹز پیٹرِک اور سٹرا برِج (Strawbridge)
[b] Rowland Bateman

> ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
> گیر و دار و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست
> جو بھی بات کرنا چاہے اپنی مرضی سے آئے اور اپنی مرضی سے جائے۔
> حاکم، ڈیوڑھی کا محافظ یا دربان اِس درگاہ میں نہیں ہے۔

اُس کی بازاری مُنادی اوراَن تھک کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مِشن سکول کے طلبا یکے بعد دیگرے المسیح کے قدموں میں آنے لگے۔ یوں مُنصف شیر سنگھ باجوہ، رحمت مسیح واعظ اور اُن کے بھائی احمد مسیح، حمید الدین سالک، دینا ناتھ، وِدھاوا مل، وارث الدین، سُنت شاہ، ڈاکٹر میران بخش عطارو، ڈاکٹر دینا ناتھ پریتو دِتّا جیسے لوگ دُنیا اور اپنے رشتے داروں کی محبت سے منہ موڑ کر آخرت کو دُنیا پر ترجیح دے کر المسیح کے پیروکار ہو گئے۔

ہرطرف شور مچ گیا۔ لیکن فساد اورغوغا کے باوجود خداوند کا یہ جوشیلا مبلّغ نہایت دلیرانہ کام کرتا گیا اور جوان ہندوؤں،

مسلمانوں اور سکھوں کو نارووال اور اُس کے مضافات میں انجیل کا نجات بخش پیغام سُناتا رہا۔

مِشن سکول کا اثر

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بیٹ من کی آمد سے پہلے ہی مِشن سکول کے ہیڈ ماسٹر بھولا ناتھ گھوش تھے جو خداوند مسیح کے عشق میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ صلیب کے جان نثار سپاہی اور انجیل کے پیغام کو ہر ادنیٰ و اعلیٰ تک پہنچانے میں ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ اُن کی مسیحی زندگی کا اثر نارووال پر عموماً اور مِشن سکول کے طلبا پر: خصوصاً بہت گہرا تھا۔ طالبانِ حق کے لئے اُن کے گھر کے دروازے چوبیس گھنٹے کھلے رہتے تھے۔ اور اُن کی بھولی بھالی محبت بھری زندگی نے چھوٹوں اور بڑوں سب کو موہ لیا تھا۔

اِدھر پردیسی مبلّغ جوش سے بھرپور، اُدھر سکول کا بنگالی ہیڈ ماسٹر عشقِ مسیح میں سرشار تو جماعت کیوں نہ سرسبز و

شاداب ہوتی؟ انجیل کی تعلیم سوسائٹی کے حکم کے مطابق تمام مِشن سکولوں میں لازمی قرار دی گئی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب دینی گفت گو کرنے کا موقع ہر وقت ڈھونڈتے تھے۔ اُن کا ایک شاگرد رشید لکھتا ہے،

سب سے پہلے گھنٹے میں وہ ہم کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ جب کبھی سبق یاد نہ ہوتا—مارکون کھائے، کیونکہ وہ بُری طرح مارتے تھے—بس جاتے ہی دین کا کوئی مسئلہ چھیڑ دینا، انجیل پر کوئی اعتراض کر دینا۔ پھر گیا ایک گھنٹا، دو گھنٹے، تین گھنٹے، لگاتار جماعت کی تبدیلی کے بغیر مباحثہ ہوتا رہتا۔ ہفتے میں ایک دو دفعہ ضرور ایسا ہو جاتا، مگر ہمارے بُزرگ بابو صاحب ہماری شرارت کو مُطلق نہ سمجھتے۔ وہ اپنے دینی مسائل میں ہی غرق رہتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی تو ہم کو خاک نہ آئی، لیکن عیسائی تعلیم اور اسلام اور ہندو مذہب کی ہم کو بہت اچھی واقفیت حاصل ہوگئی۔

طلبا سکول کے باہر اپنے والدین سے قرآن ، حضرت محمد ، پرانوں اور ویدوں کی تعلیم اور کرشن مہاراج کی زندگی کی نسبت پوچھتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر کے طریقِ کار کا اثر سکول کے اساتذہ پر قُدرتی طور پر ہونا تھا اور ہوا۔ چنانچہ فارسی کے اُستاد مولوی احمد بخش جو طبیعت کے لحاظ سے صوفی تھے اُنہوں نے کسی کو انجیل پڑھنے سے یا مسیح کا پیروکار ہو جانے سے کبھی نہ روکا۔ اور نہ اُنہوں نے انجیل کے خلاف کبھی کوئی کلمہ منہ سے نکالا۔

بیٹ من 20 نومبر 1873ء کے روزناچے میں لکھتے ہیں،

> مَیں شہر میں صادق کے گھر تھا۔ سکول میں پڑھایا۔ بازار میں مُنادی کی۔ لڑکوں کو فُٹ بال کھیلنے کے لئے اکٹھا کیا۔ وارث آیا اور اُس نے صاف طور پر اقرار کیا کہ مَیں مسیح پر ایمان لایا ہوں اور بپتسمہ پانے کو تیار ہوں۔ رفتہ رفتہ بہت لڑکے جمع ہو گئے۔ جب میراں بخش نے اپنے ایمان کی پختگی کا اقرار کیا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اُس کا باپ احمد بخش کچھ تو انجیل کی تعلیم سے، کچھ بھولا ناتھ گھوش کے مسیحی اخلاق اور بے ریا

زندگی سے اور کچھ اپنے بیٹے کے خیالات سے متاثر ہو گیا ہے۔

غرض سکول کے لڑکوں کا ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا۔ اِن لڑکوں میں مسلمان تھے، ہندو تھے اور سِکھ بھی تھے۔ لیکن صرف چند ایک کو ہی یہ توفیق ہوئی کہ وہ جرأت کر کے علانیہ اپنے نجات دہندے مسیح کا اقرار کر کے بپتسمہ پائیں۔ عیسیٰ مسیح نے سچ کہا کہ بُلائے ہوئے تو بہت ہیں، لیکن چنے ہوئے کم۔[a] اِن چُنے ہوؤں نے اپنے نجات دہندے کی دعوت کو قبول کیا اور اُس کا وعدہ سچّا پایا کہ دُنیا کے طاقتور

> لیلے سے جنگ کریں گے، لیکن لیلا اپنے بُلائے گئے، چنے ہوئے اور وفادار پیروکاروں کے ساتھ اُن پر غالب آئے گا، کیونکہ وہ ربوں کا رب اور بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ (مکاشفہ 17:13–14)

[a] متی 22:14

جن لوگوں نے نجات کی دعوت قبول کرنے کی سعادت پائی اُنہوں نے خدا کو پا لیا اور جو "روزمرہ کی پریشانیوں اور دولت کے فریب"[a] میں آ کر رہ گئے وہ زندگی بھر دستِ تاسّف مَلتے رہے۔

یہ وہ ابتدائی زمانہ تھا جب نارووال میں کوئی عبادت گاہ نہ تھی۔ عبادت سکول میں ہوتی تھی، اور لوگوں کو بپتسمہ بھی سکول میں ہی دیا جاتا تھا۔ مِشن سکول روحانی زندگی کا مرکز تھا جہاں سے آفتابِ صداقت کی شُعاعیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ جب کوئی بپتسمہ پاتا توسکول میں طلبا کی تعداد فقط پانچ دس رہ جاتی، لیکن چونکہ اُستاد اپنے مضامین جاں فشانی سے پڑھاتے تھے اور لڑکوں سے خوب محنت کرواتے تھے یہ حالت صرف چند روزہ ہوتی اور رفتہ رفتہ طلبا واپس سکول میں باقاعدہ حاضر ہو جاتے تھے۔

---

[a] متی 22:13

جماعت کی ترقی

1874ء میں نارووال کی پہلی عبادت گاہ اُس مقام پر تعمیر کی گئی جو صادق صاحب نے دی تھی۔ یہ جگہ محلّۂ خواجگان کے اندر اُس مقام پر واقع تھی جہاں "چھوٹی مسجد" کی طرف سے بازار کو مشرقی جانب کو جانے کے لئے مڑتے ہیں۔ اِس مسجد اور نئی عبادت گاہ کے درمیان کوئی پچاس گز کا فاصلہ تھا۔ عبادت گاہ سڑک کے کنارے پر ہی واقع تھی۔ اُس کے دروازے اور محرابیں وغیرہ مسجدوں کے دروازوں اور محرابوں کی مانند تھیں۔ سڑک کی جانب کے تینوں دروازوں پر کتابِ مقدّس کی آیات بڑی خوب صورتی سے لکھی تھیں جن کو ہر شخص آتے جاتے پڑھتا تھا۔

اپریل 1905ء میں ایسا زبردست زلزلہ آیا کہ کانگڑہ کی وادی تباہ ہوگئی۔ اُس کے جھٹکوں نے شمال ہندوستان کے تمام مقامات کو تہ و بالا کر دیا۔ نارووال میں مشکل سے کوئی

مکان ہو گا جو شکستہ نہ ہوا۔ یہ عبادت گاہ بھی مختلف جگہوں سے شکستہ ہوگئی اور عبادت کے کام کی نہ رہی۔ اُس کے میناروں کو مسمار کرنا پڑا تاکہ ارد گرد کے مسلمان قصابوں اور خواجگان کے گھروں پر نہ گر پڑیں۔ 1922ء میں اِس مقام پر ایک دو منزلہ مکان بنایا گیا جس کو چند سال بعد کسی مسلمان نے خرید لیا۔

جس زمانے میں بیٹ من نے یہ عبادت گاہ تعمیر کی تھی اُن دنوں میں نارووال اور مضافات سے متعدد ہندو، مسلمان اور سکھ مسیح پر ایمان لائے۔ تعداد کا اندازہ اِس امر سے ہو سکتا ہے کہ روزنامچہ خوشی اورشکر گزاری سے معمور ہے۔

1888ء کے آخر میں بیٹ من نے سرکار سے وہ جگہ خریدی جو اب "جھنڈا" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مقام پرانے وقتوں میں پولیس کا تھانا تھا جو شہر کے اندر تھا۔ منٹگمری اِس کو فروخت کرنا چاہتا تھا۔ بیٹ من نے یہ خبر پا کر اُسے لکھا کہ

جو شخص سب سے زیادہ قیمت ادا کرے مَیں اُس سے پچاس روپئے زیادہ دینے کو تیار ہوں۔ بیٹ من نے اِس جگہ اپنی رہائش اختیار کر لی۔ وہ اُس بنگلے میں جو شہر کے باہر تھا رہنا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ شہر کے غیر مسیحی اُس کے پاس یہاں ہر وقت دن یا رات کو آ جا سکتے تھے۔ اُس کے گھر کے دروازے حق کے متلاشیوں کے لئے دن رات کھلے رہتے تھے۔ بیٹ من نے اِس گھر کو قدرے تبدیل کرنے سے اپنے رہنے کے قابل بنا لیا۔

شیخ احسان علی المسیح کا پیرو کار ہو جاتا ہے

گھر کی کٹر شیعہ حالت

ہم نے قدرے طوالت کے ساتھ نارووال میں جماعت کے آغاز و قیام کا ذکر کیا ہے تاکہ ناظرین کو اُس زمانے کے ماحول کا پتا لگ جائے جب قومِ خواجگان میں سے متعدد خوش

حال اور آسودہ خاندان اور افراد اپنے مذہب اور رشتے داروں کو خیر باد کہہ کر مسیح کے فرماں بردار ہو گئے تھے۔ شیخ احسان علی بھی اِس قوم کے ایک ایسے فرد تھے۔

شیخ احسان علی کے والد شیخ بَنیا تھے جو چمڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ وہ بڑے زاہد، متقی اور پارسا تھے۔ اِن ہی وجوہات کے باعث وہ خواجگان کی برادری میں ممتاز اور واجب العزت سمجھے جاتے تھے۔ بہ مشکل کوئی شخص تھا جو اُن کا نام لے کر اُنہیں پکارتا تھا بلکہ خطاب کرتے وقت لوگ اُنہیں "جناب" کہتے اور جب اُن کا ذکر کرنا ہوتا تو "جناب بَنیا" یا صرف "جناب" کہتے۔ اُن کا وقت بیشتر مسجد میں کٹتا۔ جب لوگ اُنہیں دُکان پر نہ پاتے تو سیدھے مسجد میں ملنے کو چلے جاتے تھے۔ حُسنِ اتّفاق سے اُن کی شادی بھی ایک ایسی شریف النفس بی بی سے ہوئی جو اُن کی طرح نماز، روزہ اور شریعت کی سخت پابند تھیں۔ اُن کا گھر اسلامی شرع کا آئینہ دار تھا۔ خدا نے اُنہیں تین بیٹے عطا کئے۔ پہلوٹھے

کا نام احسان علی رکھا گیا جو 1858ء میں پیدا ہوا۔ مَنجھلا بیٹا رحمت علی 1860ء میں پیدا ہوا، اور سب سے چھوٹا بیٹا مُحسن علی تھا۔

شیخ بَنیا کا گھر "بڑی مسجد" سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر تھا۔ جب اُن کے بیٹے چار ایک سال کے ہوئے تو اُنہیں مسجد کے مکتب میں ڈال دیا گیا جہاں عربی، فارسی اور اُردو زبانیں سکھائی جاتی تھیں۔ قرآن کا درس دیا جاتا تھا اور شیعہ مذہب کے اُصول کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اُستاد بھی اُنہیں ایسے ملے جو پڑھانے میں ماہر تھے اور تادیب و سرزنش میں بھی کمی نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ جب مَیں نے ایک دفعہ اپنے والد رحمت علی سے ایک استاد کے بُری طرح مارنے کی شکایت کی تو اُنہوں نے ایک نہ سُنی۔ اُنہوں نے تو شیخ سعدی کی گلستان حفظ کر رکھی تھی اور شیخ کا مقُولہ یاد تھا کہ اچھے اُستاد کی سختی باپ کی محبت ہے۔ فرمانے لگے، "تم

سزا کو کیا جانو؟ ہمارے میاں جی ہم کو سننے کا حکم دے کر ہماری پیٹھ پر آگ کی انگیٹھی رکھ دیا کرتے تھے!"

اِس قسم کے استاد کی تعلیم و تلقین کا یہ نتیجہ ہوا کہ "جناب بَنیا" کے بیٹے جب سیانے ہوئے تو قرآن کے حافظ اور شیعہ مذہب میں پکّے ہو گئے۔ اِدھر ماں باپ دونوں صَوم و صلوٰۃ کے پابند، شیعہ مذہب کے اصول و رسوم کے دلدادہ، گھر میں دینی مسائل کا ہمیشہ ذکر رہتا۔ آس پاس کی عورتیں بی بی مریم (احسان علی کی ماں) سے قرآن سیکھنے آتیں اور دینی اُمور سے واقفیّت پاتیں، اُدھر مسجد و مکتب کی تعلیم نے سونے پر سہاگے کا کام دے دیا۔ قِبلہ رحمت مسیح واعظ صاحب اِس خاندان کی نسبت لکھتے ہیں،

احسان مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا۔ مسلمان بھی شیعہ، اور شیعہ بھی متعصب۔ اُن کے خاندان کو اصولئے کہا جاتا تھا۔ گویا اپنی قوم میں مذہب کے لحاظ سے دین داری کا نمونہ تھا۔ یہ لوگ اپنے سوا کسی کو بھی خدا کا بندہ نہیں سمجھتے تھے۔ ہندوؤں

کے ہاتھ کا کھانا اُن کے واسطے ناپاک و حرام تھا۔ تبرّا بازی[a] تو اُن کا مذہبی اصول تھا۔ اِسی وجہ سے یہ اصولئے بھی کہلاتے تھے۔ اگرچہ اپنے مذہب کے پیروکاروں کے سوا سب اُن کی نظر میں مردود تھے، لیکن سب سے زیادہ نفرت اُنہیں عیسائیوں سے تھی۔ جہاں کوئی عیسائی اُن کے سامنے آیا اُنہوں نے اپنے اصول پر فوراً عمل کیا اور تھوک دیا۔ یہی حال شیعہ احسان علی کا تھا۔[b]

سکول میں عیسائیوں کی مخالفت

احسان علی کو علم حاصل کرنے کا از حد شوق تھا۔ حُسنِ اِتّفاق سے نارووال میں مشن سکول موجود تھا جس میں نارووال کے ہندو، مسلمان، سُنّی، شیعہ اور سکھ لڑکے پڑھتے تھے۔ اردگرد کے گاؤں کے لڑکے بھی پَیدل چل کر سکول آیا کرتے تھے۔ احسان علی کو پڑھنے کا شوق تھا، لیکن سکول عیسائیوں کا تھا

[a] کسی گناہ سے برأت یعنی چھٹکارا چاہنا
[b] مسیحی بابت نومبر 1929ء

جس میں انجیل کی تعلیم لازمی تھی۔ پہلے تو وہ ہچکچایا، لیکن چونکہ وہ کٹّر شیعہ تھا اُس نے داخل ہونے میں کوئی ہرج نہ سمجھا۔

احسان سکول کے اوقات میں اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ پڑھتا اور اِس کے بعد اپنے والد بزرگوار کے کاروبار میں مدد دیتا تھا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ سکول کے طلبا کو انجیل کی تعلیم لازمی طور پر دی جاتی تھی اور ساتھ ساتھ ہندو مذہب اور اسلام کے اصول پر بھی بحث ہوا کرتی تھی۔ احسان علی نے انجیل کا مطالعہ کرکے اعتراضات تیار کیئے۔ میاں پولس کا بیٹا میاں نصرت اللہ کتابِ مقدّس پڑھایا کرتا تھا۔ احسان علی نہایت گستاخی سے سخت دل آزاد الفاظ میں اپنے اعتراضات کو پیش کرتا۔ ڈاکٹر دینا ناتھ پریتو دِتّا جو اُن کے ہم جماعت تھے لکھتے ہیں،

احسان انجیل کا جانی دُشمن تھا، کیونکہ وہ کٹّر شیعہ تھا۔ وہ اپنے اعتراضوں سے میاں نصرت اللہ کا ناک میں دم کر دیتا، لیکن

میاں صاحب اُس کے گستاخانہ رویے کا خیال مُطلق نہ کرتے اورنہایت خندہ پیشانی سے اُسے جواب دیتے تھے۔

احسان علی بیٹ من تک کسی کو نہیں چھوڑتا تھا۔ سکول کے اندر اور باہر بازاری مُنادی کے موقعے پر وہ اُن پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتا تھا۔ اُن ایّام میں ایک مسٹر بیُوٹل[a] نارووال کے بازار میں مُنادی کرنے کے کام پر مامور ہوا۔ وہ جہاں کہیں جاتا احسان علی اُس کا پیچھا کرتا اور پنجے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑ جاتا۔ قبلہ واعظ لکھتے ہیں،

بازار میں مُنادی کے وقت تو وہ اِس طرح مسیحی مُنّاد کی جان کے پیچھے پڑ جاتا تھا کہ اب اُسے کچّا ہی نِگل جائے گا۔ لیکن واہ واہ—جہاں ایسے مخالف تھے وہاں صابر بھی موجود تھے۔ بیٹ من صاحب ہی ایسے تھے جو اِس سَولی کو برداشت کرتے تھے۔ یہ گُستاخی کرتا تھا، سخت زبانی کرتا تھا، مگر آگے جواب نرمی اورمحبت سے ملتا تھا۔ جب ہم لوگ ایمان لائے

Beutel[a]

اور وارث جماعت میں داخل ہوا، اُس وقت احسان کا دانتوں کا پیسنا قابلِ دید تھا مگر اُس کا بس نہ چلتا تھا۔

بیٹ من بھی اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے،

احسان علی عیسائی ایمان کا سخت ترین مخالف ہے۔ حتّٰی کہ اُس نے دینی تعصّب کی وجہ سے سکول کو بھی چھوڑ دیا ہے تاکہ اُس کی نجاست سے بچا رہے۔

بیٹ من کے ساتھ سفر

اوائل عمر میں ہی احسان علی کی بینائی میں کمی واقع ہوگئی تھی، اور وہ قُدرتاً اِس کا علاج کرنا چاہتا تھا۔ طبیبوں کے علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اُن دنوں میں نارووال میں کوئی ہسپتال نہ تھا، اور لوگوں نے ''ڈاکٹر'' کا نام بھی نہ سنا تھا۔ چنانچہ جب چرچ مشن نے مردانہ ہسپتال اور زنانہ مشن نے زنانہ ہسپتال کھولا اور ڈاکٹر آئے تو نارووال کے باشندے لفظ ''ڈاکٹر'' کی وجہ سے اِن ہسپتالوں کو ''مردانہ ڈاک خانہ'' اور ''مِسّوں کا ڈاک خانہ'' کہتے تھے۔

بیٹ من اپنے پاس چند انگریزی دوائیاں رکھتا تھا جن سے وہ معمولی امراض کا علاج کیا کرتا تھا۔ اِس وجہ سے احسان علی کبھی کبھی آنکھوں کے علاج کے لئے اُس کے پاس جایا کرتا تھا۔ ایک روز بیٹ من نے اُسے کہا، "مَیں ڈاکٹر نہیں ہوں، لیکن اگر تم میرے ساتھ لاہور چلو تو وہاں تمہارا علاج خاطر خواہ طور پر ہو سکتا ہے۔" چنانچہ لاہور کو روانگی کا دن مقرر کر کے وہ چلا گیا۔

مقررہ روز سے ایک رات پہلے وہ اپنے ایک نزدیکی رشتے دار بنام قربان کو ساتھ لے کر بیٹ من کے پاس پہنچ گیا۔ اُن ایّام میں بیٹ من ایک چھوٹے سے خیمے میں رہا کرتا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ ایک کی بجائے دو آ گئے ہیں تو اُس نے پوچھا کہ یہ دوسرا لڑکا کون ہے؟

احسان نے جواب دیا، "یہ میری برادری کا ایک لڑکا ہے اور چونکہ یہ سچ بولنے کا عادی ہے مَیں اُسے اپنے ساتھ لے

آیا ہوں تاکہ لوگوں میں گواہی دے کہ مَیں آپ کے ساتھ صرف آنکھوں کے علاج کے لئے جا رہا ہوں اور عیسائی ہونا نہیں چاہتا۔"

بیٹ من اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں،[a]

مَیں نے حیران ہو کر کہا، "کیا تم جیسے جوشیلے مسلمان کے لئے بھی گواہی کی کوئی ضرورت ہے؟" بہر حال مَیں دونوں لڑکوں کو اپنے چھوٹے سے خیمے میں لے گیا، اور وہ میری چارپائی کے نیچے زمین پر سو گئے۔

آدھی رات کے قریب احسان نے قربان کو جھنجوڑ کر جگایا اور کہا، "اُٹھ قربان! اُٹھ! نماز پڑھنا نیند سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ مُرغ نے بانگ دے دی ہے۔" لیکن نیند کا غلبہ دونوں پر طاری تھا اور وہ دونوں سو گئے۔ جب صبحِ کاذب نمودار ہوئی اور مُرغ چاروں طرف بانگ دینے لگے تو احسان نے قربان کو پھر جھنجوڑا اور کہا، "قربان، اب تو اُٹھ۔ اب تو سورج نیزہ بھر اونچا ہو گیا ہے۔"

---

[a] 10 دسمبر 1873ء

وہ دونوں تو نماز پڑھنے چلے گئے لیکن مَیں سوتا رہا۔ جب صبحِ صادق نمودار ہوئی تو مَیں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ باہر جا کر دیکھا کہ دونوں لڑکے کنوئیں پر بیٹھے ہیں۔ سلام دُعا کے بعد مَیں نے اُن سے پوچھا، "کیا تم نے نماز پڑھ لی ہے؟"

احسان نے جواب دیا، "ہاں، ہم نے تو پڑھ لی ہے" اور لفظ "ہم" پر زور دیا تاکہ اسلامی وقتِ نماز اور عیسائیوں کی عبادت کے وقت کی تمیز ظاہر ہو جائے اور اسلامی وقت کی برتری ثابت ہو جائے۔

مَیں نے پوچھا، "کیا تم نے خدا سے اُس جھوٹ کے لئے جو تم نے صبح سویرے قربان سے بولا تھا معافی مانگی ہے؟"

اُس نے کہا، "مَیں نے کب جھوٹ بولا ہے؟"

مَیں نے جواب دیا، "کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ اب تو سورج ایک نیزہ اونچا ہو گیا ہے حالانکہ ابھی مُرغ نے بانگ دی تھی؟"

اِس کا اُس سے کوئی جواب نہ بن آیا۔ قربان مجھے نحیف اور بیمار نظر آتا تھا۔ چنانچہ جب چلنے کا وقت آیا تو مَیں نے احسان

کو کہا، ”تمہاری آنکھیں کم زور ہیں، لیکن تمہاری ٹانگیں مضبوط ہیں۔ بہتر ہے کہ قربان میرے پیچھے اونٹ پر سوار ہو جائے اور تم پیدل چلو۔“ ہم تینوں امرتسر کے راستے لاہور کی جانب چل پڑے۔ مَیں اور قربان اونٹ پر سوار ہو کر آگے نکل گئے اور احسان لمبی چھلانگیں مارتا پیدل چلا آیا۔

دسمبر کا وُسط تھا۔ سردی بڑی شِدّت کی تھی۔ راہ میں ایک ندی تھی جس کو پار کرتے وقت بیٹ من اور قربان دونوں پانی میں جا پڑے۔ بیٹ من نے پہلے قربان کو پانی میں سے نکال کر اُس کے کپڑے ریت پر سُکھائے۔ پھر ہی اُس نے اپنے کپڑوں کو اُتار کر اُنہیں سُکھایا۔ اِس معمولی سی مسیحی ایثارِ نفسی کا اثر احسان اور قربان دونوں پر بہت گہرا ہوا۔ جب بیٹ من اور قربان کے کپڑے سُوکھ گئے تو وہ دوبارہ اونٹ پر سوار ہو کر امرتسر کی جانب چل پڑے۔ بیٹ من لکھتے ہیں،

ہم دونوں اونٹ پر احسان سے بہت آگے چلے گئے تھے۔ اور یوں ہم دو دن تک اکٹھے اونٹ پر رہے۔ قربان بے چارا بیمار

تھا، اور مجھے اُس پر بہت ترس آتا تھا۔ مَیں نے اُس سے ہم دردی ظاہر کی، اور پھر مَیں نے اُسے خداوند مسیح کا نجات بخش پیغام سُنایا جو اُس کے لئے بالکل نیا تھا۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ خداوند مَوت پر غالب آیا ہے اور یوں اُس نے مَوت کا ڈنک توڑ دیا ہے۔ جب تک ہم لاہور پہنچے قربان حق کا متلاشی بن چکا تھا۔ ہم دونوں نے احسان کو کچھ نہ بتایا، کیونکہ ہم دونوں جانتے تھے کہ اگر اُسے اُن باتوں کا کہیں علم ہو گیا تو وہ قربان کو زبردستی اپنے ہم راہ واپس نارووال لے جائے گا۔

جب ہم لاہور پہنچے تو مَیں اِن دونوں کو اپنے ایک دوست کے ہاں لے گیا جو بڑا قابل ڈاکٹر تھا۔ احسان کی آنکھوں کو دکھانے کے بعد مَیں نے اُس سے قربان کے لئے دوا مانگی۔ اُس نے دوا تو دے دی لیکن ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ وہ اِس مُوذی مرض سے نہیں بچے گا۔

جب ہم واپس امرتسر پہنچے تو مَیں ایک دوست کے ہاں ٹھہرا جس نے ایک کمرہ مجھے دیا جبکہ دوسرے کمرے میں اُس نے دونوں لڑکوں کو اُتارا۔ مَیں چاہتا تھا کہ امرتسر میں چند دن رہ

کر موقع پا کر قربان کو انجیل جلیل کا جاں فزا پیغام سُناؤں اور احسان کو اِس بات کا پتا تک نہ لگے۔ اِس مقصد کے تحت مَیں احسان کو کسی نہ کسی بہانے سے باہر بھیجتا رہتا تھا۔ بد قسمتی سے مجھے دوسرے روز ہی نارووال سے پیغام ملا کہ میرا فوراً وہاں جانا لازمی ہے۔ میرے اور نارووال کے درمیان تیس میل کا فاصلہ اور دو دریا حائل تھے، اور مجھے واپس فوراً چل پڑنا تھا۔ مَیں نے احسان کو کسی کام پر باہر بھیج دیا اور پھر قربان کو کہا، "مَیں دو دن کے بعد واپس آجاؤں گا۔ تم یہیں رہنا۔"

اُس نے مجھ سے پہلا سوال یہ کیا کہ اگر آپ چلے گئے تو مجھے کون تعلیم دے گا ؟

مَیں نے اُسے پڑھنے کے لئے کتابِ مقدّس کی ایک جِلد دی۔ اُس نے کتاب کو خوشی سے لے کر اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیا۔ لیکن کہنے لگا، "یہ کتاب تو بڑی ہے، اور بھائی احسان اِس کو دیکھ لے گا۔ پھر مَیں کیا کروں گا ؟"

اِس پر مَیں نے اُسے زبور شریف کی ایک جِلد دی۔ اِس کو پا کر وہ کہنے لگا، "یہ کتاب تکئے کے اندر تو چھُپ سکتی ہے، لیکن کیا اِس میں حضرت مسیح روح اللّٰہ کا بھی ذکر ہے؟" کتاب دے کر مَیں نارووال چلا گیا۔

قربان زبوروں کو پڑھ رہا تھا کہ اُسے لیٹے لیٹے نیند آ گئی، اور کتاب کھلی کی کھلی رہ گئی۔ جب احسان واپس کمرے میں آیا تو اُس کی نظر کتاب پر پڑی۔ اُس نے قربان کو جگا کر دُرُشتی سے پوچھا، "یہ کیا ہے؟ تم کو یہ کتاب کہاں سے ملی اور تم نے اِس کو کیوں لیا؟"

اُس نے جواب دیا، "بیٹ مَن نے مجھے دی ہے، کیونکہ مَیں نے اُس سے مانگی تھی، اور مَیں مسیحی ہونا چاہتا ہوں۔"

اُس کا یہ کہنا تھا کہ احسان نے اُسے بستر میں سے نکال گھسیٹا اور اپنے ہم راہ نارووال لے گیا۔ اِس واقعے کے تقریباً ایک ماہ بعد مَیں شیعوں کے قبرستان میں سے جا رہا تھا کہ مَیں نے دیکھا کہ لوگ قربان کا جنازہ لئے آ رہے تھے۔

سچائی کی تلاش

احسان علی نہ صرف کٹّر شیعہ تھا جس کو علم حاصل کرنے کا شوق تھا بلکہ وہ ایک حسّاس دل اور روشن ضمیر رکھنے والا انسان بھی تھا۔ یہ ناممکن امر تھا کہ میاں نصرت اللہ کے ملائم اور بیٹ من کے محبت بھرے جوابات جو وہ اُس کے تُرش اعتراضات اور سخت کلام کے وقت دیتے تھے اُس کے ضمیر کو ملامت نہ کرتے اور طرفین کے رویے کا فرق اُس کے حسّاس دل پر چوٹ نہ لگاتا۔ جہاں اُس کا رویہ گُستاخی اور بدزبانی کی جانب مائل تھا وہاں اُن کا رویہ نرمی، صبر اور محبت آمیز الفاظ کا تھا۔ وہ اپنے دل کو بہتیرا سمجھاتا، لیکن اُس کے ضمیر اُسے ہمیشہ قائل کر دیتی تھی۔

جب بیٹ من نے قربان کو ندی سے نکال کر اُس کی خبر گیری کو زیادہ ضروری تصوّر کیا تو وہ چونک پڑا اور سوچنے لگا کہ ایک انگریز نے کیوں قربان کی جان کو سخت سردی کے

موسم میں اپنے آرام و آسائش پر ترجیح دی اور خود تکلیف اُٹھا کر ایک مسلمان بیمار لڑکے کا پہلے خیال کیا، حالانکہ اُس نے قربان کو پہلے کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ اُس کا حسّاس دل اُسے قربان کی موت کا بھی کسی حد تک ذمہ دار قرار دیتا تھا کہ اگر وہ اُسے امرتسر سے گھسیٹ کر زبردستی نارووال نہ لے جاتا تو وہ شاید نہ مرتا۔ پھر وہ اپنے دل کو سمجھاتا کہ اُس نے اپنے طرزِ عمل سے قربان کو جہنّم جانے سے بچا لیا۔ لیکن اُس کا دل اِس قسم کی طِفلانہ تسلّیوں کو نہ مانتا اور اُسے قربان کی موت کا ذمہ دار ٹھہراتا۔ پھر وہ یہ سوچتا کہ بیٹ من نے صرف اُس کی آنکھیں دکھانے کے لئے نارووال سے راہِ امرتسر لاہور تک سخت سردیوں کے دنوں میں کیوں ساٹھ ستّر میل آنے اور ساٹھ ستّر میل جانے کی مصیبت اُٹھائی حالانکہ وہ ہمیشہ اُس سے سخت کلامی اور گُستاخی سے پیش آتا رہا تھا۔ غرض اُس کے دل میں روحانی کشمکش اور ذہنی کوفتگی شروع ہوگئی جو

اُسے کسی حالت میں بھی چَین نہ لینے دیتی تھی۔ سَولُس کی طرح وہ "آنکس کے خلاف پاؤں مارنا" تھا۔

احسان علی نے سکول چھوڑ دیا تھا اور اب وہ اپنے والد کے کاروبار میں مدد دیتا تھا اور ساتھ ہی اَجناسِ خوردنی چاول اور گیہوں وغیرہ کی تھوک تجارت کرتا تھا۔ نارووال سے قریب تین میل کے فاصلے پر مندراں والا گاؤں اعلیٰ قسم کے چاول کے لئے مشہور تھا۔ چنانچہ وہاں سے اور دوسرے دیہات سے وہ اَجناسِ خوردنی خرید کر لاتا اور مناسب نفع پر فروخت کرتا تھا۔ نتیجے میں اُس کا خاندان پہلے سے بھی زیادہ خوش حال ہو گیا۔ گاؤں آتے جاتے وقت یہ 17، 18 سالہ نوجوان راہ میں دینی مسائل پر غور کِیا کرتا تھا۔ اُسے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ حضرت مسیح پر جو انجیل نازل ہوئی تھی وہ محرّف ہو گئی ہے۔ اِسی وجہ سے اُس میں تثلیث، اُلوہیّتِ مسیح، کفّارہ اور ابن اللہ جیسی تعلیم موجود ہو گئی ہے اور اُس کے مختلف

مقامات میں تضاد و تناقص پایا جاتا ہے، حالانکہ کلامِ خدا میں کسی قسم کا تناقص جائز نہیں۔ پھر اُسے رہ رہ کر کتابِ مقدّس کے استاد نصرت اللہ اور بیٹ من کی نرمی، تحمّل، صبر اور محبت کا رویّہ یاد آتا، اور یہ سوال اُس کے دل میں پیدا ہوتا کہ اِس قسم کی تعلیم سے ایسے اوصاف کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں؟ خود فراموشی، ایثار اور پیار جیسی نیکیاں کیونکر عیسائیوں کا شیوہ ہو جاتی ہیں؟ اگر اُن کی تعلیم بگڑی ہوئی ہے اور اگر یہ سچ ہے کہ گندم سے گندم اور جَو سے جَو نکلتا ہے تو اِس قسم کے اوصاف اُن میں کہاں سے آ گئے؟ چنانچہ اُس نے مصمّم ارادہ کر لیا کہ وہ قرآن و انجیل اور شیعہ مذہب کے اُصول اور عیسائی دین کی تعلیم کا از سرِ نَو موازنہ کر کے صراطِ مستقیم کی پیروی کرے گا۔

مسیح کی طرف رجوع

1876ء کے موسمِ گرما کا ذکر ہے کہ احسان علی عین دوپہر کے وقت مِشن سکول کے ہیڈ ماسٹر بھولا ناتھ گھوش کے گھر گیا۔ اُن کے بیٹے ایس۔اے۔سی گھوش لکھتے ہیں،

میری عمر قریباً 6 سال کی تھی۔ مَیں اپنے باپ کے پاس کمرے کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ باہر سخت دھوپ تھی۔ کڑکتی گرمی کے دن تھے۔ مَیں نے دیکھا کہ ایک اٹھارہ سالہ جوان کمرے کے دروازے کی چِک اُٹھا کر شیشوں میں سے اندر جھانک رہا ہے۔ مَیں نے اپنے باپ کو جگایا اور اُٹھ کر لڑکے کے لئے دروازہ کھولا۔ لڑکا اندر آیا اور میرے باپ کے پاس بیٹھ گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بات کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ لڑکے کی آواز اونچی اور دُرشت ہوتی گئی۔ لیکن میرے باپ کی آواز نرم اور دھیمی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لڑکے کو ملائمت سے کچھ سمجھا رہے ہیں۔ اُن کی آنکھوں سے محبت ٹپک رہی تھی، لیکن لڑکے کی آنکھوں سے غُصّے کے شرارے

نکل رہے تھے۔ یہ گفتگو کوئی چار پانچ گھنٹے جاری رہی جس کے بعد لڑکا چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد مَیں نے اپنے باپ سے پوچھا، "یہ کون تھا اور کیا کہتا تھا؟"

میرے والد نے مجھے بتایا، "یہ لڑکا احسان ہے جو عیسائی مذہب کا سخت ترین دُشمن تھا لیکن نامعلوم کیوں۔ اب وہ حق کا طالب ہو گیا ہے اور اسلامی اور مسیحی مسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے مجھ سے مدد لینے آیا تھا۔"

میری عمر چھوٹی تھی اور ناسمجھ کی حالت تھی۔ مجھے اُن کی آپس کی باتوں کا خاک پتا نہ لگا۔ بس اِتنا سمجھ گیا کہ یہ مسلمان لڑکا اب عیسائی ہو جائے گا۔

احسان علی بیٹ من اور میاں نُصرت اللّٰہ کے پاس اور اپنے مولوی سیّد حسین علی شاہ کے پاس اکثر جانے لگا۔ وہ دینی مسائل چھیڑ دیتا تھا تاکہ راہِ حق کو اختیار کرے۔ کبھی کبھی وہ

ہچکچا کر اپنے باپ اور ماں سے بھی دینی مسائل کی نسبت سوال کرتا، کیونکہ اُس کے دل میں اُن کی بڑی عزّت تھی۔

اِدھر اُس کا ہم جماعت دینا ناتھ پریتو دِتّا مسیح کا پیروکار ہو چکا تھا۔ میاں سُپتّا اور اُس کے بیٹے رحمت اور احمد مسیح پر ایمان لائے تھے۔ وارث الدین کو بھی بپتسمہ ملا تھا۔ اُس کے ہم مکتب حمید الدین، ودھاوا مل اور سُنت شاہ بھی خداوند مسیح کے قدموں میں آ چکے تھے۔ احسان علی اِن لڑکوں سے بھی مذہبی گفتگو کرتا تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ جو اُس کے درپیش تھا وہ تحریفِ انجیل کا مسئلہ تھا جو بُنیادی مسئلہ تھا۔ اگر انجیل محرّف اور منسوخ نہیں ہوئی اور اُس کی صحت پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تو اِبنیّتِ مسیح، اُلوہیّتِ مسیح، کفّارہ اور تثلیث وغیرہ کے مسئلے ایمان کی رُو سے ماننے ہوں گے، خواہ انسانی عقل اِن عُقدوں کو حل کر سکے یا نہ کر سکے۔ کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ انسانی اِدراک سے بُلند و بالا ہے۔

اِس کے پیشِ نظر احسان علی کی تمام تر کوشش اِسی جستجو میں لگی رہی کہ کیا موجودہ انجیل وہی ہے جو حضرت مسیح لائے تھے۔ اُن دنوں میں فینڈر کی کتاب میزان الحق کا اردو میں ترجمہ ہو گیا تھا جس کے مطالعے سے اُس پر یہ ظاہر ہو گیا کہ جس انجیل کی قرآن بار بار اور جا بہ جا تصدیق کرتا ہے وہ وہی انجیل ہے جو زمانۂ رسول میں عیسائی عربوں کے ہاتھوں میں تھی اور جس کی ہزاروں نقلیں زمانۂ مسیح سے زمانۂ محمد تک مختلف ممالکِ مشرق و مغرب میں موجود تھیں اور جس کے ترجمے اُن چھ صدیوں کے دوران بیسیوں زبانوں میں ہر ملک میں مروّج تھے۔ چنانچہ زمانۂ رسول سے پہلے انجیل کی صحت میں فتور کا واقع ہونا ایک ناممکن امر تھا اور زمانۂ محمد کے بعد تو یہ امر محال تھا۔ یوں رفتہ رفتہ اُس پر منکشف ہو گیا کہ انجیل کی نسبت مولویوں کے خیالات بے بُنیاد ہیں۔

اب اُس نے از سرِ نو انجیل و قرآن کا گہرا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ خدا سے سچّے دل سے دُعا کرتا تھا کہ اے خدا، مجھے اپنی راہ دکھا اور صراطِ مُستقیم پر چلنے کی توفیق عطا کر۔ اُس نے شیعہ کُتبِ تفسیر و سِیَر کا بغور مطالعہ کیا، کیونکہ اہلِ سُنّت کی احادیث اُسے قابلِ اعتراض نظر آتی تھیں جن پر عیسائیوں کے اعتراضات مبنی ہوتے تھے۔

قرآن کی آیات سے اُسے یہ علم ہوگیا کہ خدا رسولِ عربی کو کئی مقامات پر حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کے لئے مغفرت کے طالب ہوں اور کہ قیامت کے دن آنخضرت گناہ گاروں کی شفاعت کرا نہیں دیں گے۔ اِس کے برعکس حضرت مسیح کی عصمت پر قرآن و انجیل دونوں گواہ ہیں، اور مسیح کی نسبت سب نبی گواہی دیتے ہیں کہ جو کوئی اُس پر ایمان لائے گا وہ اُس کے نام سے گناہوں کی معافی پائے گا۔

گھوش صاحب اور بیٹ من نے احسان علی کو تثلیث کی نسبت بتایا کہ انجیل تین خداؤں پر ایمان رکھنے کی تعلیم نہیں دیتی بلکہ تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث پر ایمان لانے کی تلقین کرتی ہے۔ مسیح خداوند نے نہایت واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ ایمان دار خدائے واحد اور برحق کو مانیں۔ اور پَولُس رسول بھی کہتا ہے کہ ایک کے سوا کوئی خدا نہیں۔ خدا ایک ہی ہے یعنی باپ جس کی طرف سے سب چیزیں ہیں اور ایک ہی خداوند ہے یعنی عیسیٰ مسیح جس کے وسیلے سے سب چیزیں وجود میں آئیں۔ ابنیّتِ مسیح کے بارے میں اُنہوں نے بتایا کہ انجیل کی رو سے بی بی مریم خدا کی معاذ اللہ زوجہ نہ تھیں بلکہ اِس خطاب سے روحانی رشتے کا ظاہر کرنا مُراد ہے۔ کفّارے کے متعلق اُنہوں نے کہا کہ اگر گائے، بکری، اونٹ وغیرہ حیوانات گناہوں کا کفّارہ ہو سکتے ہیں تو مسیح جو "خدا کا لیلا" ہے دُنیا کے گناہ کیوں نہیں اُٹھا

سکتا ؟ غرض، دونوں نے مضبوط دلائل سے احسان علی کی مختلف دینی مسائل کے متعلّق حتّی المقدور تسلّی دینے کی کوشش کی۔

جوں جوں احسان علی مسیح اور انجیلِ مسیح کے قریب آتا گیا اُس کا اضطراب بڑھتا گیا، کیونکہ مسیح پر ایمان لانے کے نتیجے اُس سے چُھپے نہ تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کا پہلوٹھا بیٹا تھا جس سے اُن کی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اُس کا خاندان دینی اُمور میں پیش پیش اور سب کے لئے نمونہ تھا۔ ایسے ممتاز خاندان کا وہ چشم و چراغ تھا۔ اگر اُس نے شیعہ مذہب کو ترک کر دیا تو دُنیا کیا کہے گی؟ اُس کے باپ کی ناک کٹ جائے گی۔ اُس کی ماں جس کو وہ از حد پیار کرتا تھا مارے غم کے مر جائے گی۔ دونوں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ اُس کے دونوں بھائیوں اور بہنوں کا کیا حشر ہو گا ؟ خاندان کے مختلف افراد کے دل جل جائیں گے۔ ے

> دل کے پھپھولے جل اُٹھے دل کے ہی داغ سے
> اِس گھرکو آگ لگی گھر کے چراغ سے۔

کبھی وہ اپنے متعلّق سوچتا کہ میرا مستقبل کیا ہو گا ؟ برادری سے خارج کر دیا جاؤں گا۔ خاندان اورگھر سے نکال دیا جاؤں گا۔ مَیں سب کی طرف سے مر جاؤں گا، اورسب میری طرف سے مر جائیں گے۔ کوئی میرے ساتھ کسی طرح کا سروکار نہ رکھے گا۔ میرا کاروبار تباہ ہو جائے گا، اور مَیں خود تباہ حال، خانہ خراب اور زمین پر آوارہ پھروں گا۔ اِس قسم کے خیالات اُسے شہر کے باہر ویرانے میں لے جاتے جہاں وہ بڑی عاجزی کے ساتھ خدا سے دُعا کرتا کہ اے خدا مجھ پر رحم کر! مجھے اِس گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکال کر اپنے نور میں لے چل۔ میری بے قراری اور بے چینی کو دُور کر، اور مجھے طاقت اورقوّت عطا کر تا کہ مَیں راہِ راست پر چلنے کی توفیق پاؤں، کہ مَیں طعن و تشنیع کی طرف سے بے پروا ہو

کر خالص نیّت سے تیری پیروی کروں۔ میرا دل ہر طرف سے خائف ہے، لیکن تُو میرے دل میں سے ہر قسم کا خوف اور اضطراب نکال دے، مجھے قلبی اطمینان اور آرامِ جان عطا کر۔ اے مسیح، تُو سب کو جو بوجھ سے دبے ہوئے ہیں دعوت دیتا ہے کہ میرے پاس آؤ۔ مَیں تم کو آرام دوں گا اور تمہاری جانیں آرام پائیں گی۔ اپنا اطمینان مجھے عطا کر۔

خدا نے آخرکار اُس کی دلی دُعا سن لی اور یشوع کی طرح اُسے فرمایا،

> مَیں تجھے کبھی نہیں چھوڑوں گا، نہ تجھے ترک کروں گا... لیکن خبردار، مضبوط اور بہت دلیر ہو... مَیں پھر کہتا ہوں کہ مضبوط اور دلیر ہو۔ نہ گھبرا اور نہ حوصلہ ہار، کیونکہ جہاں بھی تُو جائے گا وہاں رب تیرا خدا تیرے ساتھ رہے گا۔
>
> (یشوع 1: 5، 7، 9)

آخر لوگوں کو پتا لگا کہ احسان علی اسلام کو ترک کر کے مسیح کا پیروکار ہونا چاہتا ہے۔ ہر طرف شور مچ گیا۔ قیامتِ صغریٰ برپا

ہوگئی۔ ہر طرف سے لعنت اور پھٹکار کا بوچھاڑ شروع ہوگیا۔ بے چارہ احسان اُنہیں بہتیرا کہتا کہ میرے ساتھ بحث کرلو۔ میری عقل مجھے کہتی ہے کہ مسیحی مذہب ہی اکیلا سچّا دین ہے۔ لیکن اَیسے شخص سے بحث کَون کرے جو بازاری مُنادی میں ہر عیسائی واعظ کا ناک میں دم کر دیا کرتا تھا۔ ایک مَن چلے نے اُسے جواب میں کہا ؎

> صد لعنت و پھٹکار چنیں ذہنِ رسا را
> صدہا لعنت اور پھٹکار ایسے تیز ذہن کو۔

احسان اِس قسم کے پنجابی فارسی اشعار پر ہنس دیتا اور جواب میں کہتا ؎

> خدا دارم چہ غم دارم۔ خدا دارم چہ غم دارم
> مجھے خدا حاصل ہے، مجھے کیا غم؟
> مجھے خدا حاصل ہے، مجھے کیا غم؟

جب اُس کے خاندان کو اُس کے خیالات کی تبدیلی کا علم ہوا تو باپ نے بہت سمجھایا۔ لیکن وہ ایک نہ مانا۔ آخر باپ نے کہا، "جا۔ گیا گزرا ہوا۔ نامُراد۔"

ماں نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا، "تُو اُس شیطان (بیٹ من) کے پاس کرنے کیا جاتا ہے جو تجھ کو ورغلا کر جہنّم کی طرف لے جا رہا ہے؟ محلّے کی عورتیں کہتی ہیں کہ وہ یعنی شیطان جو ہے سو ہے، پر اُس نے احسان پر جادو پڑھ دیا ہے۔ تعویذگَنڈے سے علاج کرو۔"

مَنجھلا بھائی رحمت علی سخت مشتعل ہوا اور طیش میں آ کر لٹھ اُٹھا کر چلا کہ ایسے بھائی کو جان سے مار دینا بہتر ہے جو خاندان کی عزّت و آبرو کا خیال نہیں کرتا۔ برادری کے لوگ اُس سے کنارہ کرنے لگے۔ باپ کو کہا، "جناب، اُسے گھر سے نکال دیں۔ وہ عُضوِ معطّل ہے۔" کسی نے یہ ہوائی اُڑا دی کہ احسان کو کاروبار میں گھاٹا پڑا ہے اور اِس خسارے کی وجہ سے عیسائی ہونا چاہتا ہے۔ کسی نے کہا، "لالچ بُری بلا

ہے۔ عقل مندوں کو اندھا کر دیتا ہے۔" کسی نے کہا، "میم سے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔"

غرض جتنے منہ اُتنی باتیں۔ لیکن احسان اب وہ احسان نہ تھا جو طیش میں آ کر لوگوں کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ وہ ہر شخص سے تحمل، صبر اور ملائمت سے بات کرتا اور لعن طعن کا جواب خوش مزاجی سے دے کر ہر ایک کے سامنے انجیل کی صداقت پیش کرتا تھا۔ جو لوگ اُس سے بحث کرنا چاہتے وہ اُنہیں کھلا چیلنج دے کر کہتا کہ اگر تم دلائل سے مجھے قائل کر لو تو مَیں مسیح کا پیروکار نہیں رہوں گا، لیکن اگر تم میری دلیلوں کا جواب نہ دے سکو تو تم بھی میرے ساتھ مسیح پر ایمان لاؤ۔ خواجگان کی برادری اُس کا حال دیکھ کر حیران تھی کہ کیا یہی وہ احسان ہے جو بازار اور سکول میں کسی عیسائی کو کھڑا نہیں ہونے دیتا تھا اور ہر جگہ اُنہیں پریشان کر دیتا تھا۔

برادری کا قطعِ تعلق

یہ حالات دیر تک نہیں رہ سکتے تھے اور نہ رہے۔ برادری کے سربراہ احسان علی کے باپ کے پاس گئے اور کہا، "جناب، آپ اِس لڑکے کو سمجھائیں۔ اُس نے ایک فِتنہ برپا کر رکھا ہے، اور اب حالات ہماری برداشت سے باہر ہو گئے ہیں۔ آپ کی خاطر ہم کو منظور تھی، اِس واسطے ہم نے ابھی تک اُسے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اُس کی زبان بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہر چھوٹے بڑے کو چیلنج دیتا پھرتا ہے۔ پہلے حسین بخش عیسائی ہو گیا، پھر اُس کے بیٹے پوتے عیسائی ہو گئے۔ وارث عیسائی ہو گیا۔ ارد گرد کے گاؤں کے لڑکے عیسائی ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں، اور اب جناب کے لڑکے نے ہر جگہ اودھم مچا رکھا ہے۔ آپ ہی بتائیں، ؎

> کیونکر بُجھے گی آگ یہ گھر گھر لگی ہوئی؟

اگر ہمیں جناب کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم اُسے دو دن میں سیدھا کر لیتے اور فوراً برادری سے خارج کر دیتے۔ اُسے بھی ہوش آ جاتی۔"

احسان کے باپ نے جواب دیا، "مَیں نے اُسے بہتیرا سمجھایا ہے، لیکن وہ اپنے ارادے کا پکّا ہے۔ وہ نہیں مانا اور نہ کبھی مانے گا۔"

اُنہوں نے کہا، "پھر بہتر ہے کہ آپ اُسے چھوڑ دیں۔"

"جناب" کے سینے سے ایک آہ نکلی، اور اُنہوں نے کہا، "مَیں آخرت کو اِس دُنیا پر اور اپنے پہلوٹھے کی محبت پر ترجیح دیتا ہوں۔" اُنہوں نے احسان کو اِن باتوں کی خبر دی۔

اُس نے جواب میں کہا، "جناب، مَیں بھی آخرت کو اِس دُنیا پر ترجیح دیتا ہوں اور اِسی واسطے سب کچھ چھوڑ کر اور آپ کی، ماں کی اور بھائیوں، رشتے داروں اورعزیز و اقارب کی محبت سے منہ موڑ کر مسیح کا پیروکار ہو گیا ہوں۔ لیکن آپ

اِس بات کا یقین رکھیں کہ مَیں آپ کا وہی تابع دار بیٹا ہوں اور تا عمر آپ کا اور ماں کا فرماں بردار رہوں گا۔“

باپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ماں دہاڑیں مار کر رونے لگی اور احسان سے لپٹ گئی۔ آہ و نالہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ بھی رونے لگا۔ بہنیں، رحمت علی اور مُحسن علی سب کے سب زار زار رونے لگے۔ آخر باپ نے کہا، ”جب تُو ہماری بات نہیں مانتا تو جو تیری مرضی ہے کر۔ لیکن عیسائی ہو کر تُو گھر میں نہیں رہ سکتا۔ برادری تجھ کو خارج کر دے گی اور تُو کہیں کا نہ رہے گا۔“

احسان نے ایک آہ بھر کر کہا ؎

> ما خدا داریم وما را ناخدا درکار نیست
>
> ہمیں خدا حاصل ہے، اور ہمیں ناخدا درکار نہیں

وہ گھر سے نکل کر سیدھا بیٹ من صاحب کے پاس گیا اور اُنہیں تمام حالات بتائے اور کہا کہ اب مَیں پتسمہ پانے کو

تیار ہوں۔ چنانچہ 21 اپریل 1878ء کے روز بیٹ مین نے احسان علی کو نارووال کی عبادت گاہ میں بپتسمہ دیا۔ اُس کا مسیحی نام احسان اللہ رکھا گیا۔

2

بٹالہ اور بنّوں کے ایّام

بٹالہ

بپتسمہ پانے کے بعد احسان اللّٰہ نارووال سے براہِ جسّڑ، ککّے کی، میعادی، ڈیرہ بابا نانک پیدل سے بٹالہ کو خدا کا نام لے کر چل پڑا۔ اُس کی قوم نے حُقّہ پانی بند کر دیا تھا۔ ماں باپ، بھائی بہن اور عزیز سب بے گانے ہو گئے تھے، لیکن اُس کا دل اطمینان سے پُر اور خوشی سے معمور تھا۔ اُس کا مستقبل تاریک تھا، لیکن اُس کے ایمان کا نور اُس کے پاؤں

کا چراغ اور اُس کی راہ کی روشنی تھا۔ اب وہ بیس سالہ نوجوان تھا، اور اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس طرح خدا نے حضرت ابراہیم کو کہا تھا،

> اپنے وطن، اپنے رشتے داروں اور اپنے باپ کے گھر کو چھوڑکر اُس ملک میں چلا جا جو مَیں تجھے دکھاؤں گا۔ مَیں...تجھے برکت دوں گا۔ (پیدائش 12:1–12)

اِسی طرح خدا نے اُسے بھی اپنے وطن اور رشتے داروں اور اپنے باپ کے گھر سے نکالا ہے، اور وہ ضرور برکت پائے گا۔ بٹالہ پہنچ کر وہ مسیحیوں کے گھر گیا اور اُنہیں بتایا کہ خدا نے اُسے ایمان لانے کی توفیق بخشی ہے۔ قبلہ رحمت مسیح واعظ لکھتے ہیں،

> جب احسان نے نارووال کو خیرباد کہہ کر بٹالہ میں جا سر نکالا تو اُس نے گوشت اور خون سے صلاح لئے بغیر ایسا کیا۔ ایسے مخالف کا اِس طرح مسیح کا اقرار کرنا نہ صرف حیرت انگیز تھا بلکہ قابلِ یقین بھی نہ تھا۔ لوگ اُسے شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے

جیسا پولُس رسول کی نسبت لکھا ہے کہ بھائیوں نے اُس کے ایمان کو شک کی نگاہ سے دیکھا۔ مگر دکھاوے اور اصل جلدی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ احسان اللہ نے بہت جلدی وہاں اپنا اعتبار جما لیا۔

سکول میں دوبارہ داخلہ

اُن ایام میں بٹالہ کی جماعت میں چند ایک برگزیدہ ہستیاں تھیں۔ ایف۔ایچ بیرِنگ، ایچ۔یو وائٹ بریخٹ، مس ٹکر اور بابو ایشن چندر سنگھا وغیرہ اِس جماعت کے گوہرِ شاہ وار تھے۔ اپریل 1878ء میں احسان اللہ کا بپتسمہ ہوا تھا، اور اِسی اپریل کو بیرِنگ نے اپنا سکول کھولا جس کا پہلا ہیڈ ماسٹر بابو ایشن چندر سنگھا مقرر ہوئے۔

احسان اللہ کی عمر بڑی تھی، کیونکہ وہ اب بیس سال کا نوجوان تھا۔ توبھی اُسے تحصیلِ علم کا بے حد شوق تھا، اِس لئے بیرِنگ نے اُسے اپنے سکول میں داخل کر لیا۔ سکول میں وہ

بڑی محنت سے کام کرتا اور ہمیشہ جماعت میں اول رہنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اگر کسی روز وہ کسی مضمون میں اوّل نہ رہتا تو وہ ایک بید لے کر سکول کی بالائی منزل پر چلا جاتا اور اپنے آپ کو بید سے پیٹ کر لہو لُہان کر لیا کرتا تھا۔ اُس کے ساتھی دینا ناتھ پریتو دِتّا اور رحمت مسیح وغیرہ اِسی سکول میں تعلیم پاتے تھے۔ ڈاکٹر دینا ناتھ پریتو دِتّا لکھتے ہیں،

احسان میرے ساتھ نارووال مشن سکول میں پڑھتا تھا اور میرا ہم جماعت بھی تھا۔ جب وہ مسیحی ہو کر بٹالہ آیا اور سکول میں داخل ہوا تو ہم دونوں نے اپنے پرانے تعلّقات کو ازسرِنَو تازہ کیا۔ اُس کا ایمان ایذا کی آگ میں تایا گیا تھا اور خالص سونے کی مانند چمکتا تھا۔ مَیں مانیٹر تھا، اور وہ ہر بات میں میرا دہنا ہاتھ تھا۔ ہم دونوں کو یہ احساس تھا کہ سکول کے ہر لڑکے کی زندگی کے لئے ہم دونوں خاص طور پر خدا کے حضور ذمے دار ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم تمام طلبا کے بڑے بھائی ہیں جن کے سپُرد خدا نے یہ خاص خدمت کی ہے کہ اُن کی روحانی زندگی

کی نگہ داشت کریں اور اُن کے مطالعے وغیرہ کی طرف توجّہ دیں۔ ہراتوار کو ہم سنڈےسکول کی جماعت کے بعد لڑکوں کو بازار لے جاتے تھے اور اہالیانِ بٹالہ کو انجیل کا جاں فزا پیغام سُناتے تھے۔

واعظ صاحب بھی لکھتے ہیں،

سکول میں احسان اللہ کی مسیحی زندگی کی تاثیر عجیب کام کرتی رہی۔ ایک طرف بابو سنگھا کی خاموش زندگی، دوسری طرف احسان اللہ کی پُر جوش زندگی نے طلبا کی زندگیوں پر اثر کر رکھا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ بابو سِنگھا صاحب کی کوٹھی پر سنڈےسکول کے واسطے اعلیٰ کلاس کے لڑکے جمع ہوئے۔ بابو جی کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ابھی واپس گھر نہیں لَوٹے تھے۔ احسان اللہ نے سنڈےسکول لینا شروع کر دیا۔ چند منٹوں میں ہی لڑکوں کی حالت اُلٹ پُلٹ ہوگئی۔ اُنہوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ کوئی روتا ہے، کوئی توبہ کرتا ہے۔ لڑکے بالکُل حواس کھو بیٹھے۔ یہ حالت ہو رہی تھی کہ بابو جی آ گئے۔

آتے ہی وہ اصلیّت کو سمجھ گئے اور مُشکل سے لڑکوں کو خاموش کیا۔

گناہ سے نجات کا احساس

جس واقعے کا قبلہ واعظ نے اوپر ذکر کیا ہے وہ 1880ء کا ہے جب احسان اللہ محنت مشقّت کرکے کولکاتا یونیورسٹی کے انٹرنس کا امتحان دینے کی تیاری میں ہمہ تن مشغول تھا۔ یہ سال اُس کی زندگی میں ایک نہایت اہم سال تھا، کیونکہ اُس سال اُسے اِس بات کا ذاتی احساس ہوا تھا کہ خداوند مسیح اُسے اور کُل بنی آدم کو گناہ کی طاقت اور غلامی سے نجات دیتا ہے۔ اب تک وہ دلائل وبُرہان کے زور سے مسیحی ایمان کے اصول کا قائل تھا اور ہر ایک کو یہی کہتا تھا کہ میرے ساتھ بحث کرلو اور عقل کے زور سے مجھے قائل کرلو۔ اگر تم میری دلیلوں سے عاجز ہو جاؤ تو میری طرح اسلام کو ترک کرکے مسیحی ایمان کے اصول پر ایمان لے آؤ۔ لیکن اِس

سال اُسے یہ احساس ہوا کہ دلائل اور بُرہان سے کسی شخص کو گناہ کے پنجے سے رہائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ خداوند مسیح نہ صرف عقل کا مالک ہے بلکہ دل اور جذبات پر بھی صرف وہی قابو کر سکتا ہے۔ وہی گناہ گار کو یہ فضل عطا کرتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں پر غالب آئے۔

اب خود اُس کی جوانی کا زمانہ تھا اور سکول کے جوان لڑکے بھی طرح طرح کی آزمائشوں میں گر رہے تھے۔ بٹالہ شہر کا ماحول ہی ایسا تھا کہ یہ جوان لڑکے اردگرد کے حالات سے متأثّر ہو کر آزمائشوں میں مُبتلا ہو رہے تھے۔ احسان اللہ خود اِن آزمائشوں کے زور اور قوّت سے واقف ہو رہا تھا اور ساتھ ہی لڑکوں کی روحانی فلاح و بہبودی کا خیال ہمیشہ اُس کے زیرِ نظر تھا۔ چنانچہ اُس پر اب یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح منکشف ہوگئی کہ میرا آقا جس پر مَیں ایمان لایا ہوں نہ صرف راہ اور حق ہے بلکہ زندگی اور نجات بھی ہے جس کی صلیب

پر سے ایک ایسا چشمہ نکلتا ہے جس میں نہا کر ہر گناہ گار پاک ہو جاتا ہے۔ یہ احساس احسان اللہ کی زندگی میں زندگی بھر کارفرما رہا۔

چنانچہ جب وہ سی۔ ایم۔ ایس کی صد سالہ برسی پر 1899ء میں انگلینڈ گیا تو اُس نے کہا،

مَیں شرم کے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ بپتسمے کے وقت مَیں انجیل جلیل کے اصول کا صرف عقلی طور پر ہی قائل ہوا تھا۔ مجھے اِس حقیقت کا ذاتی تجربہ نہ تھا کہ مسیحی دین کی طاقت ہر انسان کی روحانی زندگی کو تبدیل کر دیتی ہے۔ یہ حقیقت جو مجھ پر دو سال بعد کھلی چراغِ حق کی طرح روشن ہے، اور کوئی استدلال اِس کو بجُھا نہیں سکتا۔ تب خدا نے میرے دل کو پکڑا۔ اُس کا پاک نام مبارک ہو جس نے مجھے اپنا فرزند بنا کر مجھے گناہوں سے نجات بخشی اور میرے قدموں کو اپنے فرزند کے حیرت انگیز نور میں چلایا۔ اُس سال سے یہ احساس مجھ میں روز بہ روز بڑھتا ہی جا رہا ہے اور مَیں ہر چھوٹے بڑے انسان کو یہی خوش خبری سُناتا آیا ہوں اور سُناتا رہوں گا۔

بٹالہ میں اُستاد

جب احسان اللہ نے کولکاتہ یُونیورسٹی کے میٹریکیولیشن کا امتحان پاس کرلیا تو بیئرِنگ صاحب نے اُس کی فارسی، اُردو کی قابلیت، جوشِ ایمان، بے ریا زندگی اور اخلاصِ عقیدت دیکھ کر اُسے سکول میں اُستاد مقرر کر دیا۔ وہ بڑی محنت اور کاوش سے پڑھانے سے پہلے سبق تیار کیا کرتا تھا۔ جہاں وہ لڑکوں کو بہت پیار کرتا تھا وہاں وہ اُنہیں سزا دینے میں بھی دریغ نہ کرتا تھا۔ چنانچہ ایس۔ اے۔ سی گھوش لکھتے ہیں،

جب میری عُمر دس سال کے قریب ہوئی تو مجھے نارووال سے بیئرِنگ سکول بھیجا گیا۔ وہاں احسان اللہ اُستاد تھا۔ وہ لڑکوں کو بڑی عَرق ریزی سے محنت کر کے پڑھاتا تھا اور جو لڑکا محنت کرنے سے گریز کرتا یا اپنا سبق یاد کر کے جماعت میں نہ آتا وہ اُسے سخت سزا دیتا تھا۔ لیکن تمام لڑکے اُس کے فریفتہ تھے اور اُس سے کوسوں دُور بھاگنے کی بجائے اُس کے غلام تھے۔ کیونکہ وہ لڑکوں کو اپنا چھوٹا بھائی تصوّر کرتا تھا۔ وہ ہر وقت جوش

سے بھرا رہتا تھا اور لڑکے اُس کے اشارے پر چلنے کو ہر دم تیار رہتے تھے۔

احسان اللہ کو اب گھر سے نکلے تین چار سال ہو گئے تھے۔ اُس کے ماں باپ، بھائیوں اور رشتے داروں کی طرف سے نامہ اور پیغام سب بند تھے گویا وہ اُن کی طرف سے مر گیا ہے۔ اُس نے بیس سال نارووال میں کاٹے تھے جس کی ہر گلی کُوچے سے اُس کی گزشتہ زندگی وابستہ تھی۔ بٹالہ میں اُس کے رشتے دار تھے، لیکن جوں ہی اُنہیں معلوم ہوا کہ وہ "بے دین" ہو گیا ہے اُنہوں نے اُس کی طرف رُخ بھی نہ کیا۔ اِس حالت میں اُسے غالب کا شعر یاد آتا تھا ؎

> کرتے کِس منہ سے ہو غُربت کی شکایت غالب
> تُم کو بے مِہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

سب سے زیادہ اُسے ماں کی یاد ستاتی تھی جس کو وہ از حد پیار کرتا تھا۔ وہ اُسے فرشتے سے کم نہ سمجھتا تھا اور تا حیات

اُس کی زندگی اورنمونے کے لئے خدا کا شُکر کرتا رہا۔ اُسے ایسی فرشتہ سیرت ماں یاد کرکے جہاں خوشی ہوتی تھی وہاں اُس کا یہ بھی جی کرتا تھا کہ ماں کا منہ بھی دیکھے۔ اُسے اب تجربے سے معلوم ہوگیا کہ خداوند نے سچ فرمایا تھا،

> یہ مت سمجھو کہ مَیں دُنیا میں صلح سلامتی قائم کرنے آیا ہوں۔ مَیں صلح سلامتی نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ مَیں بیٹے کو اُس کے باپ کے خلاف کھڑا کرنے آیا ہوں، بیٹی کو اُس کی ماں کے خلاف اور بہو کو اُس کی ساس کے خلاف۔ انسان کے دشمن اُس کے اپنے گھر والے ہوں گے۔ جو اپنے باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ پیار کرے وہ میرے لائق نہیں۔ جو اپنے بیٹے یا بیٹی کو مجھ سے زیادہ پیار کرے وہ میرے لائق نہیں۔ جو اپنی صلیب اُٹھا کر میرے پیچھے نہ ہو لے وہ میرے لائق نہیں۔ جو بھی اپنی جان کو بچائے وہ اُسے کھو دے گا، لیکن جو اپنی جان کو میری خاطر کھو دے وہ اُسے پائے گا۔ (متی 10:34–39)

لیکن خداوند نے یہ بھی فرمایا تھا،

> جس نے بھی میری اور اللہ کی خوش خبری کی خاطر اپنے گھر، بھائیوں، بہنوں، ماں، باپ، بچوں یا کھیتوں کو چھوڑ دیا ہے اُسے اِس زمانے میں ایذا رسانی کے ساتھ ساتھ سَوگُنا زیادہ گھر، بھائی، بہنیں، مائیں، بچے اور کھیت مل جائیں گے۔ اور آنے والے زمانے میں اُسے ابدی زندگی ملے گی۔ (مرقس 10:29–30)

احسان اللہ نے اِس وعدے کو اپنے حق میں سچ پایا۔ بٹالہ میں سب مسیحیوں کے گھر اُس کے لئے کھلے تھے۔ وہ جہاں جاتا اُس کی آؤ بھگت ہوتی۔ خاص کر بابو سِنگھا کی کوٹھی اُس کا گھر ہوگیا تھا جہاں وہ جس وقت چاہتا بے کھٹکے چلا جاتا تھا۔ بابو صاحب احسان اللہ کے باپ تھے، اور اُن کی اہلیہ محترمہ اُس کی ماں جو اُس کی ہر طرح سے خبرگیری کرتی تھیں۔ بابو صاحب کے بیٹے راجو اور جوتی احسان اللہ کو اپنا بھائی سمجھتے تھے، اور اُن کی بیٹیاں احسان اللہ کی بہنیں تھیں۔ بیرِنگ

صاحب باپ کی طرح اُس پر شفقت کا ہاتھ رکھتے اور وائٹ بریخٹ صاحب اُس سے بھائی کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔ مس ٹکر مادرِ مُشفِقہ کی طرح اُس سے سلوک کرتی تھی، اور ہر چھوٹا بڑا اُس کی عزّت اور قدر کرتا تھا۔ بیٹ من بھی اُسے ملنے کی خاطر آجاتے اور اُس کے حوصلے اور تسلّی کا باعث ہوتے تھے۔ سکول کے طلبا میں وہ ہر دل عزیز تھا، اور ہر لڑکا اُس کے لئے اپنی جان دینے کو تیار تھا۔ غرض، احسان اللہ کی زندگی چاروں طرف محبّت کی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ ہر شخص اُسے پیار کرتا تھا۔ وہ ہر ایک کو پیار کرتا تھا۔ نارووال کے بجائے اب بٹالہ اُس کا وطن ہوگیا تھا جس کے در و دیوار سے اُسے بے لاگ محبّت ہوگئی تھی۔

احسان اللہ کو اکثر اوقات بٹالہ سے امرتسر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ امرتسر اُن ایّام میں مسیحی ایمان کا گڑھ تھا جہاں مس ہیولٹ، رابرٹ کلارک، ڈاکٹر ہنری مارٹن کلارک، پنڈت

کھڑک سنگھ، مولوی عماد الدین لاہز، بابو رُلیا رام، رجب علی جیسی ہستیاں جماعت کی زینت تھیں۔ یہ سب اصحاب اُس کی خوب مہمان نوازی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ وہ اُن کے پاس بیٹھ کر انجیل جلیل کے رُمُوز سیکھتا، اُن کی نصیحتوں سے فیض یاب ہوتا اور اُن کی صُحبت سے اپنے مسیحی ایمان میں ترقی کرتا گیا۔ وہ لوگ بھی اُس کے مسیحی جوش اور بے ریا ایمان سے متاثّر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یوں اُن سب میں باہمی رشتہِ محبّت بڑھتا گیا۔ چنانچہ احسان اللہ نے مسیح کی جماعت کی برادری میں اپنے لئے ایک مُستقل جگہ بنا لی۔ جوں جوں مہینے اور سال گزرتے گئے محبت کے یہ رشتے بڑھتے اور مضبوط ہوتے گئے۔

جب احسان اللہ نے بیرِنگ سکول میں پڑھانا شروع کیا تو چونکہ وہ قومِ خواجگان سے مسیحی ہوا تھا، لڑکوں اور اُستادوں نے اُسے "شیخ صاحب" بلانا شروع کر دیا۔ لیکن اُس نے اِس بات کو بُرا منایا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ خطاب قومی اورنسلی

امتیازات کو برقرار رکھتا ہے اور انسان کے دل میں شیخی، تکبّر اورغرور پَیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ بیرِنگ صاحب اور بابوسنگھا نے یہ مناسب سمجھا کہ اُسے میاں احسان اللہ کے نام سے پُکارا جائے۔ تب سے تمام مسیحی، اُستاد اورلڑکے اُسے "میاں صاحب" کہنے لگے۔ بٹالہ اور امرتسر کے لوگ اُسے "میاں احسان اللہ" بُلایا کرتے تھے جس طرح شیخ حسین بخش اور اُس کے بیٹوں کو "میاں" کے خطاب سے "میاں پوَلس،" "میاں صادق" وغیرہ بُلاتے تھے۔

بنّوں میں اُستاد

جب رابرٹ کلارک 1855ء کے اوائل میں دریائے اٹک کے پارصوبۂ سرحد میں پہلی بار گیا تو وہ ایک ایسے مُلک میں پہنچا جہاں صدیوں سے مُنجّیِٔ عالمین کا نام اور انجیل جلیل کا جاں فزا پیغام سُنائی نہیں دیا تھا۔ پشاورجاتے ہی اُس نے اپنے رفقا کے ساتھ صلاح کرکے یہ فیصلہ کیا کہ سرحد کا

"مِشن محض مدافعت کے لئے ہی نہیں بلکہ حملہ کرنے کے لئے بھی ہو گا۔ سرحدی مِشن کا یہ کام ہو گا کہ مسیحی ایمان کا عَلَم مخالفین کے مُلک میں گاڑا جائے اور انجیل جلیل کا پیغام ایران اورمرکزی ایشیا میں پہنچایا جائے۔"

اِن بےچاروں کو کیا معلوم تھا کہ انگریز افسر برطانوی حکومت کے قیام کو ہر بات پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر انجیل کی اشاعت سے اُن کی سلطنت کی جڑیں مضبوط ہوں تو اُنہیں انجیل کو آلۂ کار بنانے میں کوئی اعتراض نہ ہو گا، لیکن اگر انجیل کا پرچار سلطنت کے قیام اور اشاعت کی راہ میں حائل ہوتو بغیرکسی تأمّل کے انجیل کو قربان کر دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ صُوبے کے چیف کمشنر کرنیل میکی سن نے لکھ بھیجا،

"مَیں آپ کو سرکاری طور پر خبر دیتا ہوں کہ سیاسی وجوہات کی بنا پر مَیں اِس بات کے خلاف ہوں کہ کوئی مشنری دریائے سندھ کو پار کرے۔"

اِس کے چند ہفتے بعد کرنیل میکی سن مارا گیا اور سر ہربرٹ ایڈورڈز چیف کمشنر مقرر ہوا۔ اُس نے اعلان کیا، "سرحد میں مِشن قائم کرنے میں کسی قسم کی رُکاوٹ نہیں ہو گی۔" اِس اعلان کی وجہ سے مِشن تو قائم ہو گیا، لیکن سِول اور ملٹری افسروں کی ذہنیت میں فرق نہ آیا۔ کولکاتا سے احکام صادر ہو گئے جو اِس قسم کے تھے کہ کلارک لکھتا ہے، "اگر گورنمنٹ کے خلاف کوئی سازش ہوتی تو وہ اِس سے زیادہ سخت احکام صادر نہیں کر سکتی تھی!"

درۂ ٹوچی کے سرے پر بنّوں واقع ہے۔ کلارک نے اُسے ایک نکّڑ کا مقام تصوّر کر کے سرحدی مِشن کا ایک صدر مقام بنا دیا۔ وہاں مشنری تھے۔ وہاں کے سکول کے لئے ایک ایسے اُستاد کی ضرورت ہوئی جو قرآن و احادیث سے بھی خوب واقف ہو اور مسیحی اُصول کو مسلمان طلبا اور اُن کے والدین کے سامنے پیش کرنے کی اہلیّت رکھتا ہو۔ کلارک کی مردُم

شناس نظر میاں احسان اللہ پر پڑی جو اپنے علم اور جوشِ تبلیغ کے سبب سے جماعت میں ممتاز تھے۔ اُس نے سکول کے پرنسپل سے اِس کا ذکر کیا، جس نے سوچ بچار کر کے اِس تجویز کو منظور کر لیا۔

جب اُس نے میاں احسان اللہ سے اِس کا ذکر کیا تو اُس نے جواب دیا، "بہتر ہے کہ ہم اِس معاملے میں دُعا کر کے خدا کی راہنمائی مانگیں۔" چنانچہ دونوں نے گُھٹنے ٹیکے اور بڑی دل سوزی سے دُعا کی۔ دُعا کے بعد پرنسپل صاحب نے کہا، "احسان، میرا جی تو نہیں کرتا کہ تم میرے سکول سے جاؤ۔ لیکن خدا ہمارے بزرگوں کے ذریعے ہم کو بُلاتا ہے۔ کلارک صاحب چرچ مشن کے سکریٹری ہیں، اور یہ دعوت اُن کی طرف سے ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم بنُّوں جا کر وہاں کے پٹھان مسلمان لڑکوں کو نجات دہندے کے پاس لانے کی خدمت سرانجام دو۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر تم پوری کوشش کرنے کے باوجود یہ محسوس کرو کہ تم وہاں تبلیغ کا کام اور اپنے

فرائض کام یابی سے نہیں کر سکتے اور تم وہاں سے واپس آنا چاہو تو تم واپس میرے سکول میں سیدھے چلے آنا۔ بٹالہ تمہارا گھر ہے۔"

بابو سنگھا نے بھی کہا، "احسان، صوبہ سرحد پنجاب نہیں ہے، اور نہ بنّوں بٹالہ ہے۔ تم جوشیلے لڑکے ہو۔ محتاط ہو کر رہنا۔ کوئی تمہارے پیٹ میں چُھرا نہ گھونپ دے۔"

جب میاں احسان اللہ بنّوں پہنچے تو اُنہیں معلوم ہوا کہ واقعی پٹھانوں اور پنجابیوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اُنہوں نے سکون سے کام شروع کر دیا۔ وہ سکول کے بعد اپنے مخصوص جوش کے ساتھ برسرِ بازار انجیل کا جاں فزا پیغام سُنایا کرتے تھے۔ جن اصحاب نے میری کتاب "صلیب کے عَلَم بردار" میں فینڈر، بِشپ فرنچ، رابرٹ کلارک اور ڈاکٹر پینل کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیا ہے وہ اُن دُشواریوں سے خوب واقف ہیں جو اُس زمانے میں سرحد کے علاقے

میں پٹھانوں کی طرف سے اور برطانوی حکومت کے کارکُنوں کی طرف سے مسیحی مبلّغ کو پیش آتی تھیں۔

میاں صاحب کو کئی دفعہ زود کوب کیا گیا، قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ اُن پر حملے بھی کئے گئے جن سے وہ بال بال بچ گئے۔ مُلاّؤں نے علانیہ کہہ دیا کہ چونکہ وہ اسلام سے مُرتد ہو گئے ہیں وہ از روئے شریعت واجبُ القتل ہیں۔لیکن میاں صاحب اپنی دُھن کے پکّے تھے۔ اُن کی طبیعت ابتدا ہی سے نڈَر تھی۔ وہ اِن دھمکیوں کو خاطر میں بھی نہ لاتے تھے۔ پٹھانوں کی طرح وہ بھی قد کے لمبے تھے۔ اُن کا چہرہ سُرخ تھا، اور وہ خوش وضع جسم رکھتے تھے، ایسا جسم جو نہ صرف وجیہہ، مضبوط، متناسِب اور شہ زور تھا بلکہ ہر قسم کی تکالیف کو جھیلنے کا عادی ہو چکا تھا۔ سکول کے لڑکے اُن کے جاں نثار مددگار تھے، وہ ہر وقت اُن کی حفاظت کرتے تھے۔

میاں صاحب کی عُمر اُس وقت اٹھائیس سال کے قریب تھی، اور عین شباب کا عالَم تھا۔ مُلّا بار بار پٹھانوں کو اُکسا کر فساد شروع کروا دیتے، اناجیل کے حصّے اور کتابیں پھاڑ دیتے۔ اکثر ہاتھاپائی کی نوبت آ جاتی۔ پولیس کو ہر وقت مداخلت کرنی پڑتی تھی۔

بار بار کی مداخلت سے پولیس کے مسلمان افسر تنگ آ گئے۔ اُنہوں نے افسرانِ اعلیٰ کو میاں صاحب کے خلاف اُکسانا شروع کر دیا۔ میاں صاحب کوئی انگریز مِشنری تو تھے نہیں کہ افسرانِ بالا اِن کی حفاظت کا بار اپنے کندھوں پر اُٹھاتے رہتے۔ آخر میں اُنہوں نے میاں صاحب کو صاف کہہ دیا کہ تم بازار کی مُنادی چھوڑ دو۔

میاں صاحب نے جواب دیا کہ مَیں اپنے خدا کا حُکم مانوں گا۔ تم مجھے انجیل کی تبلیغ سے قانوناً روک نہیں سکتے۔

جب حُکام نے دیکھا کہ یہ شخص اپنے ارادے کا پکّا ہے تو اُنہوں نے ایک حُکم صادر کروایا کہ اِس شخص کا بنّوں میں رہنا انگریزوں کے لئے خطرے کا باعث ہے۔ اِس قسم کا فیصلہ نادری! اور صوبہ بھی صوبہ سرحد، جہاں ہر ضلعے کا افسر مطلق العنان سا حُکمران تھا۔ نہ داد،[a] نہ فریاد۔ بس حُکم صادر ہو گیا کہ یہاں سے نکل جاؤ اور اپنے پنجاب دیس کو واپس چلے جاؤ۔ یوں میاں صاحب جبراً بنّوں سے بٹالہ واپس آ گئے۔

بیَرنگ سکول میں دوبارہ خدمت

جب میاں احسان اللّٰہ بنّوں سے بٹالہ کو واپس آئے تو بیَرِنگ سکول میں پھر اُستاد مقرر ہو گئے۔ اُن ہی ایّام میں اُن کا قدیم ہم جماعت ڈاکٹر دینا ناتھ پریتو دِتّا برطانیہ سے ڈاکٹری کے امتحانات اعزاز کے ساتھ پاس کر کے واپس لَوٹ آئے تھے، اور اُنہوں نے سرکاری نوکری کے لئے درخواست

[a] یعنی انصاف

دے رکھی تھی۔ کلارک نے اُن سے کہا کہ جب تک آپ کو نوکری نہیں ملتی اور سکول کے پرنسپل کورفیلڈ[a] انگلینڈ سے نہیں آتے آپ بیرِنگ سکول کو چلائیں۔ ڈاکٹر دِتّا لکھتے ہیں،

اُن ایّام میں احسان اللّٰہ پھر میرا دستِ راست تھا۔ وہ میرا بھائی تھا جس کی ہم سب عزّت کرتے تھے۔ ہم پہلے کی طرح سنڈے سکول کے بعد اتوار کے روز بٹالہ کے بازار میں انجیل کا پیغام سُنایا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں اُس کا تبلیغی جوش آگے سے بھی بڑھ چڑھ کر تھا۔

اُس زمانے میں بیرِنگ سکول تمام پنجاب میں مشہور سکول تھا۔ پرنسپل کارفیلڈ کی اہلیہ اور مِس ٹکر رضاکارانہ طور پر سکول میں کام کرتی تھیں۔ سکول میں 50 کے قریب طلبا تھے، اور پرنسپل اور بابو سنگھا کے علاوہ سات اُستاد تھے جن میں سے ایک اُستاد باری باری شب و روز لڑکوں کے ساتھ رہتا تھا۔ سکول میں صبح کی دُعا کے بعد ہیڈ ماسٹر لڑکوں سے کتابِ مقدّس کے اُس حصّے پر جو اُس سے پہلے روز پڑھایا جاتا تھا سوال کرتا۔

Corfield[a]

اِس طرزِ عمل سے ہر سال میں دو انجیلوں کا مکمّل طور پر مطالعہ کیا جاتا تھا۔ ہر اُستاد سکول شروع ہونے سے پہلے آدھا گھنٹہ کتابِ مقدّس کا مطالعہ کرواتا، اور تمام طلبا ہفتے میں تین آیات زبانی حِفظ کیا کرتے تھے۔ سکول کے لڑکوں کی ایک بشارتی کمیٹی تھی جو شروع سے چلی آ رہی تھی۔ اِس کے علاوہ بعض لڑکے خود اتوار کو دُعائیہ میٹنگ کیا کرتے تھے۔[a]

ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ میاں احسان اللّٰہ جیسے پُرجوش اُستاد کی مسیحی زندگی کا اثر طلبا اور اساتذہ پر کس قدر ہوا ہو گا۔

خادم بننے کی خواہش

اُن ایّام میں میاں احسان اللّٰہ کے چند دوستوں نے اُنہیں مشورہ دیا کہ آپ سرکاری نوکری اختیار کر لیں اور سکول کے کام کو چھوڑ دیں۔ اُنہوں نے کہا کہ آج کل انٹرنس پاس آدمی ملتے کہاں ہیں؟ گورنمنٹ ایسے لوگوں کو جلدی جلدی

---

[a] ماخوذ از پنجاب مشن نیوز بابت 15 اگست، 1888ء

ترقی دے رہی ہے۔ آپ کا رُتبہ اعلیٰ ہو گا۔ تنخواہ نہایت معقول ہو گی۔ پنشن کا بھی انتظام ہو گا۔ آپ کو سکول کے کام میں نہ تو اچھی تنخواہ ملے گی اور نہ پنشن۔ آپ کی عزّت بھی اِتنی نہیں ہو گی۔ دیکھیں بابو سِنگھا کا لڑکا راجو سرکاری نوکری پر لگا ہے، اور اُمید ہے کہ وہ کسی دن اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو جائے گا۔

اُنہوں نے جواب دیا، "مجھے دولت، عزّت، جاہ و ثروت نہیں چاہیئے بلکہ حق تو یہ ہے کہ مَیں سکول میں پڑھانا بھی نہیں چاہتا۔" جب احباب نے پوچھا کہ آخر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں تو اُنہوں نے جواب دیا، "مَیں اپنی زندگی انجیل کی خدمت کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک دوست نے کہا، "آپ دیکھتے نہیں کہ اب وائٹ بریخٹ صاحب نے بھی چوہڑوں کو بپتسمہ دینا شروع کر دیا ہے، اور اب جماعت میں سیالکوٹ، دینا نگر اور گورداسپور

وغیرہ سے چُوہڑوں کی بھرتی ہوتی جا رہی ہے؟ اگر آپ خادم الدین بنے تو بس چُوہڑوں کے پِیر ہو جاؤ گے۔"

اُنھوں نے ہنس کر کہا ۔

> گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں مانمی خواہیم ننگ و نام را
>
> گو یہ عقل مندوں کے نزدیک بدنامی ہے،
>
> ہم لحاظ اور عزّت نہیں چاہتے۔

اُنھوں نے کہا، "کیا تم نے نہیں پڑھا کہ پولُس رسول فرماتا ہے،

> مجھ پر افسوس اگر اِس خوش خبری کی منادی نہ کروں (1۔کُرنتھیوں 16:9) ...
>
> مَیں سب کچھ اِس عظیم ترین بات کے سبب سے نقصان سمجھتا ہوں کہ مَیں اپنے خداوند مسیح عیسیٰ کو جانتا ہوں۔ اُسی کی خاطر مجھے تمام چیزوں کا نقصان پہنچا ہے۔ مَیں اُنھیں کُوڑا ہی سمجھتا ہوں۔ (فلپّیوں 8:3)

میرے نجات دہندے نے مجھے فرمایا ہے،

> کیا فائدہ ہے اگر کسی کو پوری دُنیا حاصل ہو جائے مگر وہ اپنی جان سے محروم ہو جائے یا اُسے اِس کا نقصان اُٹھانا پڑے؟ (لوقا 25:9)

میرے عزیز برادر۔ اگر تم چاہتے ہو کہ بڑے آدمی بنو تو خداوند کے حکم کو یاد رکھو،

> تم جانتے ہو کہ قوموں کے حکمران اپنی رعایا پر رُعب ڈالتے ہیں، اور اُن کے بڑے افسر اُن پر اپنے اختیار کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ لیکن تمہارے درمیان ایسا نہیں ہے۔ جو تم میں بڑا ہونا چاہے وہ تمہارا خادم بنے اور جو تم میں اوّل ہونا چاہے وہ سب کا غلام بنے۔ کیونکہ ابنِ آدم بھی اِس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ اِس لئے کہ خدمت کرے اور اپنی جان فدیہ کے طور پر دے کر بہتوں کو چھڑائے۔ (مرقس 10:42–45)

بٹالہ میں تبلیغی خدمت کا آغاز

اُن دنوں میں وائٹ بریخٹ بٹالہ میں تھے۔ وہ نہایت عالم جرمن اور فرنچ زبانوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور بشپ فرنچ صاحب کی طرح "ہفت زبان" کہلاتے تھے۔ جب سے میاں احسان اللہ نارووال سے بٹالہ گئے تھے وائٹ بریخٹ اُن کے مہربان دوست اور صلاح کار رہے تھے۔ جب میاں صاحب بنّوں سے بٹالہ واپس آئے تو وائٹ بریخٹ کی مردُم شناس نظر نے دیکھا کہ جس طرح سونا آگ میں تایا جانے سے خالص ہو جاتا ہے اُسی طرح میاں صاحب کا دینی جوش بنّوں کی مخالفانہ آگ کی بھٹّی سے نکل کر بہت زیادہ چمک رہا ہے۔ اُنہوں نے اُنہیں اپنے پاس بُلایا اور اُنہیں بڑے پیار سے اپنا رفیقِ کار بننے کی دعوت دی۔ اُنہوں نے کہا، "مَیں آپ کے لئے ہمیشہ دُعا کرتا رہا ہوں کہ خدا آپ کو انجیل کی اشاعت اور مسلمانوں کی نجات

کا ذریعہ بنائے۔ مَیں اُس کے نام سے آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ سکول کا کام چھوڑ کر آپ اپنی زندگی کو اپنے مسلمان بھائیوں کی روحوں کو بچانے کے لئے وقف کریں۔" دونوں نے خدا کے حضور دُعا کی۔ میاں صاحب نے خدا کا شُکر کیا جس نے اُسے یہ عزّت بخشی کہ دوسروں کو بچانے کا ذریعہ بنے۔

اب میاں صاحب نے سکول کا کام چھوڑ دیا۔ وہ وائٹ بریخٹ کے ساتھ ہر جگہ جاتے اور انجیل جلیل کا جاں فزا پیغام بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہر چھوٹے بڑے کو نڈَر ہو کر سُناتے تھے۔ اِس سلسلے میں اُنہیں اکثر اوقات قادیان جانے کا اتفاق ہوا جہاں مرزا غلام احمد نے اپنا نیا فرقہ کھڑا کر رکھا تھا۔ قادیان بٹالہ سے بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ مرزا جی نے مسلمانوں کو اپنے پھندے میں پھنسانے کا نیا ڈھنگ اختیار کر رکھا تھا اور ایسا ظاہر کرتا تھا گویا وہ مسلمانوں کا نمائندہ ہو کر مسیحی دین کی مخالفت کرتا ہے۔ اِسی کام کے

لئے اُس نے اپنی اپیلیں کیں اور یوں بے وقوفوں کے روپئے سے اپنی امارت قائم کر لی۔ پھر اُس نے صاحبِ الہام ہونے کا دعویٰ مسیحِ مَوعود ہونے کا دعویٰ، مہدیِ معہود، کرشن زمانی اور نبوّت بروزی کا دعویٰ کر دیا۔ جہاں دانش مند اُس کی مجنونانہ حرکتوں پر ہنس دیتے تھے وہاں اُس کے اندھے مُرید ہر بات پر آمین کہنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ میاں احسان اللہ اور وائٹ بریخنٹ قادیان جاکر اُس کے مسیحائی دعویٰ کی بڑے زورشور سے تردید کرتے اور مسلمانوں اور مرزائیوں کو حقیقی مسیح پر ایمان لاکر نجات پانے کی دعوت دیتے تھے۔

مرزائے قادیانی کا سب سے بڑا مخالف مولوی محمد حسین بٹالہ میں رہتا تھا۔ وہ ایک نہایت عالم شخص تھا، اور اُس کا گھر بٹالہ کے قومِ خواجگان کے گھروں سے مُلحق تھا۔ اب میاں احسان اللہ کو مُنجّیِ عالمین کا فرماں بردار ہوئے نو سال کے قریب ہو گئے تھے، اور اُن کی برادری کے لوگوں کا غم و غصّہ بہت کم ہو چکا تھا۔ اب وہ اپنے پرانے رشتے داروں

سے جو بٹالہ میں تھے اکثر ملنے کو جاتے تھے۔ مُلاقات کے دوران وہ مسیحی ایمان اور اسلام کے اصول پر عموماً بات چھیڑتے اور سب کو علانیہ کہتے کہ اگر تم اپنے گناہوں سے نجات پانا چاہتے ہو تو صرف خداوند مسیح تم کو اُن کے پنجے سے چُھٹکارا بخش سکتا ہے۔

مولوی محمد حسین قریب ہی رہتے تھے، اِس لئے وہ اُن کے پاس بھی جاتے اور اُن سے دینی گفتگو کرتے تھے۔ مولوی صاحب کے اعتراض زیادہ تر مسئلۂ تحریف سے تعلّق رکھتے تھے۔ میاں صاحب کو اُن اعتراضات کے معقول جواب دینے میں کوئی دِقّت پیش نہ آتی۔ تب اُن کے رشتے دار کہتے کہ مولوی محمد حسین اہلِ سُنّت کا مولوی ہے۔ وہ کسی شیعہ مولوی کو اِس آسانی سے جواب نہیں دے سکتے۔ میاں صاحب کے تمام رشتے دار تاجر تھے، اِس لئے وہ اُن کی دُکانوں پر جا بیٹھتے اور اُن سے دینی گُفتگو کیا کرتے تھے۔ عموماً دُکانوں پر جمگھٹا لگ جاتا، اور وہ اِس موقعے سے فائدہ اُٹھا

کر خداوند کی نجات کا پیغام سب کو بڑے جوش سے سُناتے، ایسا کہ سب سُننے والوں کے دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

وائٹ بریخنٹ نے بٹالہ میں ایک تبلیغی مرکز قائم کیا تھا۔ اِس مرکز میں شہر کے لوگ اکثر آتے تھے جن سے احسان اللہ دینی گُفتگو کیا کرتے تھے۔ اے۔ایل۔او۔ای سکول قریب تھا۔ مِس ٹکر نے غیر مسیحی لڑکوں کے لئے یہ سکول قائم کیا تھا تاکہ جس طرح مسیحی لڑکوں کو بیرِنگ سکول میں انجیل کی تعلیم ملتی ہے اُسی طرح غیر مسیحی لڑکے بھی مُنجّیِٔ جہان کے نام سے واقف ہوکر اُس پر ایمان لا سکیں۔ یہاں میاں صاحب اپنا زیادہ وقت اے۔ایل۔او۔ای سکول کے طالب علموں کو انجیل سُنانے میں صَرف کرتے تھے، کیونکہ وہ تجربے سے جانتے تھے کہ ایسا سکول کِس طرح اپنے لڑکوں کو خداوند کے قدموں میں لا سکتا ہے۔ اُن کی اَن تھک کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا

کہ بٹالہ میں طالبانِ حق کی ایک بڑی جماعت پیدا ہوگئی جو انجیل و قرآن کی تعلیمات کا موازنہ کرنے لگی۔

شادی

اب میاں احسان اللہ ماشا اللہ عین جوانی کے عالم میں تھے۔ اُن کا قد لمبا اور وجیہہ، سینہ کُشادہ اور بدن نہایت متناسب اورخوش وضع تھا۔ اُن کا چہرہ شگفتہ اورسُرخ رہتا تھا، اور جسم اُن کی شہرت کی طرح بے داغ تھا۔ اُن کے دوستوں نے اُنہیں شادی کا مشورہ دیا۔ اُس زمانے میں مِس ٹکر کے ساتھ ایک خاتون مِس لوئیزا نوآ[a] رہتی تھیں جو اچھے خاندان کی تھیں۔ اُن کا باپ راٹھور راجپوتوں میں سے ایمان لائے تھے اورشملہ میں ریلوے میں کام کرتے تھے۔ اُن کی بیٹی لوئیزا امرتسر کے الیگزنڈرا سکول[b] میں پڑھتی تھیں۔ چونکہ بابو سنگھا کی بیٹی روزی اُن کی ہم جماعت تھیں اِس لئے وہ اکثر بابو

Louisa Noah[a]
Alexandra School[b]

سنگھا کے گھر میں اپنی سہیلی کے ساتھ آیا جایا کرتی تھیں۔ انٹرنس پاس کر کے وہ بٹالہ میں آ گئی تھیں۔ وہ قبول صورت ہونے کے علاوہ دینی جوش سے بھری تھیں۔ انٹرنس پاس تھیں اورکڑھائی وغیرہ میں ماہر تھیں۔

جب ڈاکٹر دِتّا ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرکے بٹالہ آئے تو اُنھوں نے اپنے دوست کو کہا، "اگر تم اِس دین دار خاتون سے شادی کرلو توتم دونوں کی خوب اچھی طرح نبھے گی۔ وہ دین دار ہے، تمہاری طرح جوشیلی ہے، خدا کے کلام کی تلاوت اور دُعا عبادت میں ہر وقت لگی رہتی ہے۔ مِس ٹکر کے ساتھ شہر کی عورتوں کے پاس جا کر خدا کی نجات کی خوش خبری سُناتی ہے۔ تم بھی اپنی زندگی اِس کام کے لئے وقف کر رہے ہو۔ تم اِس تجویز پر غور کرو۔"

ڈاکٹر دِتّا نے مِس ٹکر سے بھی کہا، "احسان کو آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں۔ اُس کی زندگی، اُس کے ایمان، اُس

کے جوش اور اُس کے بے داغ خیالات اورجذبات سے آپ خوب واقف ہیں۔ اگرمِس نو آ کی شادی احسان سے ہو جائے تو یہ جوڑا نہایت مبارک ہو گا۔" یہ بات چھیڑ کر وہ خود سِول سرجن ہوکر رُہتک چلے گئے۔ لیکن جو خیال اُنہوں نے پیش کیا وہ میاں صاحب کو، مِس ٹکر اور دیگر پردیسی خادم الدین کو اور بابوسنگھا کو پسند آیا۔ توبھی کسی نے پہل نہ کی، کیونکہ مِس نوآ کا رُجحان شادی کی طرف نہ تھا۔ اُنہیں بس ایک ہی دُھن تھی کہ کس طرح مسیحی اورغیرمسیحی عورتوں کو نجات کا پیغام سُنائیں۔ اُن کا وقت کلامِ الٰہی کے مطالعے، دُعا، گیت گانے، باجا بجانے اورعورتوں کو انجیل کا پیغام سُنانے میں صَرف ہوتا تھا۔ دیگر اوقات میں وہ کڑھائی، مصوّری، نقّاشی وغیرہ میں مشغول رہتیں۔

جب اِس تجویز کو پیش کئے ایک دو سال گزر گئے تو ڈاکٹر دِتّا نے پھر اِس سلسلے کو شروع کیا۔ مِس ٹکر نے لڑکی سے بات کی تو اُس نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور کہا کہ وہ کسی سے

شادی نہیں کرے گی۔ مِس ٹکر اور دیگر خواتین نے اُسے سمجھایا، لیکن اُس نے ایک کی نہ مانی۔ گو اُن خواتین کے اصرار پر اُس نے یہ کہا کہ اگر خدا میری ہدایت کرے گا تو مَیں شادی کرلوں گی۔ اِس پر میاں احسان اللّٰہ اور اُن کے خیرخواہوں نے دُعائیں کیں حتّٰی کہ مِس نوآ نے شادی کرنے پر اپنی رضا مندی ظاہر کر دی۔ ؎

کُفر ٹوٹا خدا خدا کرکے

1888ء میں میاں احسان اللّٰہ کی منگنی مِس لُوئیزا نوآ کے ساتھ ہوگئی، اور پانچ ماہ کے بعد یعنی اُسی سال دونوں کا نکاح شملہ میں ہوگیا۔ گھوش صاحب لکھتے ہیں،

> جب ہم لڑکوں نے اُنہیں مبارک باد کہا تو اُنھوں نے کہا، "مَیں ایک فرشتہ سیرت خاتون چاہتا تھا، اور وہ مجھے مل گئی ہے۔ میرے ساتھ مل کر خدا کی حمد و ثنا کرو۔ اُس کے پاک نام کا شُکر ہو۔"

میاں صاحب کی عُمر اُس وقت تیس سال کی تھی۔ اور اُن کی رفیقۂ حیات کی عُمر اِکّیس سال کی تھی۔

3

نارووال کو واپسی

نارووال آنے کی دعوت

1889ء میں وائٹ بریخٹ نارووال گئے۔ اُنھوں نے بیٹ من سے میاں احسان اللہ کے جوشِ ایمان کا ذکر کیا۔ دونوں نے گھُٹنے ٹیک کر خدا کا شُکر کیا جس نے ایسے شخص کو نہ صرف مسیح پر ایمان لانے کی توفیق عطا کی تھی بلکہ جماعت کی خدمت کے لئے بھی بُلایا تھا۔ اتّفاق سے اُن دنوں بیٹ من کی اہلیہ انگلینڈ میں بیمار تھی، اور وہ مَوسمِ گرما میں اُس کے

پاس جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے وائٹ بریخٹ سے درخواست کی کہ احسان کو مجھے دے دو تاکہ وہ میری غیر حاضری میں یہاں کی جماعت اور یہاں کے تبلیغی کام کو سنبھال لے اور مَیں اطمینان سے انگلینڈ جا سکوں۔ وائٹ بریخٹ نے جواب دیا کہ اگر احسان آنا چاہے تو مَیں نارووال کی خاطر اُسے خوشی سے دے دوں گا۔

جب میاں صاحب کو یہ خبر ملی تو اُنھوں نے خوشی سے اپنا تبادلہ منظور کر لیا۔ اب خدا نے اُنھیں نہ صرف اپنے روحانی باپ اور نارووال کی جماعت کی خدمت کرنے کا موقع عطا کیا بلکہ اپنے رشتے داروں، دوستوں اور عزیز و اقارب کو مستقِل طور پر انجیل جلیل کا روح افزا پیغام سُنانے کا بھی موقع بخشا۔

نارووال میں خدمت کا آغاز

میاں احسان اللہ 1889ء میں اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ نارووال واپس آ گئے۔ اپنے عزیز وطن میں واپس آ کر اُنہیں جو خوشی نصیب ہوئی اُس کا ہم اندازہ کر سکتے ہیں۔ نارووال کے در و دیوار سے، اُس کی گلیوں سے، اُس کے سِکھ، ہندو، مسلمان باشندوں سے، لڑکپن کے ہم جماعتوں اور ساتھیوں سے، قومِ خواجگان کے چھوٹوں بڑوں سے مل کر اُنہیں قدرتی طور پر خوشی ہوئی۔ لیکن سب سے زیادہ خوشی اُنہیں اپنے باپ اور خاص کر اپنی ماں سے مُلاقات کر کے ہوئی۔ اُن کا پہلوٹھا بیٹا گیارہ برس کی جُدائی کے بعد اُن سے پھر ملا۔ پُرانے زخم مُندمِل ہو چکے تھے۔ زمانۂ ماضی کی باتیں بھول بسر گئیں اور اب ماں، باپ، بھائیوں، بہنوں اور رشتے داروں نے اُنہیں واپس قبول کر لیا۔

میاں صاحب کو "جھنڈا" میں رہنے کو ایک مکان دیا گیا جو کُنوئیں کے پیچھے ہوتا تھا اور جس کے پچھواڑے کا دروازہ اُن ایّام میں مہنتوں کے گھر کی گلی کی طرف کُھلتا تھا۔ اِس دروازے میں سے اُن کی ماں، بہنیں اور قومِ خواجگان کی عورتیں اُن کے گھر آتی جاتی تھیں، کیونکہ اِس راستے سے بازار میں سے ہو کر جانا نہیں پڑتا تھا اور وہ محلّۂ خواجگان سے سیدھا مہنت کے گھر کے سامنے کی گلی میں چلی جاتیں جس کے آخر میں یہ دروازہ ہوتا تھا جو دستک دینے پر کھولا جاتا تھا۔

میاں صاحب کے ماں باپ اپنی نئی نویلی خوب رو بہو کو دیکھ کر خوش ہوئے، اور جب اُس نے اُنہیں کہا کہ مَیں آپ کی ویسی ہی تابع دار بیٹی ہوں جیسی رحمت علی کی بیوی ہے تو اُن کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سب ایک دوسرے کی مُلاقات سے خوش ہوئے اور خدا کا شُکر بجا لائے جس نے برسوں کی جُدائی کے بعد پھر اُنہیں ملایا تھا۔

اُسی سال خدا نے میاں صاحب کو ایک لڑکا بخشا۔ خاندان بھر میں یہ پہلا لڑکا تھا، اورمیاں صاحب کی ماں خوشی کے مارے پھولے نہ سماتی تھیں۔ وہ اپنے پوتے کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتیں۔ جب بیٹ من نومبر میں انگلینڈ سے واپس لَوٹے تو میاں صاحب اپنے پہلوٹھے بیٹے کو اُن کے پاس لے گئے۔ بیٹ من صاحب لکھتے ہیں،

احسان کپڑے میں لپٹا ایک پارسل جیسا میرے پاس لے آیا اور کہنے لگا، "یہ دیکھیں، آپ کا پوتا۔ آپ اُس کا نام رکھیں اور اُسے پپتسمہ دیں۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا، "ہاں، مَیں اِس کو پپتسمہ دوں گا اور اُس کا نام قربان رکھوں گا۔" مجھے اِس میں رتّی بھر شک نہیں کہ گو قربان جو احسان کا رشتے میں بھائی تھا بغیر پپتسمہ پائے مر گیا تھا، تاہم وہ مسیح پر زندہ ایمان رکھتا تھا اورقیامت کے روز ایمان داروں کے ساتھ اُٹھے گا۔ چنانچہ اِس نوزائیدہ بیٹے کا نام قربان رکھا گیا۔

نارووال میں منادی کی راہنمائی

1890ء کے مَوسمِ گرما میں بیٹ من کو اپنی اہلیہ کی بیماری کے باعث پھر انگلینڈ جانا پڑا۔ میاں احسان اللہ نے جماعت کے کام کو اِس خوش اسلوبی کے ساتھ چلایا کہ سب عش عش کرتے رہ گئے۔ میاں صاحب لڑکوں کے کرسچن ٹریننگ سکول کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کے ذمے دار بھی وہی تھے۔ اُن ایّام میں اُس میں دس لڑکے داخل تھے۔ اُنہوں نے انجیل کے مبلّغین کے لئے ایک ٹریننگ کلاس بھی کھول رکھی تھی جس کی بڑی جماعت میں 17 اور چھوٹی جماعت میں 15 پڑھتے تھے۔ اِس کے علاوہ نارووال مشن کے تمام مُنّادوں کی دیکھ بھال کے وہ ذمے دار تھے۔ نارووال کے بازاروں میں مُنادی کرنا وہ اپنا اوّلین فرض سمجھتے تھے۔ وہ اپنے رشتے داروں کی دُکانوں پر روزانہ جا کر ہر خاص وعام کو مُنجّیِ عالمین کی دعوت سُنایا کرتے تھے۔ مسیحی عبادتوں

میں وہ اِس جوش سے کام لیتے تھے کہ سننے والے متاثّر ہو جاتے تھے۔ ہر جگہ کلام اللّٰہ کی تلاوت شوق سے کی جاتی اور خداوند مسیح کے نام کا چرچا ہر شخص کی زبان پر تھا۔ بیٹ من لکھتے ہیں،

احسان کو خدا نے ایسا فضل بخشا ہے کہ آج وہ میرے منبر پر سے وعظ کرتا ہے۔ اُس نے تمام کام کو احسن طور پر سنبھال لیا ہے۔ اُس کی وجہ سے مَیں یہاں انگلینڈ میں اطمینان سے آ سکا ہوں اور اپنی رُخصتوں کو آرام سے گزار رہا ہوں۔

ایک اَور رپورٹ میں لکھا ہے،

میاں احسان اللّٰہ نے مسٹر بیٹ من کی غیر حاضری میں مُنادوں کے کام کی نہایت اعلیٰ نگرانی کی ہے، اور اُن کی خدمات نہایت گراں قدر ہیں۔[a]

[a] 1890ء کی سی-ایم-ایس سالانہ رپورٹ

پورے پنجاب میں خدمت کا آغاز

اُنّیسویں صدی کے آخری دس سال میاں احسان اللہ کی زندگی اور پنجاب کی جماعتوں کی زندگی کے اہم ترین سال ہیں۔ دونوں کی زندگی کی ترقی ایک دوسرے سے ایسی وابستہ ہے کہ ہم میاں صاحب کی زندگی کو جماعتوں کے بغیر اور جماعتوں کی زندگی کو میاں صاحب کی زندگی کے بغیر سمجھ نہیں سکتے۔ کہنے کو تو میاں صاحب کی رہائش نارووال میں تھی، لیکن درحقیقت وہ ہمیشہ سفر میں رہتے تھے۔ تمام پنجاب، صوبہ سرحد، یُو۔پی بلکہ شمالی ہند کی جماعتوں کی نظریں اُن کی جانب اُٹھتی تھیں۔ خاص کر وہ پنجاب کی جماعتوں کے قائدِ اعظم تھے جن کے دلوں کو اُنہوں نے اِس قدر موہ لیا تھا کہ وہ اُن کے بے تاج بادشاہ تھے۔ پَولس رسول کی طرح اُنہوں نے اُس توفیق کے مطابق جو خدا نے

اُنہیں بخشی پنجاب کی جماعتوں کی بنیاد دانشمند ٹھیکے دار کی طرح رکھی جس پر اب دوسرے عمارت اٹھاتے ہیں۔

> لیکن ہر ایک دھیان رکھے کہ وہ بنیاد پر عمارت کس طرح بنا رہا ہے۔ کیونکہ بنیاد رکھی جا چکی ہے اور وہ ہے عیسیٰ مسیح۔ اِس کے علاوہ کوئی بھی مزید کوئی بنیاد نہیں رکھ سکتا۔ جو بھی اِس بنیاد پر کچھ تعمیر کرے وہ مختلف مواد تو استعمال کرسکتا ہے، مثلاً سونا، چاندی، قیمتی پتھر، لکڑی، سوکھی گھاس یا بھوسا، لیکن آخر میں ہر ایک کا کام ظاہر ہو جائے گا۔ قیامت کے دن کچھ پوشیدہ نہیں رہے گا بلکہ آگ سب کچھ ظاہر کر دے گی۔ وہ ثابت کر دے گی کہ ہر کسی نے کیسا کام کیا ہے۔ اگر اُس کا تعمیری کام نہ جلا جو اُس نے اِس بنیاد پر کیا تو اُسے اجر ملے گا۔ اگر اُس کا کام جل گیا تو اُسے نقصان پہنچے گا۔ خود تو وہ بچ جائے گا مگر جلتے جلتے۔ (1۔کرِنتھیوں 3:10–15)

اِس سے پیشتر کہ ہم یہ بتائیں کہ میاں صاحب نے پنجاب کی جماعتوں کی بنیاد کس طرح رکھی یہ مناسب ہو گا کہ ہم

ناظرین کو پنجاب کی جماعتوں کا حال سُنائیں جو آج 70، 80 سال پہلے تھا تاکہ ناظرین پس منظر سے واقف ہو جائیں۔

4

اچھوت لوگوں کی مسیح تک تحریک

تحریک کی جڑیں

جب اینڈرو گورڈن 1855ء میں سیالکوٹ پہنچا تو اُس نے پہنچنے کے دو سال بعد یعنی ایّامِ فسادات کے بعد نیچ ذات کے لوگوں میں کام شروع کر دیا۔ چُوہڑہ ذات کے لوگ عیسائی ہونے لگے۔ 1863ء میں گوجرانوالہ یُو۔پی مشن کا ایک اَور صدر مقام ہوگیا۔ 1864ء میں گورڈن نے جرائم پیشہ اقوام کے

لوگوں کو بپتسمہ دیا، جبکہ 1866ء میں ظفروال کے میگھ عیسائی ہونے شروع ہو گئے۔ 1876ء میں گورڈن گورداس پور تبدیل ہو گیا، اور 1884ء میں دینا نگر کے چُوہڑے عزیز الحق کے ذریعے عیسائی ہو گئے۔ 1885ء میں بٹاہ کے چرچ مِشن کے بندے وائٹ بریخٹ نے فتح گڑھ چُوڑیاں کے چودہ چُوہڑوں کو بپتسمہ دیا۔

اِن پردیسی مردوں اور عورتوں نے اپنی قیمتی عُمریں انجیل جلیل کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ اُنہوں نے اپنی لیاقت، دولت، علمی قابلیّت اور روحانی زندگیوں کو اپنے نجات دہندے کے قدموں پر نچھاور کر دیا۔ اُنہوں نے صوبہ سرحد، پنجاب، کشمیر اور سندھ میں جا بہ جا اپنے صدر مقام بنائے۔ وہ جہاں گئے اُنہوں نے سکول، کالج، ابتدائی درس گاہیں، دست کاری کے کارخانے، بیوہ خانے، یتیم خانے، ہسپتال، شفاخانے اور چھاپہ خانے وغیرہ جگہ جگہ قائم کر دیئے۔ اُن کے صدر مقاموں سے انجیل جلیل کی اشاعت

چاروں طرف شہروں، قصبوں اور گاؤں میں ہوئی۔ اُن کی مسلسل اوراَن تھک کوششیں پھل دار ہوئیں۔ اور اُن کے تعلیمی اداروں کے طلبا انجیل کے جاں فزا پیغام سے متاثّر ہو کر مسیحی ہو گئے اور کئی ایک آزاد خیال شخص اپنے آبائی رسوم، عقائد و مذاہب سے متنفّر ہو کر مسیحی ایمان کے تابع ہو گیا۔ شمالی ہند کا کوئی حصّہ ایسا نہ رہا جس کے بڑے شہروں اور قصبوں سے مختلف طبقوں کے لوگ خداوند مسیح کے قدموں میں نہ آئے ہوں۔ اُن میں سِکھ تھے، پٹھان تھے، سیّد تھے، شیخ تھے، برہمن تھے، کشتری تھے، چُوہڑے تھے۔ غرض ہر ذات، ہر مذہب، ہر قوم اور قبیلے کے لوگ مسیح کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ جہاں اُن میں بڑے بڑے زمین دار اور صاحبِ دَولت و عقل تھے وہاں گاؤں کے اوسط درجے کے ہندو اور مسلمان قصبوں کے سُنّی، شیعہ، صوفی، سِکھ، جاٹ اور اچھُوت ذات کے لوگ بھی تھے۔ کئی ایک مشہور اصحاب 80 سال ہوئے

جماعت میں شامل ہو چکے تھے مثلاً گولک ناتھ، اُپل، رلارام، وارث الدّین، رحمت مسیح واعظ، احسان اللّٰہ، مولوی عماد الدّین، حمید الدین سالک، امام الدین شہباز، داؤد سنگھ، کھڑک سنگھ، میاں صادق، احمد شاہ گیلانی، نیل کنٹھ گورے شاستری، امام شاہ، رجب علی، علی بخش، یعقوب مسیح، ملائم الدین، ڈاکٹر ہنری مارٹن کلارک، عبد اللّٰہ آتھم، مولوی صفدر علی، پروفیسر رام چندر، لالہ چندو لال، بابو رلیا رام، لالہ مایا داس، ڈاکٹر میاں بخش، فضل، جان علی، شیر سنگھ باجوہ، مہاراجا دلیپ سنگھ، راجا سر ہر نام سنگھ، مضبوط تاجپور شام سنگھ جیسے اصحاب 80 سال ہوئے جماعتوں میں شامل ہو چکے تھے۔ اب اچھوت ذات کے لوگ جوق در جوق جماعتوں میں شامل ہو رہے تھے۔

اچھوت لوگوں کو تعلیم دینے کا چیلنج

عام طور پر یہ کہنا دُرست ہو گا کہ اُنّیسویں صدی میں اے۔ پی مشن اور چرچ مشن کے مُبلّغین نے تبلیغ کا کام اہلِ اسلام اور اہلِ ہنود کی اونچی ذاتوں میں محدود رکھا۔ اِن کے مقابلے میں یُو۔پی مشن اور سالویشن آرمی نے اچھوت ذات کے لوگوں میں اِس جوش سے کام کیا کہ سیالکوٹ کے ضلع میں نچلے طبقے سے کئی ہزار لوگ مسیح کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ اِس میں خاص کر یُو۔پی مشن کے مُبلّغین سبقت لے گئے تھے۔ اُن میں سے بعض ایسے جوشیلے تھے کہ وہ چرچ مشن کے شہروں، قصبوں اور گاؤں میں بھی جا کر نیچ ذات کے لوگوں کو بپتسمہ دے آئے۔ نتیجے میں دونوں مشنوں کے درمیان اَن بن پیدا ہو گئی۔ 1889ء میں بیٹ من نے خوب شکایت کی تو یُو۔پی والوں نے آخر میں اُس کے علاقے کو چھوڑ دیا۔ وہ لکھتا ہے،

اُنہوں نے اچھا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن اِس فیصلے نے تقریباً دو ہزار روحوں کا بوجھ میرے کم زور کندھوں پر لاد دیا ہے۔ کیا مَیں اِن دو ہزار بھائیوں کو شخصی طور پر اِتنا بھی جان سکوں گا کہ دوبارہ اُن کے چہروں کو پہچان سکوں؟

جب بیٹ من اور اُس کے ساتھی نے اُن میں کام کرنا شروع کیا تو اُنہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ 1892ء میں وہ سالانہ رپورٹ میں لکھتا ہے،

ہم نے مجبور ہو کر اُن میں سے 55 لوگوں کو خارج کر دیا ہے، کیونکہ جب سے ہم نے اُنہیں یُو۔پی مشن سے لیا ہے وہ نہ تو عبادتوں میں آتے ہیں اور نہ بُت پرستی کو ترک کرتے ہیں۔ وہ مسیحی دین کو سمجھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ ہم نے اُن سے تحمّل، صبر اور بُرد باری سے کام لیا ہے اور ہر گاؤں میں اُن کی تعلیم کا بندوبست بھی کیا ہے۔ اُنہیں فرداً فرداً بڑا سمجھایا ہے، لیکن وہ اِس طرف رُخ بھی نہیں کرتے۔

لاچار ہو کر ہم نے اُنہیں چار سالوں کے بعد صاف کہہ دیا ہے کہ جب تم مسیح سے کوئی واسطہ رکھنا نہیں چاہتے تو تم کو

مسیح کی جماعت میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جب ہم نے اُنہیں قبول کیا تو ہمیں معلوم ہوا کہ اُن میں سے پانچ فی صد بھی عیسائی تعلیم کے ابتدائی اصولوں سے واقف نہ تھے۔ جب ہم اُن سے پوچھتے ہیں کہ تم مسیحی کیوں ہوئے تھے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم "مُکتی کے واسطے" عیسائی ہوئے تھے۔ جب اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ مُکتی کا کیا مطلب ہے تو اُن سے کوئی جواب بن نہیں آتا۔ گاؤں کے گاؤں ایسے ہیں جن میں اِس قسم کے مسیحی رہتے ہیں جنہوں نے کبھی عبادت میں مسیح کے آگے گھُٹنے بھی نہیں ٹیکے بلکہ وہ کتابِ مقدّس کے نام سے بھی آشنا نہیں۔ جب ہم نے اُنہیں لیا اور اُن کے گاؤں میں جا کر کہنے لگے کہ آؤ عبادت کے لئے جمع ہو تو وہ آگ بگولے ہو گئے گویا ہم اُن پر کوئی نیا بوجھ لاد رہے ہیں۔ پہلے پہلے ہم نے اُنہیں تعلیم دینے کے لئے اُن آدمیوں سے مدد لی جو یُو۔پی مشن سے اِس کام کے لئے تنخواہ پاتے تھے۔ لیکن ہمیں مجبوراً ہر تنخواہ دار ملازم کو علیحدہ کرنا پڑا ہے، کیونکہ وہ خود مسیحی

دین کے اصولوں سے ناواقف تھے اور مشن والوں کی رضامندی اور اپنی بڑائی کی خاطر یہ کام کرتے تھے۔

مجھے پکّا یقین ہے کہ ایسے لوگوں کو جو مسیحی دین کی الف بے سے ناواقف ہوں پتسمہ دینا کسی حالت میں بھی جائز نہیں۔ یہ نہ صرف اُن کے حق میں بُرا ہے بلکہ اُن کے اردگرد کے رہنے والے بُت پرست ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے لئے بھی ٹھوکر کا باعث ہے۔ اِس سے ہزار درجہ یہ بہتر ہوتا کہ ایسے اشخاص کو پتسمہ دینے کی بجائے ہم اپنے وقت اور کوششوں کو دیگر اُمور میں صَرف کرتے۔ ممکن ہے کہ کوئی اعتراض کرے کہ مجھے صرف چار سالوں کا تجربہ ہے۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ مجھے ایسے لوگوں کا چار سال سے نہیں بلکہ بیس سالوں کا تجربہ ہے جو ہر سال بڑھتا جا رہا ہے۔ یُو۔پی والوں نے اُن میں چودہ سال پہلے کام کیا تھا۔ اور اب چار سال کے بعد جب مَیں نے اُس کے ایک سربراہ سے عیسائی دین کے بارے میں پوچھا تو اُس نے جواب دیا، "ہمارا ایمان قائم نہیں ہے۔" جب مَیں نے پوچھا کہ تمہارے ایمان کو کس چیز

نے ڈگمگا دیا ہے تو اُس نے جواب دیا، ''مَیں کبھی ایمان ہی نہیں لایا تھا۔ مجھے مایا صاحب نے ڈاکٹر مارٹن کے خیمے میں دھکیل دیا تھا۔ میرے ساتھ چار اَور آدمی دھکیل دیئے گئے تھے اور بس۔''

مَیں نے پوچھا، ''کیا تمہارا بپتسمہ نہیں ہوا تھا ؟''

اُس نے جواب دیا، ''ہاں۔ مجھ پر اور دو اَور آدمیوں پر پانی چھڑکا گیا تھا، لیکن باقی دو پر ایک قطرہ بھی نہ پڑا تھا۔''

یہ کسی ایک آدمی یا جگہ کا حال نہیں بلکہ ہر شخص اور ہر جگہ کے بارے میں میری یہی شکایت ہے۔

نچلے طبقے سے جو لوگ مسیح کی جماعت میں شامل ہوئے تھے اُن کی مالی، اقتصادی، تعلیمی اور سماجی حالت یوں تھی کہ اِس کا نہ کہنا بہتر ہے۔ کہنے کو تو وہ کاشت کار تھے، لیکن زمین کے ایک چپّے کے مالک بھی نہ تھے۔ وہ گاؤں کے کسانوں اور کاشت کاروں کے درحقیقت غلام تھے جن کی نگاہیں ہر وقت اُن کے مالکوں کے اشارے کی طرف لگی

رہتی تھیں۔ تمام سال کی دن رات کی محنت کے بعد اُن کی کمائی مشکل سے فی شخص بیس پچّیس روپئے سالانہ ہوتی تھی۔ نتیجے میں وہ ہمیشہ مقروض رہتے تھے، اور اُن کی سال بھر کی کمائی اصل اور سود کے ادا کرنے میں ہی ختم ہو جاتی تھی۔ اُن کے لڑکے لڑکیاں اُن کی دن بھر کی محنت و مشقّت میں مدد دیتے تھے جس وجہ سے وہ سکولوں میں جو مشن نے اُن کے لئے جا بہ جا کھول رکھے تھے نہیں جا سکتے تھے۔ کیا عجب کہ اُن میں مشکل سے کوئی لکھا پڑھا ملتا تھا۔ گاؤں کا ہر چھوٹا بڑا اُن سے بیگار کا کام لیتا تھا۔ جب پولیس تھانے کا کوئی آدمی یا عدالت کا چپڑاسی گاؤں میں آتا تو اُن بے چاروں کی آفت آ جاتی تھی۔ اِن اُمور سے ہم اُن کی سماجی حالت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ عموماً وہ مسیح کی جماعت میں اِسی مقصد کے تحت شامل ہوتے تھے کہ بیگار سے چُھٹکارا پائیں اور گاؤں کے جاٹوں، پولیس کے ظُلم اور نمبردار یا ذیل دار کے

ناجائز دباؤ سے پردیسی مُبلّغین کے رُعب سے کام لے کر رہائی پا سکیں۔ وہ بالاشاہ کو سجدہ کرتے تھے۔ ہندوؤں کے گاؤں میں ہندوؤں کی طرح اور مسلمانوں کے گاؤں میں مسلمانوں کی طرح رہتے تھے۔ توہم پرستی، تعویذ، جادو، ٹوٹکا وغیرہ اُن کی مذہبی اور سماجی رسوم کے جُز تھے۔ لہٰذا جب بیٹ من اور اُس کے ساتھی اُنہیں مسیحی طریقِ عبادت کی جانب دعوت دیتے اور مسیحی دین کے اُصول کی تلقین پر زور دیتے تو وہ قُدرتی طور پر اِن باتوں کو ناقابلِ برداشت بوجھ سمجھتے تھے۔

جب وائٹ برینخٹ نے 1885ء میں فتح گڑھ چُوڑیاں کے چودہ چُوہڑوں کو پہلے پہل پتسمہ دیا تو سب پر ظاہر ہوا کہ مسیح کی جماعت کو صرف اونچی ذاتوں تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ صرف صاحبِ دولت کو ہی پتسمہ دینا یا صرف صاحبِ علم و عقل کو ہی مسیحی ایمان میں شامل کرنا ایک ایسی ناجائز

بات ہے جو مسیحی ایمان کی عالم گیری کے منافی ہے۔ نچلے طبقہ کے لوگوں کو نجات سے محروم رکھنا بدتر از گناہ ہے، کیونکہ یہ طرزِ عمل مسیحی ایمان کے حقیقی مفہوم کے برعکس ہے۔ 1886ء میں نارووال میں ایک میٹنگ مُنعقد ہوئی جس میں اعلان کیا گیا کہ اگر کوئی جماعت میں شامل ہونا چاہے تو اُس کی ذات کا لحاظ نہ کیا جائے۔ دوسرے لوگوں کی طرح چُوہڑوں کو بھی باقاعدہ تعلیم کے بعد بپتسمہ دیا جائے۔ اِس بات کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا جائے کہ وہ مُردار کھانے اور حرام خوراک سے پرہیز کریں اور اپنے لڑکوں لڑکیوں کے بیاہ غیر مسیحی چُوہڑوں سے نہ کریں۔

5
دبے ہوؤں کی تربیت

ہم نے گزشتہ باب میں پنجاب کی جماعت کی حالت کا ذکر کیا تاکہ اُن اقدام کو سمجھ سکیں جو احسان اللہ نے اِن مُشکلات کو حل کرنے اور جامعتوں کو حقیقی مسیحی معیار پر چلانے کے لئے اختیار کئے۔ جب ہم اِس امر کو پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ اُن جماعتوں کے شرکا خود اپنی اقتصادی، تعلیمی، ذہنی اور روحانی حالت کو سُدھارنے کا خیال ہی نہیں رکھتے تھے تو ہم اُن مسلسل اور اَن تھک کوششوں کا اندازہ کر سکتے ہیں جو احسان اللہ کو اُن کے احساس کو بیدار کرنے اور

اُن کی حالت کو سُدھارنے کے لئے لگاتار کرنی پڑیں۔ کسی نے خوب کہا ہے،

> خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
> نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا۔

اُستادوں کی تربیت

پہلا قدم جو میاں صاحب نے اُٹھایا وہ جماعتوں کے اُستادوں کی تعلیم و تربیّت کا تھا۔ اُن جماعتوں کے اُستاد خود انجیل جلیل کی تعلیم سے ناواقف اور مشکل سے اُردو اور گورمُکھی حروف پڑھ سکتے تھے۔ چنانچہ اُن کے لئے دو مدرسے کھولے گئے۔ نارووال میں عمر رسیدہ اُستادوں کو بیٹ من تعلیم دینے لگے جبکہ احسان اللہ گیارہ میل پرے رعیّہ میں جوان اُستادوں کو پڑھانے لگے۔ یہ اُستاد خداوند مسیح کی زندگی اور انجیلی واقعات سے صرف تھوڑی بہت علم رکھتے تھے۔

مثلاً ایک "اُستاد" نے جب یہ سوال کیا، "جناب عیسیٰ مسیح، پطرس، اور پنطیُس پیلاطس میں کیا فرق ہے؟" تو جماعت کے بعض "اُستاد" ہنسنے لگے۔ یہ دیکھ کر سوال کرنے والے نے طَیش میں آ کر کہا، "تم مجھ پر ہنستے ہو۔ تم میں سے کس کو انجیل پڑھنی آتی ہے؟ مَیں نے عقیدے کو حِفظ کر لیا ہے، اور اُس میں "عیسیٰ مسیح" اور "پنطیُس پیلاطس" کا ذکر ہے جبکہ مرقس کی انجیل کے شروع میں پطرس کا ذکر ہے۔ اِسی لئے مَیں نے یہ سوال کیا۔ سوال کرنے میں کیا ہرج ہے؟"

اُن ایّام میں رعیّہ تحصیل کا مقام تھا گو وہ ایک گاؤں تھا۔ وہاں احسان اللہ نے جوانوں کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُنہیں اُردو اور گورمکھی حروف پڑھانے شروع کئے اور اناجیل کی آیات، پہاڑی وعظ، پنجابی گیت، دُعائے عام کی صبح و شام کی دُعائیں اور سوال و جواب زبانی حِفظ کرائے۔ اِس جماعت

میں بارہ "اُستاد" تھے جو دن رات چوبیس گھنٹے اُن کی صُحبت سے فیض یاب ہوتے تھے۔

یہ سالانہ جماعت مَوسمِ بہار میں اورمَوسمِ گرما میں تین ماہ کے لئے جمع ہوتی تھی۔ دن دُعا اور عبادت سے شروع ہوتا۔ پھر میاں صاحب تعلیم دیتے جو دوپہر کے بعد بھی جاری رہتی۔ شام کے قریب ہر"اُستاد" کو اردگرد کے گاؤں میں بھیجا جاتا تاکہ وہ گاؤں کی جماعتوں کو وہ تعلیم دیں جو اُنھوں نے خود دن کے دوران سیکھی تھی۔ پہلے سال اُن جوانوں نے تورات کی دوسری کتاب خروج کے پہلے بیس باب اورلوقا کی انجیل کے پہلے دس باب سیکھ لئے اور گیت، زبور، دینی سوال و جواب، خاص آیات اور پنجابی دُعائے عام کی کتاب کی دُعائیں حِفظ کرلیں۔ عمر رسیدہ "اُستاد" آٹھ تھے جن کو نارووال میں مرقس کی انجیل، پنجابی دُعائے عام کی کتاب، مسیحی مسافر اور ہندومت اور اسلام کے بنیادی اصول کی نسبت تعلیم دی گئی۔

دونوں جوش سے پُر اور دل و جان سے شب و روز خداوند کا کام سال بھر کرتے رہے۔

اُن کی نیک کوششوں نے پہلے سال ہی جماعتوں کی زندگی کو تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ بیٹ من لکھتے ہیں،

ہمارا کام اِن دنوں زیادہ تر اچھُوت ذات کے مسیحیوں میں رہا ہے جوتعداد میں تیرہ سَو کے قریب ہیں اور نارووال کے اردگرد کے گاؤں میں بستے ہیں۔ سیالکوٹ کی یُو۔پی مشن نے اِن کو بغیرکسی تعلیم کے بپتسمہ دیا، لیکن وہ مذہب کی طرف رُخ ہی نہیں کرتے، اور اُن کی زندگیاں غیرمسیحی چُوہڑوں سے کسی حالت میں بھی بہتر نہیں ہیں۔ اُن کے مسیحی ہونے سے خدا کی بادشاہت کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ لیکن اِس سال کی تعلیم سے خدا کے فضل نے اُن میں کام کرنا شروع کر دیا ہے، اور اب غیرمسیحی چُوہڑے بھی اقرار کرنے لگے ہیں کہ اُن کی زندگیوں میں نُمایاں فرق نظر آتا ہے۔

ہر گاؤں میں سکول کا انتظام

جماعتوں کی زندگی میں مسیح کی روح پھونکنے کے لئے دوسرا قدم جو بیٹ من اور احسان اللہ نے اُٹھایا وہ یہ تھا کہ اُنہوں نے تقریباً ہر گاؤں میں چھوٹے چھوٹے سکول کھول دیئے جن میں مسیحی اور غیر مسیحی چھوٹے بڑے بچوں کو پڑھانے لگے۔ احسان اللہ لکھتے ہیں،

> ہم نے از حد کوشش کر کے تقریباً تمام مسیحی بچوں کو اُن سکولوں میں داخل کر لیا ہے جہاں اُنہیں مسیحی دین کے اصولوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اب تقریباً سَو لڑکے اور لڑکیاں ہمارے گاؤں کے سکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ بچے سب کے سب یا تو مسیحی والدین کے ہیں اور یا اقراریوں کے بچے ہیں۔

نارووال میں بورڈنگ کا انتظام

اِن کے علاوہ بعض مسیحی لڑکے نارووال کے سکول میں داخل کئے گئے جن کی رہائش کا انتظام "جھنڈا" میں احسان اللہ کی زیرِ نگرانی کیا گیا۔ اِن لڑکوں کی تعلیم و تربیّت کا ہم اِس خط سے اندازہ کر سکتے ہیں جو گہنا مل نے لکھا ہے،

احسان اللہ کی زندگی سے بندہ لڑکپن ہی سے متأثّر ہوتا چلا آیا ہے۔ کیونکہ بندے کو اُنہوں نے ایک گُم نام گاؤں سے نکالا اور نارووال کے مشن سکول اور جھنڈا کے بورڈنگ میں داخل کر دیا تھا۔ بورڈنگ ہاؤس کے سب لڑکے مقامی اُستادوں اور مُنادوں کے ساتھ ہراتوار کے روز انجیل کی مُنادی کے لئے جایا کرتے تھے۔ میاں صاحب بندے کو اپنے پاس رکھتے تھے۔ ایک مقام میں خود انجیل کا پیغام سُناتے اور جب دوسری جگہ جاتے تو کسی لڑکے کو حُکم دیتے کہ بیٹا جو کچھ مَیں نے پچھلی جگہ سُنایا تھا وہی تم اب یہاں سُناؤ۔ لڑکے اُن کے حُکم کے مطابق مُنادی کرتے اور یوں اُن کا حوصلہ بڑھ جاتا۔ سُننے

والوں پر عجیب اثر ہوتا، کیونکہ وہ ایک بچے کی زبان سے خدا کے بھیدوں کی مُنادی سُنتے تھے۔ جب بزرگ بچوں سے انجیل سُنتے تو اُنہیں خود شرم آتی کہ وہ خداوند مسیح کی زندگی کے واقعات سے بےخبر ہیں، اور اُن کے دلوں میں انجیل کو جاننے کا شوق پیدا ہو جاتا تھا۔ جب کبھی وہ کسی میلے میں انجیل کی مُنادی کرنے کو جاتے تو لڑکوں سے بھی مُنادی کرواتے تھے۔ وہ کسی ایک لڑکے کو مُنادی کرنے کا حُکم دیتے تو کوئی آدمی بچے کو اپنے کندھوں پر بٹھا لیتا تاکہ میاں صاحب کا حُکم بجا لائے۔ لوگ حیران ہو کر ہمارے اردگرد جمع ہو جاتے اور نجات کی راہ کا پیغام خاموشی سے لڑکوں کی زبان سے سُنتے تھے۔

سال کے آخر میں احسان اللّٰہ گاؤں کے تمام سکولوں کے بچوں کو، "جھنڈے" کے لڑکوں کو اور تمام اُستادوں کو جمع کیا کرتے تھے۔ اِس بڑے جلسے میں اُستادوں، بڑے لڑکوں، چھوٹے لڑکوں، اور نارووال کے ہندو، مسلمان اور سکھ لڑکوں کو جمع کیا جاتا تھا۔ سب کا فرداً فرداً امتحان لیا جاتا اور چار انعام اُنہیں دیئے جاتے جو اوّل، دوم، سوم یا چہارم نکلتے تھے۔

اِس سلسلے میں مجھے ایک پشاوری لُنگی انعام میں دی گئی۔ ایک اور سال ایک مسلمان لڑکا دوم نکلا، لیکن اُسے عیسائی لڑکے پر ترجیح دی گئی، اور دھنڈورا پٹوایا گیا کہ اوّل انعام اُسے ملے گا۔ کیونکہ وہ ایک مسلمان لڑکا ہے اور مسلمان اُستاد سے پڑھا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک سال مجھ سے یہ سوال کیا گیا، "حضرت داؤد کیا فرماتا ہے؟" مَیں نے جواب دیا، "وہ فرماتا ہے کہ جب مَیں نے خداوند کو پکارا اُس نے میری فریاد سُنی اور میری روح کو ازسرِنَو تازگی بخشی۔"

میاں صاحب کو دن رات یہی ایک دُھن لگی تھی کہ غریب دیہاتی مسیحیوں کے لئے کیا کیا تجویز مفید ہو گی۔ اُن کی محبّت نے سب چھوٹوں بڑوں کے دلوں کو موہ لیا تھا۔ وہ روزانہ روح القدس کی راہنمائی کے طلب گار ہوتے تھے اور تمام دن مسیح خداوند کی فرماں برداری میں صَرف کرتے تھے۔ لوگ اُن کی تعریف کرتے تھے، لیکن وہ ہمیشہ خدا کی تمجید اور بڑائی

کرتے رہتے تھے۔ بزرگ بیٹ من اُن کے ہر کام میں اور ہر تجویز میں ہمیشہ خوشی سے اُن کی مدد کیا کرتے تھے۔

مل کر میلوں میں انجیل کا پرچار

احسان اللہ کو ہمیشہ یہ خیال رہا کہ گاؤں کے عیسائی مقامی میلوں میں خداوند کے نام کا پرچار کیا کریں۔ اُنہیں یہ احساس تھا کہ گاؤں کی جماعتوں میں زندگی نہیں آ سکتی جب تک لوگوں میں تبلیغ کی روح کا دم نہ پھونکا جائے۔ لہٰذا جب کبھی نارووال میں یا کسی گاؤں میں کوئی میلا ہوتا تو وہ تمام کارندوں، مسیحی اُستادوں، جھنڈے کے مسیحی لڑکوں اور گاؤں کے مسیحیوں کو ساتھ لے کر میلے میں جاتے، اُن کے ذریعے انجیل کے حصے اور کتابچے فروخت کرتے یا مُفت تقسیم کرتے تاکہ وہ اپنے احساسِ کمتری پر غالب آ کر بے دھڑک انجیل جلیل کی مُنادی کریں اور لوگوں کو نجات کی بشارت دے کر اپنے ایمان کو بھی مستحکم اور مضبوط کریں۔

اِن میلوں میں وہ بعض اوقات انوکھے طریقے استعمال کرتے جو گاؤں کے غیر مسیحیوں کو کبھی نہ بھولتے اور مسیحیوں کو غیرتِ ایمان کے جوش سے بھر دیتے تھے۔ گہنا مل لکھتے ہیں،

ایک سال نارووال میں جب بیساکھی کا میلا ہوا اور گاؤں کے ہجوم میلے میں بھنگڑا کرنے لگے اور صدائیں بُلند ہونے لگیں تو احسان اللہ نے مختلف گاؤں کے تمام عیسائیوں کو اپنے پاس میلے میں اکٹھا کر کے اُن کے کئی گروہ بنائے اور اُنہیں کتابِ مقدّس کی چند چھوٹی چھوٹی آیات حِفظ کروائیں۔ اُس نے کہا، "تمام میلے میں پھرو۔ ہر گروہ ایک آیت کی بُلند آواز سے صدا لگائے اور اپنے ڈھول بجا کر بھنگڑے کا ناچ کرے۔" جہاں گاؤں کے سکھ شراب پی کر گندی صدائیں لگا کر بھنگڑے کا ناچ ناچتے تھے وہاں اُن ہی گاؤں کے مسیحیوں کے ہجوم کتابِ مقدّس کی آیتوں کی صدائیں لگا کر ڈھول بجاتے بھنگڑا ڈالتے تھے۔ جب شام ہوئی اور میلا ختم ہو گیا تو میاں صاحب کے حُکم کے مطابق سب مسیحی ہجوم جمع ہو کر "جھنڈا" میں آئے جہاں ہر آدمی کو چار چار آنے انعام مل گئے۔ تب وہ خوشی خوشی

کتابِ مقدّس کی کہانیاں دُہراتے اور آیات کو گاتے ہوئے اپنے اپنے گاؤں کو لَوٹ گئے۔

ہدیہ دینے پر زور

احسان اللہ نے شروع ہی سے اِس امر پر زور دیا کہ گاؤں کا ہر مسیحی خدا کے لئے عبادت کے وقت نذرانہ اور ہدیہ لائے۔ اُس زمانے میں مزدور کی روزانہ اُجرت تین آنے سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ پیشِ نظر رکھ کر اُس نے گاؤں کے مسیحیوں کو یہ سبق دیا کہ ہر مرد، عورت اور بچہ ہر اتوار کے روز عبادت کے بعد کم از کم ایک پیسہ خدا کے لئے اپنے ساتھ لائے اور اگر کوئی نقد پیسہ نہ لائے تو آٹا، گیہوں یا مکئی وغیرہ اپنے ساتھ لائے۔ اُنہوں نے اِس طرح اپنی مزدوری یا آمدنی کا دسواں حصہ دینے کی رسم شروع کی۔ کیونکہ مزدور کی ہفتہ وار اُجرت قریباً دس آنہ تھی اور اگر خاندان کے چار ممبر بھی ہوں تو وہ ایک آنہ ہر اتوار یعنی آمدنی کا دسواں حصّہ خدا کے حضور

لاتے تھے۔ لیکن بعض اِس سے زیادہ رقم بھی دیتے تھے۔ چنانچہ 1896ء میں احسان اللہ دُلم گاؤں کے بارے میں جو نارووال سے تقریباً آدھے میل پر واقع ہے لکھتے ہیں،

ایک غریب مزدور نے جو لنگڑا تھا چار آنہ ہدیہ دیا۔ مَیں حیران رہ گیا کہ اِس غُربت کے مارے لنگڑے نے اِتنی بڑی رقم دے دی ہے۔[a]

مفت میں خدمت کرنے پر زور

وہ اِس بات کو گاؤں کے عیسائیوں کے ذہن نشین کیا کرتے تھے کہ وہ دینی کام کو بغیر کسی معاوضے لئے کیا کریں۔ چنانچہ جب اُنہوں نے رعیّہ گاؤں کے اُستادوں کو تین ماہ کے لئے موسمِ بہار اور موسمِ گرما میں اکٹھا کیا اور اُنہیں دینی سبق دیئے وہ اُن سے کُھدوائی وغیرہ کا کام کرواتے تھے۔ اِس کام کی اُجرت سے وہ اپنے پیٹ پالتے اور ساتھ ساتھ ہر شام کو ارد

[a] نارووال کی 1896ء کی رپورٹ

گرد کے گاؤں میں جا کر عیسائیوں کو مسیحی دین کے اصول سکھاتے تھے۔

احسان اللہ نے درجِ بالا اُصولوں پر دیہات کی جماعتوں کی بنیاد رکھی اور اپنی تمام عُمر اِن اُصولوں پر کاربند رہے۔ اُنہوں نے خدا سے دُعا کر کے اِن اُصولوں کو گاؤں کی جماعتوں میں جاری کر کے اپنے ہر رفیقِ کار کو سخت تاکید کی کہ اُن پر عمل پیرا ہوں، کیونکہ اُنہیں خوب معلوم تھا کہ

> خِشتِ اوّل چُوں نہد معمار کج   تا ثُریّا مے رود دیوار کج
> چونکہ معمار نے پہلی اینٹ کو ٹیڑھی لگائی
> اِس لئے دیوار ثُریّا تک ٹیڑھی چلتی جائے گی۔

6
نارووال میں تبلیغ

ڈیکن کا عہدہ

1890ء میں بیٹ من واپس آیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ احسان اللہ نے کام کس خوش اسلوبی سے چلایا ہے تو وہ نہایت محظوظ ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں،

احسان اللہ خالص تبلیغی روح سے بھرپور ہو کر میرے پاس آیا ہے۔ وہ اور اُس کی بیوی دونوں روپئے پیسے کی طرف سے بے نیاز ہیں۔ اُس نے اعلیٰ رُتبہ اور بڑی تنخواہ پر لات ماری ہے اور جماعت میں دن رات کی سخت محنت مشقّت کو اُن

پر ترجیح دی ہے۔ اُس نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ مجھے کیا ملے گا؟ اُس نے بڑی محنت کرکے اپنے آپ کو جماعت کے کام کے لئے تیار کیا ہے۔ اُس نے نہ صرف نارووال میں اپنے عزیز و اقارب کے دلوں کو موہ لیا ہے بلکہ گاؤں کے عیسائی اُس کے لئے مرنے کو تیار ہیں۔ وہ سب کے لئے ایک نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔ خداوند کی قُدرت اُس کے ذریعے ہر جگہ کام کر رہی ہے۔

اپریل 1891ء میں میاں صاحب کو لاہور کے سینٹ جانز کالج میں بھیجا گیا تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ مسیحی دینیات کا مطالعہ کرسکیں۔ شرف اور ہوپر صاحب اُن کے اُستاد تھے۔ اُنہوں نے اِس عرق ریزی کے ساتھ اپنا مطالعہ جاری رکھا اور لاہور کے بازاروں میں مُنادی کی کہ اُن کے ہم جماعتوں میں بھی روحانی جوش پیدا ہوگیا۔ کالج کی عبادت گاہ میں نہایت دل سوزی سے دُعا ہوا کرتی تھی۔ وہ جس جگہ بھی جاتے وہاں کے مسیحی اُن کا جوش دیکھ کر خود جوش میں آجاتے

تھے۔ آخر میں بشپ میتھیُو نے اُنہیں دسمبر 1891ء میں بٹالہ میں ڈیکن کے عُہدے پر مامور کیا۔ اُسی سال کے جون میں خدا نے اُنہیں ایک اور بیٹا عطا کیا جس کا نام نذیر رکھا گیا۔

ڈیکن کے عُہدے پر مامور ہونے کے بعد احسان اللہ کا تقرّر نارووال میں کیا گیا تاکہ وہ بیٹ من صاحب کے ساتھ نارووال میں کام کریں۔ وہ عیدِ میلادِ مسیح سے پہلے واپس پہنچ کر اپنے گھر میں جو "جھنڈا" میں اُنہیں دیا گیا تھا رہنے لگے۔ وہ اپنے نَوزائیدہ بچّے کو لے کر اپنے ماں باپ کے پاس گئے۔ اُن کے والدین اور بھائی بہنیں اور رشتے دار اُنہیں دیکھ کر نہایت خوش ہوئے۔ اُن کے والدین نے چھ ماہ کے بچّے کو اپنی گود میں لیا، قربان کے سر پر ہاتھ رکھا، اپنی بہو کے حق میں دُعائے خیر کی۔

اُسی سال خدا نے شیخ رحمت علی کو بھی ایک بیٹا عطا کیا جس کا نام برکت علی رکھا گیا۔ اِس سے پہلے اُن کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جس کا نام اللہ دِتّی رکھا گیا تھا۔ اب دونوں گھروں میں ہمیشہ چہل پہل رہتی تھی۔ اور دوبارہ مہنّتوں کی گلی میں سے ہوکر جھنڈے کے گھر میں آنا جانا شروع ہوگیا۔

بھائی رحمت علی کو شک آتا ہے

ایک روز کا ذکر ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ احسان اللہ کسی کام کے لئے عبادت گاہ گئے جو محلّہٴ خواجگان میں واقع تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ جب کام ہو چکا تو اُن کے دل میں خیال آیا کہ گھر پاس ہی تو ہے۔ چلو سب کو مل آئیں۔ اُنہوں نے گھر کا کواڑ کھولا۔ سیڑھیوں پر چڑھ کر آواز دی، "بھابھی۔" گھر کے سب بچّے ماں کو "بھابھی" بُلایا کرتے تھے۔

ماں نے اندر سے جواب دیا، "احسان، اندر آجاؤ۔"

وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھے۔ اپنے بھائی رحمت علی کے بچّوں کو گود میں لیا۔ اپنے بزُرگ والد کی بابت پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ دُکان پر چلے گئے ہیں۔ پھر اپنے منجھلے اور چھوٹے بھائیوں کی بابت پوچھا۔ جواب ملا، "رحمت علی اوپر کی منزل میں ہے، اور مُحسن علی باہر اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ پڑھنے گیا ہوا ہے۔"

یہ سن کر وہ اوپر کی منزل اپنے بھائی کو دیکھنے چلے گئے۔ وہاں دیکھتے کیا ہیں کہ رحمت علی سو رہا ہے۔ اُس کے ایک طرف قرآن کُھلا پڑا ہے جبکہ دوسری طرف کتابِ مقدّس پڑی ہے۔ چارپائی کے نیچے قلم دوات اور کاغذ ہیں جس پر کچھ نوٹ لکھے ہیں۔ وہ اُلٹے پاؤں نیچے چلے گئے۔ اُنھوں نے والدہ کو کہا، "بھابھی، رحمت علی کو کہنا کہ آج رات کھانا کھا کر میرے گھر میں آئے۔"

جب وہ رات کو کھانے کے بعد نماز سے فارغ ہو کر آئے تو دونوں بھائی بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ گُفتگو کے دوران

بڑے بھائی نے کہا، ”بھائی جی، آج مَیں آپ کو ملنے کے لئے گھر گیا تھا۔ آپ سو رہے تھے۔ مَیں نے آپ کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا اورچلا آیا۔ لیکن مَیں نے آپ کی چارپائی پر کتابِ مقدّس کُھلی پائی۔ کیا آپ اِن دنوں اِس کا مطالعہ کر رہے ہیں؟“

چھوٹے بھائی نے بات ٹالنی چاہی، لیکن بڑے بھائی کے اصرار پر اُنھوں نے کہا کہ یہ ایک لمبی کہانی ہے، لیکن آپ کے کہنے کے مطابق عرض کئے دیتا ہوں۔ جب آپ عیسائی ہو کر گھر بار چھوڑ کر نارووال سے چلے گئے تو تمام خاندان کا بوجھ میرے سر پر آپڑا جو پہلے آپ نے اُٹھایا ہوا تھا۔ والد مسجد میں زیادہ تر رہتے تھے۔ مُحسن علی 14 سالہ لڑکا سکول میں پڑھتا تھا۔ میری اپنی عُمر17، 18 برس کی تھی۔ گزارہ بڑی مُشکل سے ہو رہا تھا، کیونکہ چھ سات جانیں تھیں، اور مَیں اکیلا کمانے والا تھا۔ چنانچہ جائداد کا کچھ حصّہ گِروی کر کے مَیں نے اِس رقم سے بڑے پیمانے پر کاروبار کرنا شروع کر دیا۔ دن

رات کی محنت مشقّت پر خدا نے برکت دی۔ نَو دس سال کے اندر مَیں اِتنا سنبھل گیا کہ نہ صرف مَیں نے قرضہ اُتار دیا اورجائداد واپس حاصل کر لی بلکہ مَیں اچھا تاجر ہو گیا۔ چمڑے کا کاروبار اچھا چل پڑا۔ مَیں امرتسر مال بھیجنے لگا اور وہاں سے مال خرید کر نارووال میں اچھے منافع پر بیچنے لگا۔ اِس کے علاوہ مَیں کپڑے اورنمک وغیرہ میں بھی تجارت کرنے لگا، اور اب خدا کے فضل سے ہم سب بہت زیادہ خوش حال ہیں۔

جب خدا نے میرے کاروبار میں برکت دی تو میرے دل میں خیال آیا کہ مجھے بھی خدا کی خدمت کرنی چاہیئے، ورنہ یہ احسان فراموشی ہو گا۔ چنانچہ مَیں نے 1887ء میں یہ مصمّم ارادہ کر لیا کہ مَیں عربی زبان سے زیادہ گہری واقفیت حاصل کروں تاکہ قرآن شریف کا صحیح مطلب خود سمجھ سکوں اور اپنی قوم کے لوگوں میں وعظ و نصیحت احسن طور پر کرسکوں۔

حُسنِ اتّفاق سے اُن دنوں میں مولوی حشمت علی صاحب خیر اللہ پوری مُلکِ عراق سے تعلیم حاصل کر کے واپس آ گئے تھے۔ اب وہ نارووال میں ہی رہتے تھے۔ میری طبیعت متجسّس تھی، اور مَیں واعظوں کے حلقے سے وابستگی رکھتا تھا۔ فارسی کی تعلیم سے فارغ اور عربی کی مبادیات سے گزر چکا تھا۔ لیکن یہ تعلیم ایسے گرد و پیش میں ہوئی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چار دیواری میں گِھرا ہوا تھا۔ چنانچہ مَیں نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور اُن سے کہا کہ آپ عربی زبان اور شیعہ مذہب کی باریکیوں کو معلوم کرنے میں میری مدد کریں۔

اُنہوں نے کہا، "تم عربی جانتے ہی ہو۔ تم عربی کا زیادہ علم حاصل کر کے کیا کرو گے؟"

تب مَیں نے اپنا دل کھول کر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ وہ خوش ہو کر کہنے لگے کہ وہ مجھے ضرور پڑھایا کریں گے اور شیعہ مذہب کے دقیق مسائل کی بھی تعلیم دیں گے۔ چنانچہ مَیں

اکثر اُن کی خدمت میں ہی رہنے لگا اور صرف تھوڑا وقت اپنی تجارت میں صَرف کرتا تھا۔ یہ حال تقریباً دو سال تک رہا۔

مولوی حشمت علی صاحب ہماری قوم کو اکثر وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ وہ عموماً یعنی آمدنی کا پانچواں حصّہ دینے پر بہت زور دے کر کہا کرتے تھے کہ پہلے پانچواں حصّہ ادا کر کے اپنے مال کو پاک کرو۔ مَیں اُن کا شاگرد تھا جس کو وہ بہت پیار کرتے تھے، اور ہمارے ہاں اکثر اُن کی دعوت ہوتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جو کچھ مولوی صاحب کہتے ہیں سب دُرست اور صحیح ہے۔ چنانچہ مَیں بھی پانچویں حصّے کے بارے میں سرگرم تھا۔ ایک سال والد نے تقریباً دو سَو روپئے پانچویں حصّے کے طور پر اُنہیں دے دئے۔

کچھ عرصے کے بعد چند عرض دینے والے مولوی صاحب کے پاس آئے جو جسم کے ہٹّے کٹّے مضبوط اور خوب توانا تندُرست معلوم ہوتے تھے۔ وہ خوش پوش اور ذی عزّت

دکھائی دیتے تھے۔ مولوی صاحب نے اُنھیں پانچویں حصّے کے اُن روپوں میں سے جو اُن کے پاس جمع تھے اچھی رقم دے دی۔ وہ لے کر بڑے خوش ہوئے اور چلے گئے۔ اِس کے بعد پھر اِسی قسم کے عرض دینے والے مولوی صاحب کے پاس آتے گئے، اور وہ بھی معقول رقمیں حاصل کر کے چلے جاتے تھے۔ اُن میں سے مَیں نے نہ بیمار دیکھے اور نہ غریب، نہ یتیم، نہ بیوہ اور نہ مُسافر پائے۔ چند مہینوں کے بعد مولوی صاحب نارووال سے خیر اللّٰہ پور چلے گئے اور پھر وہیں زیادہ قیام کرنے لگے۔

یہ صورتِ حال دیکھ دیکھ کر میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے شروع ہو گئے۔ مَیں نے سوچا کہ ہم لوگ دُکان دار ہیں۔ ہماری بال بچّے والے بھی ہیں، محنت و مشقّت کر کے روزی کماتے اور بال بچّوں کو پالتے ہیں۔ پانچویں حصے کا یہ روپیہ ہم سے وصول کیا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کو دیا جاتا ہے جو نہ کوئی کام کرتے ہیں نہ کاج۔ اچھے بھلے، ہٹّے کٹّے، موٹے

تازے جسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب سے معلوم کرنا چاہیئے کہ یہ کہاں تک جائز ہے کہ پانچویں حصّے کا مال جفاکش محنتی لوگوں سے لے کر ایسے لوگوں کو دیا جائے جو نہ محتاج ہیں اور نہ بیمار، نہ یتیم ہیں، نہ مساکین اور نہ بیوائیں ہیں بلکہ ہم سے بہتر پوشاک پہنتے ہیں اور ذی عزّت نظر آتے ہیں۔ اِس سوال پر مَیں نے بہت غور کیا اور قرآن شریف کو بھی اچھی طرح سے پڑھا۔ تب مجھ پر حقیقت کُھلی کہ قرآن شریف کے مطابق لُوٹ کے مال میں سے پانچویں حصّے کا ادا کرنا واجب ہے جبکہ ہمارا مال تو لُوٹ کا مال ہی نہیں ہوتا بلکہ محنت مشقّت کی کمائی کا مال ہوتا ہے۔

مَیں اِس سوال پر کئی دن سوچتا رہا۔ آخر ایک دفعہ جب جمعے کا روز قریب آیا تو مَیں نے والد سے کہا، "یہ سب جائداد، دُکانیں، گھر بار جو ہے، سب آپ کا ہی ہے۔ مَیں بھی آپ کا ہوں۔ مَیں مولوی حشمت علی صاحب سے پانچویں حصّے کے مسئلے کی نسبت بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔"

اُنہوں نے فرمایا، "اچھا ہے، خیر اللہ پور چلے جاؤ، جمعے کی نماز بھی پڑھ آؤ اور اِس مسئلے کو بھی دریافت کر آؤ۔"

اُس روز چچا غلام تقی موضع خان سے آیا ہوا تھا جو خیر اللہ پور کے نزدیک ہے۔ والد نے اُس سے ذکر کیا۔ اُس نے کہا کہ بہتر ہے وہ میرے ساتھ چل پڑے۔ وہاں جمعے کی نماز بھی پڑھ آئے اور اپنے دل کے شکوک کو بھی رفع کر آئے۔ چنانچہ مَیں اُس کے ساتھ چلا گیا۔ رات مَیں نے موضع خان میں بسر کی، اور صبح مَیں اور چچا وہاں سے خیر اللہ پور چلے گئے۔

جب سب لوگ جمعے کی نماز پڑھ کر چلے گئے تب مَیں نے مولوی صاحب سے پانچویں حصّے کے مسئلے کی نسبت سوال کیے۔ اُنہوں نے کہا، "تم خود جانتے ہو کہ خُمس (پانچویں حصّے) کی آیت قرآن میں موجود ہے۔ یہ ایک الٰہی حُکم ہے جس کو ٹالنا گناہِ عظیم ہے۔ یہ آیت دسویں پارے کے شروع میں ہے، اور اِس کی صحیح تفسیر یہی ہے کہ ہر ایک چیز میں سے

پانچواں حصّہ دینا ہر دین دار پر فرض ہے۔ قدیم زمانے سے اب تک اہلِ شیعہ دیتے چلے آئے ہیں۔"

مَیں نے سوال کیا، "جناب، اگر زمانۂ قدیم سے خُمس کا رواج چلا آ رہا ہے تو یہ بتائیں کہ کیا حضرت رسول اللّٰہ صلعم نے کبھی لُوٹ کے مال کے سوا کسی میں سے پانچواں حصّہ لیا تھا ؟"

مولوی صاحب بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے، "ہم اِس سوال کا جواب پھر دیں گے۔

مَیں نے عرض کی، "آپ اپنے وعظ و نصیحت میں پانچویں حصّے پر سالوں سے زور دیتے رہے ہیں۔ مَیں نے صرف دل کی تسلّی کے لئے یہ سوال کئے ہیں۔"

اِس پر وہ بہت ملامت کرنے لگے اور کہنے لگے، "تم اِتنے سالوں سے میرے شاگرد رہے ہو، اور اب تم میرا یقین نہیں کرتے۔ میرا خیال تھا کہ تم بہت اچھے دین دار شخص ہو کر دوسروں کو وعظ و نصیحت کیا کرو گے، لیکن مَیں دیکھتا ہوں

کہ شیطان تمہارے سر پر سوار ہو رہا ہے، اور تم بھی احسان کی طرح کافر ہونے لگے ہو۔" اِس کے بعد وہ طیش میں آ کر کہنے لگے، "تم نہیں جانتے کہ ہم مجتہد ہیں؟ ہمارا قول تمہارے لئے کافی ہونا چاہئے۔ کوئی ضرورت نہیں کہ ہم کتابوں میں سے تلاش کر کے تمہارے سوالوں کا جواب دیں۔ ہم ایسے ہی عراق عرب کی خاک چھان کر آئے ہیں۔ ہم عالِم ہیں اور سادات[a] میں سے ہیں۔ سادات کو اُمّت پر فوقیّت حاصل ہے۔"

مَیں نے پوچھا، "کیا یہ قرآن شریف میں ہے؟"

اُنہوں نے غضب ناک ہو کر کہا، "قرآن مجید میں خدا 23 سپارہ سورہ صافات میں فرماتا ہے،

---

[a] یعنی سیّد کا جمع۔ وہ قوم جو حضرت علی کی اولاد اور حضرت فاطمہ کے بطن سے ہے۔

سَلَمٌ عَلَى اَل يَاسِينَ (130:37)۔

تم عربی جانتے ہو۔ اِس کا ترجمہ کرو۔ مَیں نے عرض کی،
"سلام ہو اولادِ رسول کے اوپر۔"

اِس کے بعد وہ کہنے لگے، "اب جاؤ اور خدا سے اپنے شک اور وسوسۂ شیطانی کے لئے مُعافی کے طلب گار ہو۔ آئندہ جو کلام ہمارے مُنہ سے نکلے اُس پر پکّا یقین رکھو۔"

مَیں یقین کرکے پچچا غلام تقی کے ہم راہ واپس موضع خان آ گیا اور ہفتے کے روز نارووال پہنچا۔

اتوار کے روز مَیں نے کلام اللہ کی تلاوت کی۔ تلاوت کے بعد میرے دل میں خیال آیا کہ سورہ صافات کی آیت کو دیکھوں۔ جب مَیں نے اِس آیت کو نکالا تو وہاں آیت کو اِس طرح لکھا پایا،

> سَلَمٌ عَلَى إِلْ يَاسِينَ

اور الفاظ کے نیچے لکھے ترجمے میں یہ الفاظ تھے، "سلامتی ہو، اُوپر اِلیاس کے۔" بھائی جی، مَیں کیا بتاؤں کہ میرا حال کیا ہوا۔ مَیں سنّاٹے میں آ گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ زمین میرے پاؤں تلے سے نکل گئی ہے اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مولوی صاحب کا مَیں بڑا معتقد تھا، اور میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ وہ جھوٹ بولیں گے اور قرآن پر تُہمت لگائیں گے۔ چنانچہ میرے دل میں خیال آیا کہ ممکن ہے کہ مولوی صاحب کی فرمودہ آیت قرآن مجید کے کسی دوسرے حصّے میں موجود ہو۔ چنانچہ مَیں نے تمام قرآن چھان مارا۔ لیکن تلاش اور جستجو کے باوجود وہ آیت کہیں نہ نکلی۔

بھائی جی، مَیں ہر وقت حیران اور پریشان رہنے لگا۔ مَیں بہت گھبراہٹ میں تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کیا کروں۔ رہ

رہ کر مجھے یہ خیال ستاتا تھا کہ مولوی صاحب نے یہ کیا غضب کیا کہ اپنی بات کو قائم رکھنے کے لئے قرآن تک کو بدل دیا؟ مَیں اُنہیں ہمیشہ راست گُفتار خیال کرتا تھا۔ نہ پیٹ بھر کر کھانا کھاتا اور نہ سو سکتا تھا۔ غم اور رنج سے بھرا رہتا تھا۔ ہر وقت یہی خیال آتا کہ مولوی صاحب نے یہ کیا کِیا؟ اور اگر ایسے عالِم مجتہد اپنی بات کو منوانے کے لئے قرآن شریف کی آیت کو تبدیل کر سکتے ہیں تو دوسروں کی باتوں پر کیا بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ مَیں شہر کے باہر چلا جاتا، کیونکہ آدمیوں کو دیکھ کر مجھے وحشت سی ہو جاتی تھی۔

ایک شام کو مَیں اِن ہی خیالوں میں غرق تھا۔ روٹی کھانے کو جی نہ کرے، لُقمہ اندر کروں تو باہر نکلے۔ مَیں دو چار لُقمے کھا کر چارپائی پر پڑ گیا، لیکن نیند پاس نہ پھٹکتی تھی۔ آدھی رات کے قریب میری آنکھ لگی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ میرے قریب آیا اور مجھے کہنے لگا، "رحمت علی۔ تجھے کیا ہوا

ہے؟ تُو کیوں اِس قدر غم گین اور پریشان حال ہو رہا ہے؟"

تب مَیں نے اُسے اپنی تمام سرگذشت سنائی اور کہا، "میرا مولوی صاحب پر پورا یقین تھا، لیکن اب اُنھوں نے اپنی بات رکھنے کی خاطر قرآن شریف کی آیت کو بدل دیا ہے۔ ہائے، مَیں کیا کروں؟" مَیں بڑے زور سے رونے لگا۔

اُس بزرگ نے بڑے اطمنان اور دل جمعی سے جواب دیا، "تُو پڑھا لکھا آدمی ہے۔ عربی، فارسی اور اردو تُو اچھی طرح جانتا ہے۔ قرآن و حدیث سے تُو واقف ہے۔ تُو کتابوں کو خود کیوں نہیں پڑھتا؟ تُو انسان پر کیوں ایمان رکھتا ہے؟ تم کسی آدمی پر اعتبار نہ کرو۔ خود پڑھو، سوچو، سمجھو اور جو دُرست ہے اُس پر عمل کرو۔"

میری فریاد اور رونے کی آواز سے والدین جاگ پڑے۔ بھابی میرے پلنگ آئی اور کہنے لگی، "رحمت علی۔ کیا ہوا ہے؟ ایسا کیوں کرتے ہو؟"

مَیں بھی اُٹھ بیٹھا اور اپنے آنسو پونچھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سونے چلی گئی اور مَیں پھر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اُس بزرگ کی باتوں پر سوچتا سوچتا سو گیا۔

جب مَیں صبح سویرے اُٹھا تو مَیں نے مصمّم ارادہ کر لیا کہ مَیں اِس بزرگ کی صلاح پر عمل کروں گا۔ خواہ کوئی شخص کچھ کہے مَیں کسی بات کو نہیں مانوں گا جب تک کہ قرآن اور میری عقل اِس کی گواہی نہ دے۔ مَیں نے وُضو کیا اور صبح کی نماز کے بعد دُعا کی کہ اے خدا، تُو ہی ہر بات میں میرا ہادی ہو۔ تیرے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ مَیں نے قرآن کو ازسرِنَو غور و خوض سے پڑھنا شروع کیا۔ سورہ فاتحہ کو ختم کر کے سورہ بقر کو پڑھنا شروع کیا۔ جب مَیں اِس آیت پر آیا،

> وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (4:2)۔
>
> اور جو اُس پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر نازل ہوا اور جو تجھ سے پہلے نازل ہوا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

تو مَیں ٹھٹھک گیا۔ مَیں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ کیا مَیں کتابِ مقدّس پر قرآن کی طرح ایمان رکھتا ہوں؟ مَیں اِس آیت کے آگے نہ پڑھ سکا۔ یہ آیت مَیں نے بیسیوں مرتبہ پڑھی تھی لیکن میرے دل میں اِس قسم کا خیال پہلے کبھی نہ آیا تھا، کیونکہ عالموں سے یہی سُنا کرتا تھا کہ مروّجہ کتابِ مقدّس خدا کا کلام نہیں ہے۔ چنانچہ میرا بھی یہی خیال تھا کہ یہ کتابِ مقدّس آدمیوں کی بنائی ہوئی ہے اور اِس قابل نہیں رہی کہ اِس پر ایمان لایا جائے۔ لیکن اب تو مَیں نے دل میں ٹھان رکھا تھا کہ مَیں کسی عالِم اور مولوی کی بات نہیں مانوں گا اور صرف قرآن اور عقل کی باتوں پر ہی چلوں گا، سب کچھ خود پڑھوں گا، سب باتوں پر خود سوچوں گا، خدا سے مدد پا کر سمجھنے کی کوشش کروں گا اور صرف راستی پر عمل کروں گا۔ کیونکہ شیخ سعدی نے کہا ہے ؎

> راستی مُوجبِ رضائے خداست
> کس ندیدم کہ گُم شُد از رہِ راست۔
> راستی خدا کی رضامندی کا سبب ہے
> مَیں نے کسی کو بھی نہیں دیکھا جو راہِ راست پر چلتے ہوئے گُم ہو گیا ہے۔

اِس آیت کو پڑھ کر میرے دل میں سخت کشمکش شروع ہو گئی۔ پرانے خیالات میں اور نئے خیال میں سخت لڑائی شروع ہو گئی۔ مَیں نے اپنے آپ کو بہت ملامت کی اور کہا، "جس کتاب کو تُو آدمیوں کا کلام خیال کرتا ہے اُسے قرآن شریف خدا کا کلام فرماتا ہے۔" چنانچہ مَیں نے اُس گھڑی مان لیا کہ جیسا مَیں قرآن شریف پر ایمان رکھتا ہوں ویسا ہی کتابِ مقدّس پر ایمان رکھوں گا۔ اور جیسا مَیں قرآن کی تلاوت روزانہ کرتا ہوں اُس کی بھی تلاوت روزانہ کروں گا۔ مَیں دونوں کتابوں کا نہایت غور و خوض سے مطالعہ کروں گا۔

بھائی جی۔ آپ یہاں نہیں تھے کہ مَیں آپ سے مدد مانگتا۔ اگر آپ یہاں ہوتے تو مجھے اِس قدر پریشانی کا سامنا کرنا نہ پڑتا۔ اور آپ میری راہنمائی بھی کر سکتے تھے۔

خیر، مَیں نے قرآن مجید کو وہیں بند کر دیا اور اُسی روز کتابِ مقدّس کی ایک جِلد خرید کر دونوں کو پڑھنا شروع کر دیا۔ جوں جوں مَیں دونوں کا مطالعہ کرتا گیا مجھ پر یہ ظاہر ہوتا گیا کہ کتابِ مقدّس کے بہت سے مقامات اور قِصّے قرآن میں پائے جاتے ہیں اور قرآن کی آیات کو سمجھنے میں تفسیروں سے زیادہ مدد دیتے ہیں۔ لیکن مجھے دونوں کتابوں میں اختلافات بھی نظر آنے لگے۔ اب مَیں نے دو موٹی کاپیاں بنائیں۔ ایک قرآن مجید کے لئے اور دوسری کتابِ مقدّس کے لئے بنائی۔ جن آیتوں اور مقاموں کا آپس میں میل نہیں ہوتا وہ مَیں نے اُن کاپیوں میں درج کرنی شروع کر دی ہیں۔ جب آپ آج دو پہر کو گھر آئے تھے تو مَیں دونوں کتابوں کو پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔ اب مَیں نے آپ کے سامنے تمام حالات

حرف بہ حرف بیان کر دیئے ہیں۔

بڑا بھائی خاموشی سے چھوٹے بھائی کی باتیں سُنتا رہا۔ جب وہ اپنا قِصّہ سُنا چُکے تو بڑے بھائی کہنے لگے، "بھائی جی۔ مجھے آج آپ سے بڑی شرم آتی ہے۔ مَیں نے عیسائی ہونے کے وقت یہ خیال نہ کیا کہ مَیں گھر بار دُکان وغیرہ کا سارا بوجھ آپ پر لاد رہا ہوں۔ میری وجہ سے جو آپ کو تکلیف پہنچی اُس کے لئے میں معافی کا طلب گار ہوں۔ لیکن اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ طالبِ حق کی راہ میں مُشکلات کا پہاڑ حائل ہوتا ہے، کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب اُسے رشتے داروں کی محبّت اور خدا میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ انجیل میں لکھا ہے کہ تم خدا اور دُنیا دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ مَیں نے خدا کی خدمت اختیار کی، اور مجھے یہ نظر آتا ہے کہ آپ کو بھی خدا حق کی جانب بُلا رہا ہے اور آپ اپنے طریقے سے خدا کی طرف آرہے ہیں۔ خداوند نے فرمایا ہے کہ صراطِ

مستقیم، حق اور زندگی مَیں ہوں۔ چنانچہ حق کی تلاش آپ کو اپنے نجات دہندے کے پاس لاکر رہے گی۔ آپ پنجگانہ نماز میں سورہ الحمد پڑھ کر خدا سے دُعا مانگتے ہیں کہ وہ آپ کو صراطِ مستقیم پر چلائے۔ مَیں ہمیشہ آپ کو اپنی دُعاؤں میں خدا کے حضور پیش کرتا رہوں گا۔ اگر مَیں کسی وقت آپ کے مطالعے میں کام آسکوں تو مجھے بتائیں تاکہ مَیں آپ کی مدد کروں۔ فی الحال آپ یہ چند کتابیں پڑھنے کے لئے لے جائیں۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھے اور چھوٹے بھائی کو میزان الحق اور اثمارِ شیریں وغیرہ کتابیں دے کر کہا، "آپ کو اِن کتابوں کے مطالعے سے فائدہ پہنچے گا۔ یہ باتیں کہ کتابِ مقدّس محرّف ہے اِن مولویوں کی بناوٹی باتیں ہیں۔ ؎

> چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند۔
>
> چونکہ اُنہیں حقیقت نظر نہیں آتی تھی اِس لئے وہ افسانوں کی راہ پر چل کر لُوٹتے تھے۔

قرآن سے ایسی باتوں کی تصدیق نہیں ہوتی۔ مولوی حشمت علی کی چالاکی سے مجھے قرآن کی ایک آیت یاد آگئی کہ یہودی تورات و صحائفِ انبیا کی آیات کو "اُن کی جگہ" سے تبدیل کرکے حضرت محمد کو کچھ کا کچھ بتاتے تھے۔ بس وہ بھی مولوی صاحب کی طرح ہی کرتے ہوں گے۔ لیکن اِس قسم کی باتوں سے نہ قرآن میں تحریف لازم آتی ہے اور نہ کتابِ مقدّس میں تحریف واقع ہو جاتی ہے۔ بھائی جی۔ آپ نے خود تحقیق کرنے کا جو راستہ اختیار کیا ہے وہ بہترین راستہ ہے۔ اگر کسی بات میں میری ضرورت پڑے تو آپ بِلا توقف مجھے بتائیں۔ میری دُعا ہے کہ خدا آپ کو اِس پُرخار راستے میں بے خوف ہو کر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔" رات بہت گزر گئی تھی، چنانچہ دونوں بھائی ایک دوسرے سے رُخصت ہوئے۔

وبائی بیماری کے دوران خدمت

احسان اللہ باقاعدہ نارووال کے بازار میں انجیل کی مُنادی کرتے تھے۔ اِس سلسلے میں وہ اپنے رشتے داروں اور دوستوں کی دُکانوں میں بیٹھ کر اُن سے دینی گُفتگو کیا کرتے تھے۔ بیٹ من لکھتے ہیں،

جب سے 1884ء میں عزیز نصرت اللہ گزر گیا ہے نارووال کا کوئی بیٹا نہ رہا تھا جو اُس کا ہاتھ پکڑتا۔ اب اُس کا بیٹا احسان آ گیا ہے جو اِس قابل ہے کہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے سنبھال لے۔

وہ نارووال کے لکھے پڑھوں میں انجیل کے حصّے فروخت کرتے، کتابچے مُفت تقسیم کرتے اور سب کو نجات کی بشارت سُناتے تھے۔ رات کے وقت وہ مَیجِک لالٹین سے مشن سکول اور دوسری جگہوں میں کتابِ مقدّس کی تصویریں دکھایا کرتے تھے۔

1892ء کے جولائی کے شروع میں محلّۂ خواجگان میں لوگ ہیضے کی وبا کے شکار ہونے لگے۔ بدقسمتی سے یہ دن محرّم کے تھے اورشیعہ مرثیہ خوانی اور عزاداری میں مصروف تھے۔ 7 محرّم اور 10 محرّم کے روز اُنہوں نے جلوس نکالے جس وجہ سے وبا ہر جگہ پھیل گئی۔ مردانہ اور زنانہ ہسپتالوں میں ہیضے کے بیماروں کا علاج اِتنی مسیحی ہم دردی کے ساتھ کیا گیا کہ ہندو، سکھ اورمسلمان سب کے سب متأثّر ہو گئے۔ احسان اللہ لکھتے ہیں،

اِس سال ہیضے سےشہر اور دیہات کے بہت لوگ مر گئے۔ ایسے حالات کا سامنا کرتے وقت انسان محبّت اور ہم دردی کا خواہاں ہوتا ہے، اور وہ شوق سے نجات کا پیغام سُنتا ہے۔ اِس نازک وقت میں مسٹر بیٹ من ہمارے ساتھ تھے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی سے ثابت کر دیا کہ اگر کوئی مسیح کی پیروی کرنا چاہے تو

> ہمارا بھی فرض یہی ہے کہ اپنے بھائیوں کی خاطر اپنی جان دیں۔(1۔یوحنا 16:3)

ہم خدا کا شکر کرتے ہیں کہ اُس نے پنجاب میں مِس ٹکر اور مِس ہیولٹ جیسے پردیسی مُبلّغین بھیجے جو امراضِ متعدّی کے دنوں میں مسیح کی بھیڑوں کے ساتھ رہتے ہوئے ہم کوسبق دیتے ہیں کہ ہم اپنے گلّے کے لئے جان دے دیں۔

وبا کے دنوں میں بیٹ من صاحب دیگر عیسائیوں کے ساتھ غیرمسیحی مریضوں کی جاں فشانی سے خبر گیری کرتے رہے اور اُنہیں خداوند مسیح کی خوش خبری سُناتے رہے جس نے ہزاروں کو اُن کی بیماریوں سے شفا بخشی تھی۔

اِس کے علاوہ میاں صاحب نارووال کے مشن سکول میں بھی ہر جمعرات کے روز درس دیا کرتے تھے۔ یہ درس مختصر لیکن پُر مغز ہوتے تھے۔ چودھری جلال الدین عنبر جو بعد میں مسیحی ہو گئے کہتے ہیں،

مَیں نارووال مِڈل سکول میں پڑھتا تھا۔ ایک روز احسان اللہ نے سکول میں صبح کے وقت سکول شروع ہونے سے پہلے عبادت کے وقت مختصر سا وعظ کیا۔ معلوم نہیں اِس وعظ میں کیا تھا۔ اُنہوں نے عاقبت کا ذکر کیا۔ اِس کا اثر مجھ پر ایسا ہوا کہ میرے آنسو نکل آئے اور میرے دل نے کہا، "کیا اسلام سے میری روح کو کبھی تسلّی نہیں ملے گی، محشر کا خوف میری جان نہیں چھوڑے گا؟ صرف مسیح مجھے بچا سکے گا۔" ے

> مُشکل ہے عُمر مَوت سے ہوتی نہیں تمام
> دَورِ زماں میں آفتِ محشر لگی ہوئی

اُس وقت مَیں نے پکّا ارادہ کر لیا کہ مَیں عیسائی ہو جاؤں گا۔

دیہات میں روحانی تبدیلی

نارووال کے اردگرد کے دیہات میں جب احسان اللہ جاتے تو وہ صرف مسیحیوں کی عبادت کر کے اور اُن سے مُلاقات کر کے واپس نہیں لَوٹ جاتے تھے بلکہ دیہات کے مسلمانوں،

ہندوؤں اور سکھوں سے بھی ملتے تھے۔ وہ خاص کر وہاں کے نمبرداروں، سفید پوشوں اور ذیلداروں سے میل مُلاقات کرتے اور اُنہیں خداوند کی نجات کا پیغام سُناتے تھے۔ عام طور پر یہ لوگ اُن کی باتیں خوشی سے سُنتے اور اُنہیں اپنے گھروں میں لے جاتے تھے جہاں گھنٹوں دینی گُفتگو اور بحث مباحثہ ہوتا رہتا تھا۔

لیکن بعض نمبردار اور ذیلدار مسیحی ایمان کے سخت مخالف تھے۔ خاص کر ایک ذیلدار عیسائی مذہب کا جانی دُشمن تھا۔ وہ اپنے دیہات کے عیسائیوں کو مقدّموں میں پھنسا دیتا، اپنے بَیل اور چوپائے اُن کے کھیتوں میں چھوڑ دیتا اور اُن کی فصلوں کو برباد کر دیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ تو اُس نے یہاں تک دلیری کی کہ ایک خاندان کے کھانے کی ہانڈی میں زہر ڈلوا دیا۔ خوش قسمتی سے اُس کے ہاں اُسی روز بہت مہمان آ گئے اور زہر کی مقدار ہر ایک مہمان کے کھانے میں بَٹ گئی۔

اگرچہ سب بیمار ہو گئے لیکن کوئی مَوت واقع نہ ہوئی۔ اگرچہ سب جانتے تھے کہ یہ کرتُوت کس کا ہے، لیکن کسی کو نام لینے کی جُرأت نہ ہوئی۔ میاں صاحب اُس گاؤں میں اکثر جایا کرتے تھے تاکہ عیسائیوں کے ایمان کو تقویّت ہو۔ مسلمان عبادت کے وقت اُن کے وعظ کو سُن کر بہت متأثّر ہوتے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذیلدار اکثر عبادت کے وقت آنے لگا۔ اُس نے نہ صرف عیسائیوں کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا بلکہ اُنہیں اپنے کھیتوں میں کام کرنے پر مامور کر دیا۔

رعیّہ سے بدّوملّہی کا گاؤں تین چار میل پرے واقع ہے، اور موضع دھرگ بھی اِتنے ہی فاصلے پر ہے۔ اُس سال یعنی 1892ء میں دونوں جگہوں کے ذیلدار المسیح کے پیروکار ہو گئے۔ احسان اللّٰد لکھتے ہیں،

ہمارا خداوند خدا مبارک ہو جس نے اِس سال اِس علاقے پر اپنی نظر کی اور دو ذیلداروں کو اپنی نجات سے شادمان کیا ہے۔ بدّوملّہی کا چودھری نظام الدین چند سالوں سے اسلام اور

عیسائیت کا موازنہ کر رہا تھا۔ اب اُس نے سال کے شروع میں میاں صادق صاحب کے ہاتھوں سے اجنالہ میں بپتسمہ پایا۔ دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا نہایت مشکل ہے، لیکن خدا کے سامنے کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ اُس نے چوہدری پر کرم کی نظر کی اور اپنے گلّے میں شامل کر لیا ہے۔

اُس کے بپتسمے سے ہر جگہ شور و غُل مچ گیا، لیکن بعض حق کی جُستجو بھی کرنے لگے۔ اُن طالبانِ حق میں دھرگ کا ذیلدار چودھری منصب دار خاں بھی تھا۔ دھرگ نارووال سے نو میل کے فاصلے پر واقع ہے، اور اُس کی ذیل میں بیس گاؤں ہیں جن کے لئے وہ ذمے دار ہے۔ چار سال ہوئے مَیں اِس گاؤں میں گیا۔ اُس وقت چودھری منصب دار خاں کے گھر میں ایک مولوی کے ساتھ عیسائی راہِ نجات پر میری بحث ہوئی۔ گھر کا احاطہ مسلمانوں سے بھرا تھا، اور سب بحث کو خاموشی اور غور سے سُن رہے تھے۔ چودھری صاحب دونوں جانبَین سے مُنصف مقرّر ہوئے۔

بحث کے خاتمے پر چودھری صاحب نے مولوی کے خلاف فیصلہ دیا اور کہا کہ طرَفین کی دلیلوں سے یہ ظاہر ہے کہ از رُوئے اسلام گناہ گار کو نجات نہیں مل سکتی۔ کیونکہ خدا کا انصاف اِس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ گناہ گار کو سزا ملے۔ مولوی بہت ناراض ہوا۔

شام پڑ گئی تھی۔ مجھے رعیّہ جانا تھا، اور منصب دار خاں ایک میل تک میرے ساتھ ساتھ اندھیرے میں آیا۔ میرے ساتھ عیسائی نوجوان بھی تھے۔ رُخصت ہونے سے پہلے ہم سب خدا کے حضور اُس سنسان جنگل میں سجدے میں گرے۔ دُعا کے آخر میں مَیں نے "آمین، آمین" کہا، اور ہم ایک دوسرے سے جُدا ہوئے۔

اِس واقعے کے بعد چودھری منصب دار خاں نے اسلام اور عیسائیت کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ عربی سے واقف تھا اور اردو فارسی زبانوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ سعدی اور حافظ کے اشعار اُسے زبانی یاد تھے۔ قرآن اور کتابِ مقدس کے مسائل پر ہمیشہ دھرگ میں گرماگرم بحث ہوتی رہی۔ اُس

نے انجیل کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور قرآن کو گہری نظر سے پڑھا۔ مسلمان اور عیسائی علما نے جو کتابیں مباحثے پر لکھی تھیں وہ بھی اُس کی نظر سے گزریں۔ آخر میں وہ قائل ہو گیا کہ عیسائی ایمان برحق ہے اور صرف مسیح نجات دہندہ ہے۔ لیکن وہ دوسروں کے سامنے اقرار کرنے سے گریز کرتا تھا۔ جب مَیں نے اُسے کہا کہ یہ اقرار سب لوگوں کے سامنے علانیہ کرنا ضروری ہے تو وہ بہت گھبرایا۔ مَیں نے اُسے خداوند کا قول یاد دلایا کہ

> جو بھی لوگوں کے سامنے میرا اقرار کرے اُس کا اقرار مَیں خود بھی اپنے آسمانی باپ کے سامنے کروں گا۔ لیکن جو بھی لوگوں کے سامنے میرا انکار کرے اُس کا مَیں بھی اپنے آسمانی باپ کے سامنے انکار کروں گا۔ یہ مت سمجھو کہ مَیں دُنیا میں صلح سلامتی قائم کرنے آیا ہوں۔ مَیں صلح سلامتی نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ مَیں بیٹے کو اُس کے باپ کے خلاف کھڑا کرنے آیا ہوں، بیٹی کو اُس کی ماں کے خلاف اور بہو کو اُس کی ساس کے

> خلاف۔ انسان کے دشمن اُس کے اپنے گھر والے ہوں گے۔ جو اپنے باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ پیار کرے وہ میرے لائق نہیں۔ جو اپنے بیٹے یا بیٹی کو مجھ سے زیادہ پیار کرے وہ میرے لائق نہیں۔ جو اپنی صلیب اُٹھا کر میرے پیچھے نہ ہو لے وہ میرے لائق نہیں۔ جو بھی اپنی جان کو بچائے وہ اُسے کھو دے گا، لیکن جو اپنی جان کو میری خاطر کھو دے وہ اُسے پائے گا۔ (متی 10:32–39)

میرے بار بار سمجھانے کے بعد اُس نے ایک روز اتوار کی عبادت کے وقت اپنے گاؤں کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور کہا، "میرا اب یہ ایمان ہے کہ صرف مسیح ہی نجات دے سکتا ہے۔" اِس کے بعد اُس نے مجمع میں بڑی خاکساری سے زکائی کی طرح کہا، "بھائیو، مَیں نے جس کسی کا کبھی کچھ بگاڑا ہے یا جس کسی کو کوئی نقصان پہنچایا ہے مَیں اب اُس کی تلافی کرنے کو تیار ہوں۔"

جب منصب دار خاں نے مسیح کا علانیہ اقرار کیا تو اُس پر آفتوں کا پہاڑ ٹُوٹ پڑا۔ وہ ذیلدار تھا، لیکن ہر طرف سے اُس

پر لعنت و ملامت کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اُس کے رشتے دار اُس کے خلاف ہو گئے۔ اُس کا حُقّہ پانی بند کر دیا گیا۔ جو لوگ پہلے اُس کی خوشامد کرتے اور اُس کی جُوتیاں اُٹھاتے تھے وہ اُسے کُھلّم کُھلّی گالیاں نکالنے لگے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر وہ نہایت پریشان ہو گیا۔ مَیں نے اُسے بہت دلاسا دیا اور خداوند کے وعدے یاد دلائے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اُن دنوں میں بدّوملّہی کے چودھری نظام الدین کا بپتسمہ ہو گیا۔ یہ خبر سُن کر وہ رو پڑا اور کہنے لگا، "وائے بر حالِ من (ہائے، میرے حال پر افسوس)۔ میاں صاحب، کاش کہ ہم دونوں اکٹھے خدا کی بادشاہت میں داخل ہوتے۔"

جب چودھری منصب دار نے عاقبت کو دُنیا پر ترجیح دینے کا فیصلہ کر لیا تو اُس نے بپتسمہ پانے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن دِقّت یہ آ پڑی کہ اُس کی تین بیویاں تھیں۔ مَیں نے اُسے کہا کہ آپ کو دو بیویوں کو طلاق دے کر صرف ایک بیوی کے

ساتھ رہنا ہو گا۔[a] بہت تأمّل کے بعد اُس نے یہ بھی منظور کر لیا۔ بیٹ مَن نے اُسے نارووال کی عبادت گاہ میں بپتسمہ دے کر جماعت میں شامل کر لیا۔

جب وہ بپتسمہ پا کر واپس دھرگ گیا تو اُس کے گھر میں چیخ پُکار شروع ہو گئی۔ اُس نے کہا، "مَیں گناہ گار تھا اور اب خدا کے غضب سے بچنے کے لئے مَیں نے اپنے نجات دہندے مسیح کی پناہ لے لی ہے۔" اُس نے اپنی تیسری بیوی کو بھی کہا، "اگر تُو بھی مجھ سے جُدا ہونا چاہے تو خوشی سے چلی جا۔" بیوی کے ماں باپ نے بھی اُسے بہتیرا کہا کہ اب وہ عیسائی ہو گیا ہے۔ تُو اُسے چھوڑ کر ہمارے پاس آ جا۔

لیکن اُس کی بیوی نے کسی کی نہ مانی اور کہا، "وہ میرا مالک ہے۔ اگر وہ عیسائی ہو گیا ہے تو پھر کیا ہوا؟ مَیں اپنے ماں

[a] یہ سلوک کتابِ مقدّس کی روح سے حد سے زیادہ سخت لگتا ہے۔ اگرچہ ایمان دار کو صرف ایک بیوی کی اجازت ہے، تو بھی جو غیر مسیحی المسیح پر ایمان لائے اگر اُس کی ایک سے زائد بیوی ہو تو بہتر یہ ہے کہ وہ تمام بیویوں کے حقوق قائم رکھے۔ (ایڈیٹر)

باپ کو ناراض کرنا نہیں چاہتی، ورنہ مَیں بھی اپنے خاوند کے ساتھ عیسائی ہو جاتی۔"

بپتسمہ پانے کے بعد ذیلدار منصب دار خاں کی زندگی تبدیل ہو گئی۔ اب وہ نہ صرف مسیحی ہونے کا اقرار کرتا تھا بلکہ علانیہ سب کو دعوت دے کر کہتا تھا کہ اگر تم نجات پانا چاہتے ہو تو مسیح کے تابع ہو جاؤ۔ ایک روز وہ اور مَیں دھرگ کی گلیوں میں سے جا رہے تھے۔ وہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا، "میاں صاحب، مَیں جانتا ہوں کہ ایک دن ایسا آئے گا جب یہ سب لوگ خداوند کے پَیرو ہو جائیں گے۔ کاش کہ خدا وہ دن میرے مرنے سے پہلے مجھے دکھا دے۔"

ایک دفعہ بریار میں چودھری صاحب کے ایک نزدیکی رشتے دار کی شادی تھی، اور اُسے بھی دعوت نامہ بھیجا گیا۔ جب گاؤں کے نمبرداروں نے یہ سُنا تو اُنہوں نے اُسے کہلا بھیجا کہ اگر تم یہاں آئے تو ہم تمہاری سخت بے عزّتی کریں گے۔ جب ذیلدار کو یہ پیغام ملا تو اُس خدا کے بندے نے رتّی بھر پروا نہ کی۔ اُس نے گھوڑے کا دانہ، اپنا کھانا، تھالی، گلاس اور حُقّہ

لے کر گھوڑے پر سوار ہوا اور بریارجا پہنچا۔ وہاں جا کر نمبرداروں کو کہنے لگا، "یہ لو، مَیں آ گیا ہوں۔ جو سخت سے سخت بے عزّتی تم کر سکتے ہو کر لو اور کوئی بات باقی نہ چھوڑنا۔ اگر مَیں نے تمہاری کسی گالی کا جواب بھی دیا تو میری زبان جڑ سے نکال پھینکنا۔"

ایک دفعہ اُس کے مزدوروں نے سوچا کہ اب یہ عیسائی ہو گیا ہے۔ چلو، اُس کے احکام کی خلاف ورزی کرو۔ جب چودھری نے اُنہیں کسی کام کے کرنے کو کہا تو اُنہوں نے صاف انکار کر دیا۔ ذیلدار بڑے طیش میں آ گیا۔ اُنہیں جھڑک کر اُن کی مارکُٹائی کی۔ جب مَیں اگلی دفعہ دھرگ گیا اور مجھے اِس بات کا پتا لگا تو مَیں اُس کے پیچھے پڑ گیا اور کہا کہ اب تم عیسائی ہو۔ تم کو نہ طیش میں آنا چاہئے تھا اور نہ اُنہیں بید مارنے تھے۔ واجب یہی ہے کہ اب تم اُن سے اُس ظُلم کے لئے معافی مانگو۔ میرا یہ کہنا تھا کہ اُس نے سب کو بُلا بھیجا اور کہا، "بھائیو۔ مَیں نے گناہ کیا کہ تم کو بید مارے۔ مجھے مُعاف کرو۔ اور اگر تم مجھے مُعاف نہیں کرتے تو آؤ۔ تم میں سے

ہر ایک مجھ سے بدلہ لے اور مجھے اُتنے بید مارے جتنے مَیں
نے اُسے مارے تھے۔"

اِس واقعے سے ہم کو نہ صرف ذیلدار کے مزاج کی تبدیلی کا پتا لگتا ہے بلکہ وہ رسوخ بھی معلوم ہوتا ہے جو احسان اللہ کو حاصل تھا۔ وہ خود حلیم اور منکسر المزاج تھے، لیکن جہاں حق اور باطل کا سوال ہوتا وہاں وہ لوہے کی طرح سخت ہوتے تھے۔ جس بات کو وہ حق سمجھتے اُسے منوا کر دم لیتے تھے۔ لوگ اُن کے اِس قدر مُرید ہو چکے تھے کہ اُن کی بات کو ٹالنا گناہ سمجھتے تھے۔ اُن کی باتوں میں جادو تھا، کیونکہ وہ اپنے نجات دہندے کی قُربت میں زندگی گُزارتے تھے۔ اُن کی زندگی روح القدس کی قوّت اور قُدرت سے معمور تھی۔

ایک اَور دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی گاؤں کے ایک معزّز شخص نے پولیس کے کہنے سُننے میں آ کر کسی کے خلاف حاکمِ ضلع کی عدالت میں جھوٹی گواہی دے دی۔ جب احسان اللہ کو

معلوم ہوا تو وہ اُسی وقت گاؤں میں گئے اور اُسے گھر سے باہر بلایا۔ اُس نے کہا، "آپ اندر چلیں۔"

جواب ملا، "تمہارے گھر کے اندر جانا مجھ پر حرام ہو گیا ہے۔"

وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا، "کیوں جناب، کیا ہوا ہے؟"

اُنہوں نے کہا، "اپنے دل سے پوچھ۔ تُو نے ایک بے گناہ کا خون کر دیا ہے۔ تجھ کو شرم نہیں آتی کہ تُو نے اُس زبان سے جس سے تُو خدا کا نام لیتا ہے جُھوٹ بولا ہے۔"

اُس نے کہا، "اچھا۔ اب جو ہو گیا سو ہو گیا ہے، آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔"

اُنہوں نے فرمایا، "ہرگز نہیں۔ تُو کل ہی سیالکوٹ چل اور حاکمِ ضلع کے سامنے اپنے جھوٹ کا اقرار کر۔"

اُس نے جواب دیا، "میاں صاحب، کیا آپ مجھے قید کروانا چاہتے ہیں؟ مَیں حلف دروغی میں پھنس جاؤں گا، اور

پولیس والے ہمیشہ کے لئے میرے دُشمن ہو جائیں گے۔ اگر مَیں قید ہو گیا تو میری تمام عزّت خاک میں مل جائے گی، اور میرے بچے بُھوکے مریں گے۔"

میاں صاحب نے کہا، "اگر تجھ کو سزا ملی تو یہ تمہارے کرتوت کی واجبی سزا ہو گی۔ کیا اُس بے گناہ کے بچے بُھوکے نہیں مریں گے؟ تجھے خدا کا خوف نہیں؟" میاں صاحب اُس کے گھر کے اندر نہیں گئے جب تک اُس نے توبہ کر کے اُن کے ساتھ سیالکوٹ جا کر حاکمِ ضلع کے سامنے اقرار کرنے کا وعدہ نہ کر لیا۔ اُنھوں نے رات کو وہیں قیام کیا اور اگلی صبح اُسے ساتھ لے کر پچّیس میل پیدل سیالکوٹ گئے۔

حُسنِ اتّفاق سے حاکمِ ضلع مسیحی طبیعت کا انسان تھا۔ اُس نے اُسے بُلا کر کہا، "ہم تم کو عزّت دار سمجھتے تھے اور صرف تمہاری گواہی کی بنا پر اُس بے گناہ شخص کو سزا دینے لگے

تھے۔ ہم احسان اللہ کے احسان مند ہیں کہ اُن کی دلیری نے ہم کو ایک گناہ سے بچا لیا۔ اب ہم تم کو بھی کچھ نہیں کہتے۔ لیکن خبردار، آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔"

غرض خدا نے احسان اللہ کو الیاس نبی اور یوحنّا بپتسمہ دینے والے کی روح عطا کی تھی۔ وہ نڈر ہو کر لوگوں کو اُن کے گناہ جتا کر اُن کے ضمیروں کو جھنجھوڑتے تھے۔ وہ خداوند کی راہیں تیار کرنے کو اُس کے آگے آگے چلتے تھے تاکہ اُس کی اُمّت کو نجات کا علم بخشے جو اُنہیں گناہوں کی مُعافی سے حاصل ہو۔

تعلیم اور صحبت سے شاگردیت

اُن دنوں میں نارووال کے علاقے میں تقریباً 80 گاؤں تھے جن میں تقریباً تیرہ سَو عیسائی رہتے تھے۔ اُن کے تقریباً سب لڑکے مشن کے 24 سکولوں میں پڑھتے تھے۔ غیر مسیحی طلبا کو ملا کر اُن کی تعداد 230 تھی جن کو مسیحی اور غیر مسیحی استاد انجیل

پڑھاتے تھے۔ اُنہیں دینی سوال و جواب بھی سکھایا جاتا تھا۔ اُن میں سے بعض استاد انجیل کی تعلیم کو مانتے بھی تھے۔ چنانچہ ایک سکھ استاد نے کہا، "میرا ایمان مسیح پر ہے، اور مَیں روزانہ انجیل کو پڑھتا ہوں، لیکن مَیں علانیہ اقرار نہیں کرسکتا۔ سب لوگ میرے دُشمن ہو جائیں گے، اور مجھے کنوئیں سے پانی تک نہیں ملے گا۔" احسان اللّٰہ اِن تمام سکولوں کا معائنہ کرتے تھے اور مسیحی اور غیر مسیحی بچوں کی مذہبی تعلیم کا خاص خیال رکھتے تھے۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ میاں صاحب گاؤں کے عیسائیوں کی مذہبی تعلیم پر بہت زور دیتے تھے اور اِس بات پر خاص دھیان دیتے تھے کہ اُن کے لڑکے اور لڑکیاں مسیحی تعلیم میں تربیّت پائیں۔ اُن کے پاس نارووال کے بورڈنگ میں اُس وقت 15 لڑکے تھے جن کو وہ گاؤں کے سکولوں میں سے چُن کر نارووال لائے تھے اور جو عیسائیوں کی آئندہ نسل کی اُمید

تھے۔ خود اُنہوں نے اُن کی دینی پرورش اور مذہبی تعلیم اپنے ہاتھ میں لی۔ وہ جب کبھی کسی گاؤں کو جاتے تھے تو اپنے ہمراہ بڑے لڑکوں کو بھی لے جاتے تھے تاکہ اُن کے دلوں میں جوش پیدا ہو۔ گہنا مَل لکھتے ہیں،

جب احسان اللہ کسی گاؤں میں جاتے تو جو مُنّاد وہاں متعیّن ہوتا اُسے خبر پہنچا دیتے کہ فلاں دن فلاں گاؤں میں اردگرد کے دیہات کے مسیحیوں کو جمع کر لینا۔ ایسے جلسوں کو "اِکٹّھ" کہا کرتے تھے۔ اُن میں وہ "جھنڈا" کے بڑے لڑکوں کو بھی ہفتے سے سوموار تک لے جاتے تھے۔

اُن کے وعظ سادہ لیکن نہایت مؤثّر ہوتے تھے۔ وہ کسی تمثیل کو لے لیتے اور اُس کے ذریعے ایسے سبق عام فہم پنجابی زبان میں دیتے تھے جو لوگوں کے دلوں میں جگہ پا لیتے تھے۔ چونکہ یہ سبق دیہات کی زندگی سے تعلق رکھتے تھے اِس لئے اُن کا سمجھنا، یاد رکھنا اور دوسروں کو سکھانا اَور بھی آسان ہو جاتا تھا۔ اِکٹّھ کے وقت گرمیوں میں لوگوں کو گُڑ کا شربت اور سردیوں میں مکئی یا چنے کے دانے بھون کر اور اُن میں گُڑ ملا کر دیا جاتا

تھا۔ میاں صاحب بھی لوگوں کے ساتھ وہی کھایا پیا کرتے تھے۔ ہم نے اُنہیں گاؤں میں کبھی چائے وغیرہ پیتے نہیں دیکھا۔ جب وہ دیہاتی عیسائیوں کے ساتھ یا لڑکوں کے ساتھ کسی گاؤں میں جاتے تو ہمارے ساتھ پیدل چلتے۔ جب ہم اُنہیں کہتے کہ آپ گھوڑے پر سوار ہو جایا کریں تو وہ فرماتے کہ اگر مَیں گھوڑے پر سوار ہوں اور میرے ہمراہی پیدل چلیں تو یہ میرے لئے شرم کی بات ہو گی۔ جب ہم خدا کے کام پر جاتے ہیں تو ہم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور ساتھی برابر کے انسان ہوتے ہیں۔ وہ دن بھر پیدل میلوں سفر کیا کرتے تھے۔

جب احسان اللہ مُنادوں اور لڑکوں کے ساتھ پیدل سفر کیا کرتے تھے تو راہ میں انجیل کی تعلیم دیتے جایا کرتے تھے۔ یہ گویا اُن کا چلتا پھرتا الہٰیات کی تعلیم کا سکول ہوتا تھا۔ بعض اوقات وہ کتابِ مقدّس کے کسی واقعے پر گُفتگو کرتے، کبھی کتابِ مقدّس میں سے کسی آدمی یا عورت کی خصوصیات پر

بات چیت کرتے، کبھی کوئی مسئلہ سمجھاتے، کبھی ہندو اور سکھ مت کے عقائد کو سمجھاتے، کبھی اسلام اور عیسائی ایمان کے فرق پر روشنی ڈالتے تھے۔

اِس طرح وہ اپنے عیسائیوں کے دل و دماغ کو روشن کر کے اُن پر مسیحی ایمان کی فضیلت ظاہر کرتے تھے اور ساتھ ہی اُنہیں سفر کی تکان بھی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ لوگ بے تأمّل جھجکے بغیر اُن سے سوال کرتے۔ نتیجے میں دوسرے سوال نکل آتے تھے۔ سب نہایت غور سے اُن کا کلام سُنتے اور اُن کا جوش دیکھ کر خود جوش میں آ جاتے تھے۔ اور دوسرے لوگوں سے بے خوف اور جوشیلے ہو کر بات کیا کرتے تھے۔ یوں اُن کا شخصی گُفتگو کا یہ طریقہ نہایت کار آمد ثابت ہوتا تھا۔

احسان اللہ گرمیوں میں عموماً اپنی راتیں گاؤں کے عیسائیوں کے درمیان گزارتے تھے۔ رات کے وقت جب لوگ کھانے سے فارغ ہو جاتے تو سب میاں صاحب کے اردگرد

جمع ہو جاتے تھے۔ عبادت کے بعد دینی مسائل پر گُفتگو شروع ہو جاتی۔ اِس کے بعد مَیجک لالٹین کے ذریعے تصویریں دکھائی جاتیں تاکہ کتابِ مقدّس کے سبق لوگوں کے ذہن نشین ہو جائیں۔ یہ تصویریں پہر رات تک جاری رہتی تھیں۔ صبح سویرے مُرغ کی بانگ پر وہ اُٹھ کھڑے ہوتے اور دُعا میں مشغول ہو جاتے، پھر گاؤں کے عیسائیوں کی عبادت کرواتے۔ اِس کے بعد سب اپنے اپنے کاموں کے لئے چلے جاتے تھے۔ میاں صاحب صبح کے وقت رات کی باسی روٹی مکھن کے ساتھ کھا کر اپنے ساتھیوں اور لڑکوں کے ہمراہ نارووال آجایا کرتے تھے۔

میاں صاحب کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ جھنڈا کے بورڈنگ ہاؤس کے لڑکوں میں سے اُنہیں انجیل کی خدمت کرنے کی ترغیب دیں جو خاص غیرت رکھتے اور جوشیلے تھے۔ گہنا مَل لکھتے ہیں،

جب مَیں سنِ بلوغت کو پہنچا تو اُنہوں نے مجھے زیادہ دُنیاوی تعلیم دینے کے بجائے اپنے ساتھ رکھ لیا تاکہ مَیں اُن سے علمِ الٰہی حاصل کروں۔ مَیں نے اُن کی دن رات کی صحبت سے بہت فیض اُٹھایا۔ اُنہوں نے میری دینی تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مجھے کتابِ مقدّس کی باقاعدہ تعلیم دینے لگے۔ اِس کے علاوہ اُنہوں نے مجھے ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور بُت پرستوں میں انجیل کی تبلیغ کے مختلف طریقے سکھائے۔ اُنہوں نے خود اپنی زندگی کو مسیح کی خاطر وقف کر رکھا تھا، اور اِس طرح مجھے اور میرے ایسے لڑکوں کو گاؤں کے مسیحیوں اور غیر مسیحیوں کے لئے اپنی زندگیوں کو مخصوص کرنے کا سبق سکھایا۔

اِس طرزِ عمل کا یہ نتیجہ ہوا کہ جتنے لڑکے اُن کے ہاتھوں سے نکلے وہ سب کے سب گاؤں میں انجیل کی خدمت کرنے لگے اور گاؤں کی جماعتوں کی استقامت کا باعث ہوئے۔ گھنا مَل کا خط اور نارووال مِشن کی رپورٹیں ظاہر کرتی ہیں کہ احسان اللہ کے کاری گر ہاتھوں نے اُن لڑکوں کی

زندگیوں کو ابتدا ہی سے ایسے سانچے میں ڈھالا کہ اُن کے دلوں میں گاؤں کی جماعتوں میں کام کرنے کا شوق ہو جاتا تھا۔ ابھی جب وہ بچے ہوتے تو گاؤں میں جا جا کر عبادت کے وقت گیت گاتے تھے۔ بازاروں اور میلوں میں اُن کے گیتوں کی آواز سے ہجوم اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔ جب وہ بڑے ہوئے تو خود تعلیم حاصل کر کے اَوروں کو تعلیم دینے لگے۔ جب اُنہوں نے سکول چھوڑا تو وہ انجیل کی خدمت کے لئے جوشیلے جوان تھے جنہوں نے نہایت خلوص دلی سے اپنی زندگیاں خدا کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں۔

اہلیہ کی سکولوں میں خدمت

احسان اللہ کو نہ صرف لڑکوں کی تعلیم کا خیال تھا بلکہ وہ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی دھیان رکھتے تھے۔ اُنہیں یہ احساس تھا کہ آج کی لڑکیاں کل بچوں کی مائیں ہوں گی جن کی گود میں پنجاب کی جماعت کا مستقبل کھیل رہا ہو گا۔ چنانچہ وہ از

حد کوشش کرتے تھے کہ جو سکول مشن نے قائم کئے تھے اُن میں لڑکیاں ضرور داخل کی جائیں۔ اِس کام میں اُن کی اہلیہ اُن کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ وہ خود جوشیلی طبیعت کی خاتون تھیں۔ جب وہ نارووال آئیں تو مسلمان رشتے داروں کے گھروں میں انجیل کا پیغام سُناتیں اور "جھنڈا" کے گھر کے اردگرد کے ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں میں جایا کرتی تھیں۔ اُنہوں نے اِس قدر رسوخ پیدا کر لیا تھا کہ جب اُنہوں نے نارووال میں پہلا لڑکیوں کا سکول کھولا تو غیر مسیحی گھروں کی لڑکیاں اُس میں دھڑا دھڑ داخل ہو گئیں۔ یہ سکول ایک حویلی میں تھا جس کے سامنے وسیع میدان تھا۔ اُن لڑکیوں کو انجیل کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور انجیل کی آیات حِفظ کروائی جاتی تھیں۔ میاں صاحب کی اہلیہ اِس سکول کا انتظام چلاتی تھیں۔

نارووال کی لڑکیوں کے سکول کے علاوہ گاؤں کے سکولوں میں بھی لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ میاں صاحب کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے دو سالوں کے اندر اُن کی تعداد 102 تک

پہنچ گئی تھی۔ لڑکیوں کا ایک اَور سکول نارووال سے چار میل کے فاصلے پر کوٹلی باجوہ میں کھولا گیا۔ میاں صاحب کی اہلیہ اُس سکول کا انتظام بھی چلاتی تھیں۔ نارووال کے سکول میں تو وہ ہر روز جایا کرتی اور اُس کی دیکھ بھال کے علاوہ لڑکیوں کی تمام جماعتوں کو انجیل کے سبق دیا کرتی تھیں۔ کوٹلی باجوہ کے سکول میں وہ ہفتے میں ایک روز جا کر لڑکیوں کو انجیل کا سبق حِفظ کرواتی اور اُن کی ماؤں سے دینی گُفتگو کیا کرتی تھیں۔ بعض اوقات اُن کے بیٹے قربان اور نذیر اُن کے ہمراہ ہوتے تھے۔ تب وہ لڑکیوں کے لئے دل چسپی کا باعث اور اُن کی ماؤں کے لئے حِفظانِ صحت کے جیتے جاگتے سبق ہوتے تھے۔ محترمہ دونوں سکولوں کی لڑکیوں کو کتابِ مقدّس کی آیات حِفظ کرواتیں اور اُنہیں کتابِ مقدّس کی کہانیاں ایسے دل چسپ طریقے سے سُناتیں کہ تمام سکولوں میں خوشی طاری ہو جاتی تھی۔ جب سال کے بعد میلادِ مسیح کا مبارک دن

آتا تو دونوں سکولوں کی لڑکیوں کو انعام دیئے جاتے اور شیرینی بانٹی جاتی جس کو یہ لڑکیاں نہ بُھولتیں۔ اِس کے علاوہ وقتاً فوقتاً نہ صرف نارووال کے سکولوں میں بلکہ دیہات کے تمام سکولوں میں میَجِک لالٹین کے ذریعے تصویریں دکھائی جاتی تھیں جن کو نہ صرف طلبا اور طالبات بلکہ اُن کے ماں باپ، بھائی بہن اور دیگر رشتے دار وغیرہ دیکھنے آتے۔ یوں لوگ نجات کے پیغام سے واقف ہو جاتے تھے۔

نارووال میں نئی عبادت گاہ کی تعمیر

بیٹ من، احسان اللہ اور اُن کے ساتھیوں کی دن رات کی محنت اور متواتر کوششیں پھل لانے لگیں۔ دیہات کی جماعتیں خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر انگڑائیاں لینے لگیں۔ جو لوگ پہلے عبادت کے نام سے کوسوں دُور بھاگتے اور مسیحی احکام اور اُصولِ دین کو سیکھنا ایک ناقابلِ برداشت بوجھ تصوّر کرتے تھے وہ اب نہ صرف عبادتوں میں حاضر ہوتے بلکہ

دوسروں کو بھی اپنے ہمراہ لاتے تھے۔ خصوصاً جب وہ سُنتے تھے کہ احسان اللہ کسی گاؤں میں آرہے ہیں تو وہ میلوں پیدل چل کر آتے، کیونکہ میاں صاحب کی مسیحی طبیعت تھی۔ اُن کے وعظ سادہ ہونے کے علاوہ دل کو کھینچ لیتے تھے، اور اُن کے فِقرے اِس جوش سے اُن کی زبان سے نکلتے تھے کہ وہ دلوں کو پار کرتے تھے۔ اب گاؤں کے عیسائیوں کو عبادت میں حاضر ہونے کی عادت پڑ گئی، بلکہ وہ عیدوں اور تہواروں کے موقعے پر دس دس بارہ بارہ میل پیدل سفر کر کے نارووال کی عبادت گاہ میں عبادت کرنے کے لئے آنے لگے۔

جب بیٹ من نے دیکھا کہ عبادت گاہ اب چھوٹا ہو گیا ہے اور گاؤں کے عیسائی عبادت میں اِس کثرت سے آنے لگے ہیں کہ وہ عبادت گاہ میں سما نہیں سکتے تو اُنہوں نے موجودہ وسیع عبادت گاہ کو تعمیر کرنے کا خیال کیا۔ اِس جگہ کے سامنے برُوس اور فِٹز پَیٹرک نے سڑک کے کنارے پر ایک بِڑ کے درخت کے نیچے نارووال کے باشندوں کو 24 سال

پہلے انجیل جلیل کا جاں فزا پیغام سُنایا تھا۔ یہ مقام نہایت موزوں بھی تھا۔

اتّفاق سے اُن دنوں سیالکوٹ کی ایک پُرانی عبادت گاہ مسمار کی گئی تھی، اور اُس کی چھت کی مشہور نیلی ملتانی ٹائلیں دست یاب ہو گئیں۔ موجودہ عبادت گاہ وسیع پیمانے پر بنائی گئی جو بیٹ من کے ایمان کا شاہد ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ تمام نارووال مسیح کی جماعت میں شامل ہو جائے گا اور نارووال اور اُس کے مضافات کے مسیحی، سب کے سب ہزاروں کی تعداد میں اِس عبادت گاہ میں زمین پر بیٹھ کر خدا کی عبادت کرسکیں گے۔ عبادت گاہ 1892ء میں مکمل ہو گئی ۔

7

پورے پنجاب کی خدمت

ممبئی کی کانفرنس (1893ء)

ہم بتا چکے ہیں کہ جب خدا نے احسان اللہ کو انجیل جلیل کی تبلیغ اور جماعتوں کی خدمت کے لئے بُلایا تو جماعتوں میں چاروں طرف سے لوگ شامل ہو رہے تھے۔ یہ امر شمالی ہندوستان اور پنجاب کے دَورِ جدید کے لئے بالکل نیا تھا۔ ہر طبقے، ذات اور مِلّت کے آدمی اور عورتیں اُس میں آ گئی

تھیں۔ مسیح کی جماعت ایک نئی معجونِ مرکّب[a] تھی جس کے اجزا گزشتہ زمانے میں ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے لیکن اب ایک ہی جماعت کے بدن میں پیَوستہ ہو گئے تھے، اور ایک ہی روح کے وسیلے سے زندہ تھے۔ اُن کے بُلائے جانے کی اُمید بھی ایک ہی تھی، اُن کا ایک ہی ایمان تھا، ایک ہی خداوند، ایک ہی بپتسمہ تھا۔ سب کا خدا اور باپ ایک ہی تھا۔ اُن میں سے ہر ایک پر مسیح کا فضل ہوا تھا۔

خدا نے احسان اللہ کو اپنی خدمت کے لئے بُلایا تاکہ وہ دانا ٹھیکے دار کی طرح مسیح کی بنیاد پر پنجاب کی جماعت کی ایک ایسی عمارت کھڑی کریں جو خداوند کا پاک مقدِس بنتا جائے۔ اِس مقصد کے تحت اُنہوں نے وہ اصول قائم کئے جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ رفتہ رفتہ اُن کا نام نہ صرف پنجاب بلکہ

---

[a] کوئی مرکّب دوا جو کئی دواؤں کو ملا کر آٹے کی طرح گوندھ کر بنائی گئی ہو۔

شمالی ہندوستان کے مختلف کونوں میں سُنائی دینے لگا، اور مسیحی مُبلّغین اُن کے قائم کردہ اصولوں پر عمل کرنے لگے۔

1893ء کے اوائل میں مختلف جماعتوں اور پردیسی مشنوں کی ایک کانفرنس ممبئی میں منعقد ہوئی تاکہ مختلف مسائل پر جو جماعتوں کے درپیش تھے غور کیا جائے اور تمام ہندوستان کے لئے ایک طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ ہندوستان کے ہر صوبے کی جماعت کے سامنے وہی مُشکلات تھیں جو پنجاب کی جماعت کے سامنے تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ پنجاب میں یہ مسائل غالب نظر آنے لگے تھے۔ چنانچہ ہندوستان کے صوبوں کی آنکھیں پنجاب کی جانب لگی ہوئی تھیں تاکہ معلوم کریں کہ پنجابی مسیحی اُنہیں کس طرح حل کرتے ہیں۔ لہٰذہ احسان اللہ کو ممبئی بھیجا گیا تاکہ وہ کانفرنس کو بتائیں کہ خدا نے نارووال کے علاقے میں خصوصاً اور پنجاب میں عموماً کیسے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔

مرزائے قادیانی کے ساتھ مباحثہ

اُسی سال یعنی 1893ء کے مئی اور جون کے مہینوں میں امرتسر میں وہ زبردست تحریری مباحثہ ہوا جس نے قادیانی فرقے کو جڑ اور بنیاد سے ہلا دیا۔ مرزائے قادیانی نے بعض جاہل مسلمانوں کو یہ کہہ کر اپنے جال میں پھانس رکھا تھا کہ خدا نے اُسے تجدیدِ اسلام کے لئے بھیجا ہے اور کہ وہ اللہ سے مامور ہوا ہے کہ مسیحیوں کو شکست دے۔ اُن ایّام میں چاروں طرف سے مسلمان المسیح کے پیروکار ہو رہے تھے۔ مرزائے قادیانی کو اپنی نمود کی بقا کے لئے یہ سوجھی کہ مسلمانوں کی طرف سے عیسائیوں کے ساتھ میدانِ مناظرے میں آئے حالانکہ علمائے اسلام نے متفقہ طور پر اُسے کافر اور خارج از اسلام قرار دے دیا ہوا تھا۔ لیکن مرزائے قادیانی نے عیسائیوں کو چیلنج دے دیا۔ جماعت میں غیور علما کی کمی نہ تھی۔ افغان نومرید ڈاکٹر ہنری مارٹن کلارک نے عیسائیوں کی طرف

سے چیلنج قبول کرلیا اور یہ قرار پایا کہ امرتسر میں اُن کے گھر کے وسیع احاطے میں مرزا غلام احمد قادیانی اور ڈپٹی عبد اللہ آتھم کے درمیان پندرہ روز (از 22 مئی تا 5 جون) تحریری مباحثہ ہو۔

پنجاب بھر کے عیسائی اور مسلمان دُور دُور سے اِس مباحثے کو سُننے کے لئے آئے۔ یہ میدان وسیع تھا، اور لوگ ہزاروں کی تعداد میں مباحثہ سُننے کے لئے چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ ڈاکٹر ہنری مارٹن کلارک عیسائیوں کی طرف سے صدر تھے۔ مباحثے کے دوران جب ڈپٹی عبد اللہ آتھم (جو ضعیف العُمر لیکن جواں ہمّت تھے) بیمار ہو گئے تو ڈاکٹر کلارک نے مرزائے قادیانی سے مباحثہ کیا۔ اُس روز (29 مئی) احسان اللہ پنجاب کے عیسائیوں کی طرف سے صدر مقرر ہوئے۔

یہ مباحثہ کتاب "جنگِ مقدّس" میں محفوظ ہے۔ جب مرزا قادیانی نے دیکھا کہ میدان اُس کے ہاتھ سے جاتا ہے تو

وہ بددُعا کے کمینے ہتھیار پر اُتر آیا۔ اُس نے کہا کہ ڈپٹی عبد اللہ آتھم پندرہ ماہ کے اندر مر جائے گا۔ لیکن خدا نے مرزا کا پول کھول دیا، اور 6 ستمبر کے روز ڈپٹی صاحب کا امرتسر میں جلوس نکالا گیا۔ ہر جگہ مسیحی ایمان کی فتح کے شادیانے بجنے لگے، اورقادیان کو زبردست شکست حاصل ہوئی۔

مُناظرے کے دنوں میں احسان اللہ مسلمان طالبانِ حق کی تلاش میں سرگرم تھے۔ جب مناظرے کا وقت ختم ہو جاتا تو میاں صاحب کے گرد مسلمانوں کا جھمگٹا لگ جاتا اور وہ اُن سے ہر قسم کے سوال کرتے۔ چونکہ میاں صاحب اِس دَور میں سے خود گزر چکے تھے وہ اُن کے مختلف سوالوں کے جواب دینے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اُن کے دل میں اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے ایک تڑپ تھی جو اُنہیں چَین نہ لینے دیتی تھی۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتے تھے کہ جس طرح بھی ہو سکے اُنہیں نجات دہندے کے قدموں میں لائیں۔

اِس مناظرے سے ہم کو معلوم ہو سکتا ہے کہ پنجاب کی جماعتیں احسان اللہ کو کس قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ امرتسر میں مناظرے کے دنوں میں جماعت کے عالم اور صاحبِ وقار موجود تھے، لیکن جس روز ڈاکٹر ہنری مارٹن کلارک نے عبد اللہ آتھم کی جگہ مباحثہ کیا تو اُس نے میاں صاحب کو صدر ہونے کی پیشکش کی۔ قادیانی اُس روز فساد پر تُلے بیٹھے تھے، کیونکہ سب سامعین کو نظر آ رہا تھا کہ مرزائے قادیانی اُلٹے سیدھے جواب دے رہا ہے۔ لیکن میاں صاحب نے ایسی خوش اسلوبی سے صدارت کے فرائض کو سرانجام دیا کہ سب عش عش کرتے رہ گئے۔

پریسٹ کے عُہدے پر تقرر

امرتسر سے واپس آ کر احسان اللہ پہلے کی طرح کام کرنے لگے۔ وہ ہر سال چھ ہفتوں کے لئے گیہوں کی کٹائی کے موسم میں مسیحی استادوں اور جوان منادوں کو رعیّہ میں اکٹھا کرتے

اور اُنہیں تعلیم دے کر اپنی جماعتوں کی دل و جان سے خدمت کرنے کے لئے اُبھارتے رہتے تھے۔ حسبِ معمول "جھنڈا" کے لڑکوں کو ہر ہفتے کی دوپہر کو گاؤں میں لے جاتے، راہ میں اُنہیں کتابِ مقدّس کی تعلیم دیتے اور اُنہیں گاؤں کو زبور اور گیت سکھانے کو فرماتے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ نارووال کے بازار، ہسپتال، سکول وغیرہ میں خداوند کی نجات کا پیغام سُنانے میں مشغول رہتے تھے۔

اُس سال میں خدا نے ایک بیٹی عطا کی جس کا نام روزلی اَین رکھا گیا۔ چونکہ یہ اُن کی اکلوتی بیٹی تھی اُسے وہ بڑا پیار کیا کرتے تھے۔

1895ء میں احسان اللہ کا تقرّر شملہ میں پریسٹ کے عُہدے پر کیا گیا۔ اُس سال کی رپورٹ میں بیٹ من لکھتے ہیں،

احسان اللہ لاہور کے کالج سے واپس نارووال آ گئے ہیں۔ وہاں وہ پریسٹ ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ اب وہ اپنے

خصوصی جوش کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ اُنھوں نے ڈیکن کے فرائض کو اِس خوبی سے پورا کیا ہے کہ مَیں اُس خوشی کو لفظوں میں ادا نہیں کرسکتا جو مجھے یہ خبر پانے پر ہوئی کہ مَیں اُن میں ہوں گا جو اُن کے سر پر ہاتھ رکھیں گے۔ تقرّر کی عبادت کے وقت عبادت گاہ کھچا کھچا بھری ہوئی تھی۔ کیونکہ ہر شخص اُن کے تقرّر کے موقعے پر عبادت میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اگر اہالیانِ شملہ کو یہ علم ہوتا کہ مشہور و معروف احسان اللہ کے ساتھ ایک ایسا شخص بھی پریسٹ کے عُہدے پر مقرّر ہونے والا ہے جس کا وہ مسلمان ہونے کے وقت سخت مخالف تھا تو آدھا شملہ وہاں حاضر ہو جاتا۔ یہ شخص ایچ۔ایف۔ بیوٹل تھا جو کسی زمانے میں نارووال میں انجیل کا مُبلّغ تھا اور جس کا احسان اللہ پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔

جنرل بوتھ کے ہمراہ

اُن ہی ایّام میں ایک واقعہ رونُما ہوا جس نے احسان اللہ کے خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا۔ سالویشن آرمی کے بانی

جنرل وِلیَم بُوتھ نے ہندوستان آ کر پنجاب میں لیکچر دیئے۔ میاں صاحب نے اِن لیکچروں کا ترجمہ کرنے کی پیشکش کی تھی جواُنہوں نے بڑی خوشی سے منظور کر لی تھی۔ چنانچہ شمالی ہند میں اُنہوں نے لیکچر دیئے جن کا ترجمہ میاں صاحب نے کیا۔ جنرل بُوتھ بڑے زبردست مقرّر تھے۔ اُن کی تقریر میں بڑی گرم جوشی تھی، اورمیاں صاحب کے ترجمے سے شُعلے نکلتے تھے۔ اُن تقریروں نے ہر جگہ آگ لگا دی۔ جماعتوں کی نیم گرمی تپش سے تبدیل ہونے لگی۔

اُن ایّام میں انگلینڈ میں سالویشن آرمی کے نظام، ضابطہ، کام کے طریقے بلکہ اُس کے وجود تک کولعن طعن کا نشانہ بنایا جاتا تھا، اور جنرل بُوتھ کو ہر بات میں ملامت کی جاتی تھی۔ سالویشن آرمی کے پَیروکار عام عیسائی جماعت کے نظام کو چھوڑکر فوجی نظام کے مطابق منظّم ہوئے تھے۔ اِس کے علاوہ وہ بپتسمہ اورعشائے ربانی کی رسوم کو ادا نہیں کرتے تھے۔

اِس لئے بعض بشپوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ عیسائی نہیں۔

جب لاہور کے بشپ میتھیو نے سُنا کہ احسان اللہ جنرل بُوتھ کا ہر جگہ ترجمہ کر رہے ہیں تو اُنہوں نے میاں صاحب کو بُلا بھیجا تاکہ اُنہیں سمجھائیں۔ کافی بحث مباحثے کے بعد بشپ نے پوچھا، "کیا تمہارا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ جو تم کر رہے ہو وہ کتابِ مقدّس اور خداوند مسیح کے حکم کے مطابق ہے؟ اور اگر تم یہ نہ کرو تم خدا کے حکم کی نافرمانی کرو گے؟"

احسان اللہ نے جواب دیا، "ہاں، جناب۔"

بشپ نے کہا، "اگر بات یوں ہی ہے تو تم کو میری طرف سے اجازت ہے۔ مَیں نہیں چاہتا کہ تم خدا کے حکم اور اپنے ضمیر کی خلاف ورزی کرو۔ اگرچہ یہ بات چرچ آف انگلینڈ کے آئین اور میری مرضی کے خلاف ہے۔"

اِس کے بعد دونوں نے گھُٹنے ٹیکے۔ بشپ صاحب نے دُعا کی اور اُنہیں برکت دے کر رُخصت کیا۔

اِس واقعے کے بعد احسان اللہ کے دل میں مغربی جماعتوں کے قواعد و آئین کے متعلّق طرح طرح کے سوالات پیدا ہو گئے۔ وہ خیال کرنے لگے کہ کیا یہ درست بات ہے کہ ہندوستان کی جماعتوں کو اِن قواعد و آئین کی زنجیروں میں ایسا جکڑا جائے کہ وہ ٹس سے مس نہ ہوسکیں؟ کیا یہ جائز ہے کہ اُن کے قواعد پر چل کر ہندوستان کی جماعتیں آپس میں اِس طرح بٹ جائیں کہ وہ ایک دوسرے سے غیر ہو جائیں؟ کیا یہ مناسب ہے کہ اُن کے اصول جن کی بنا پر وہ ایک دوسرے کی مخالف ہیں اور جن کا سرے سے ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں مغربی ممالک سے بر آمد کرکے ہندوستان میں در آمد کیئے جائیں تاکہ وہ یہاں کی سرزمین میں پھلیں پھولیں؟ کیا یہ بات خداوندی منشا کے مطابق ہے کہ یہاں کی جماعت یگانگت پانے کی بجائے مختلف فرقوں میں بٹ کر کمزور اور ناتواں ہو جائے ایسا کہ وہ ہندومت، سکھ مذہب اور بُت پرستی کا پختہ مقابلہ نہ کر سکے؟ کیا یہ واجب

اور مناسب ہے کہ ہندوستانی جماعت مغربی ممالک کے مسیحیوں کی روش، پوشاک، مجلسی آداب وغیرہ کو اِس طور پر اپنا لے کہ اُنہیں مسیحی پوشاک، مسیحی آداب معاشرت، مسیحی نام، مسیحی طرزِ رہائش وغیرہ کہا جائے؟ جتنا وہ اِن باتوں پر سوچ بچار کرتے تھے اُتنا ہی وہ اِن سوالات کے جواب نفی میں پاتے تھے۔ اب وہ مغربی ممالک کی جماعتوں کے قواعد وآئین اور اُن کے طور طریقوں سے بیزاری ظاہر کرنے لگے، اور یہ بیزاری ہر سال بڑھتی گئی۔ وہ خَلوت و جلوت میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے تاکہ جماعت کے سمجھ دار ارکان اِسے روکنے کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ وہ پنجاب کی جماعت کو کہتے تھے ؎

> بال بکشاو صفیر از شجرِ طوبےٰ زن
> حیف باشد چوتو مُرغے کہ اسیرِ قفسی
>
> چھوٹے، اپنے پروں کو کھول اور فردوس کے درخت سے اُڑ! اے پرندے، افسوس کیونکہ تُو پنجرے کا قید ہے۔

اب تو بشپ بھی رُکاوٹ کا باعث نہیں تھے۔ چنانچہ احسان اللہ بے کھٹکے جنرل بُوتھ کے ساتھ مختلف شہروں میں گئے اور اُن کی تقریروں کا ترجمہ کرتے رہے۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ جنرل جیسے زبردست واعظ کے وعظوں سے خود متاثر نہ ہوتے۔ گہنا مَل لکھتے ہیں،

جب جنرل بُوتھ امرتسر آئے تو علاقہ جسّڑ کے مسیحیوں کے ہمراہ خاک سار بھی امرتسر پہنچا۔ وہاں مختلف جماعتوں کے بہت لوگ جلسوں میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ جنرل بُوتھ انگریزی میں تقریر کرتے اور بزرگ احسان اللہ اُن کا ترجمہ کرتے تھے۔ ترجمہ کرنے سے پہلے وہ جنرل صاحب کے ساتھ مُدّت تک دُعا کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خدا نے اُنہیں اِس موقعے پر نہایت اعلیٰ طور پر استعمال کیا۔ لیکچر کے دوران ترجمہ کرتے کرتے وہ رونے لگے۔ روح کا نزول اُن پر اِس زور سے ہوا کہ قوی ہیکل اور طاقت ور ہونے کے باوجود وہ سنبھل نہ سکے اور زمین پر گر پڑے۔ اِدھر مترجم کا یہ حال تھا اور اُدھر سامعین کا یہ حال تھا کہ سب چیخیں مار مار کر رو رہے

تھے اور بے اختیار خدا کے حضور اپنے گناہوں کو اقرار کر رہے تھے۔ سب سے پہلے اُن پر ہی روح القدس کی بخشش نازل ہوئی۔

جب جلسہ برخاست ہوا تو ہم رات کو واپس اجنالہ پہنچے۔ میاں صاحب وہاں ہم سے پہلے پہنچے ہوئے تھے۔ وہاں مشن احاطے میں ایک دُعائیہ جلسہ ہوا۔ بُزرگ میاں صاحب نے ایسا پُر جوش وعظ فرمایا کہ وہاں کے عیسائیوں پر بھی وہی حالت طاری ہوگئی جو امرتسر کے جلسے میں ہوئی تھی۔ لوگ اپنے گناہوں کو یاد کرکے دہاڑیں مارکر رونے اور توبہ کرنے لگے۔ آدھی رات گزرنے پر بھی گناہوں کا اقرار اور رونا نہ تھما۔

جب صبح ہوئی تو ہم دُعا کے بعد رعیّہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ لیکن بُزرگ میاں صاحب موضع خلچیاں کی راہ سے رات کو موضع ماچ پہنچ گئے۔ اِس گاؤں کے مسیحی ان پڑھ جاہل تھے۔ لیکن بابو بھانہ منّاد کی زبانی مَیں نے سُنا کہ جب بُزرگ میاں صاحب وعظ کرنے کھڑے ہوئے تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہیں بول رہے بلکہ اُن کی معرفت خدا ہم سے کلام کر

رہا ہے۔ دیہاتی مسیحی اپنے گناہوں کو یاد کرکرکے اُن کا خدا کے سامنے علانیہ اقرار کرتے اور روتے چھاتی پیٹتے تھے۔ خدا نے وہاں کی جماعت میں عجیب طور پر اپنی حضوری ظاہر کی۔ وہاں سے وہ نارووال چلے گئے۔

جنرل بُوتھ کے ساتھ دن رات رہنے اور اُن کی صُحبت سے فیض یاب ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ احسان اللہ اُن کے دل دادہ ہو گئے۔ اُن کی روحانی زندگی نے مختلف درجوں کو دنوں میں طے کر لیا۔ اب اُنہیں اپنے نجات دہندے خدا کی قُربت کی لَو لگی، اور اُن میں روحوں کو خداوند مسیح کے لئے جیتنے کی تڑپ بہت زیادہ ہوگئی۔

سالویشن آرمی کے بعض طریقوں نے اُن کی آنکھیں کھول دیں۔ اُنہوں نے دیکھا کہ سالویشن آرمی کے پردیسی مُبلّغین انگریزیّت کو خیرباد کہہ کر ہندوستانی لباس پہنتے ہیں، ہندوستانی نام رکھ لیتے ہیں، ہندوستانی طرزِ معاشرت کو اختیار کرکے، ہندوستانی ہو کر ہندوستان کو خداوند مسیح کے قدموں

میں لانا چاہتے ہیں۔ اِس بات نے میاں صاحب کے دل کو سالویشن آرمی کی جانب کھینچ لیا۔

یہ سالویشن آرمی کا ابتدائی زمانہ تھا جب اُس کے "افسر" سادہ زندگی بسر کرتے اور ہر بات میں دیسی طریقوں کو اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ "کمشنر" متھیاہ نے بتایا کہ جب وہ چینائی میں سالویشن آرمی میں مسیحی ہو کر شامل ہوئے اور تبلیغ کا کام کرنے لگے تو وہ غیر مسیحی سادھوؤں کی طرح در بہ در بھیک مانگا کرتے تھے۔ احسان اللہ کو یہ طریقہ نہایت پسند آیا، اور بعد میں اُنہوں نے بھی اپنے اور اپنے چیلوں کے لئے یہی طریقہ تجویز کیا۔

سالویشن آرمی کا طریقۂ عبادت بھی اُن کے لئے نرالا تھا۔ اب تک تو وہ عبادت کے وقت صرف چرچ آف انگلینڈ کی دُعائے عام کی کتاب کی دُعائیں ہی پڑھا کرتے تھے جس طرح وہ مسلمان ہونے کے ایّام میں عربی نماز پڑھا کرتے تھے۔ لیکن اب اُنہوں نے دیکھا کہ سالویشن آرمی

کی عبادت میں زبانی دُعائیں کی جاتی ہیں جو دُعا کرنے والوں کے دلوں سے نکلتی ہیں، اور ہر فقرے کے بعد "آمین" اور "ہیلیلویاہ" کے نعرے لگائے جاتے ہیں جن سے عبادت گُزاروں کے دلوں میں جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ کہاں دُعائے عام کی کتاب کے نازک تصوّرات، لطیف محاورات اور بچے تُلے الفاظ اور کہاں اِن جذباتی نعروں کی کشش اور تاثیر! کہاں خادم الدین کے میکانکی خُشک بیان اور لمبے وعظ اور کہاں "افسروں" کی جوش دلانے والی تقریریں! کہاں ظاہر پرستی کی رسوم اور کہاں سادگی اور گداز!

اِن باتوں نے احسان اللہ کے دل کو موہ لیا۔ قِبلہ رحمت مسیح واعظ لکھتے ہیں،

جنرل بُوتھ نے کئی دن امرتسر میں وعظ کیئے۔ احسان اللہ اُن کے مترجم تھے۔ مَیں بھی اور فتح مسیح بھی وہیں تھے۔ جنرل صاحب کے وعظ ونصائح سے متأثّر تو ہم بھی بڑے ہوئے مگر احسان اللہ تو اُن ہی کے ہو رہے اور اُن ہی کے ساتھ چل

دیئے۔ ہندوستان میں جگہ جگہ اُن کے ساتھ پھرتے پھراتے اور اُن کی تقریروں کا ترجمہ کرتے کراتے وہ اُن کے ساتھ لندن چلے گئے۔ کچھ عرصہ انگلینڈ رہ کر اپنے آزادانہ وعظ سُنا کر بہتوں کو خوش اور بہتوں کو ناراض کرکے واپس آ گئے۔

انگلینڈ کے اخباروں میں جنرل بُوتھ اور اُن کے حامیوں پر برابر حملے ہوتے رہتے تھے، اور اُن کے طریقوں پر ہر جگہ نُکتہ چینی کی جاتی تھی جس کا وہ بھی تُرکی بہ تُرکی جواب دیتے تھے۔ جب احسان اللہ لندن پہنچے تو چرچ مشنری سوسائٹی کو پتا چلا کہ ہمارا ایک عزّت دار رُکن جنرل بُوتھ کے ہمراہ انگلینڈ آ گیا ہے اور اب مختلف جگہوں میں تقریریں کرتے ہوئے پھر رہا ہے۔ اِس سے بے شمار لوگ متاثّر ہو رہے ہیں اور سالویشن آرمی اور جنرل کا وقار بڑھتا جا رہا ہے۔ جب یہ معلوم ہوا تو ایک قیامتِ صُغریٰ برپا ہوگئی۔ اتفاق سے اُن دنوں بٹالہ کے عالِم وائٹ بریخٹ رُخصت پر لندن گئے ہوئے تھے۔ سوسائٹی نے اُنہیں بُلا بھیجا اور کہا کہ کسی نہ کسی

طرح احسان اللہ کو سمجھاؤ اور واپس اپنے ساتھ پنجاب لے جاؤ تاکہ یہ بَلا ٹل جائے۔ اِدھر وائٹ بریخٹ نے احسان اللہ کو سمجھانا شروع کیا، اُدھر جماعت کے لوگ دُعا کرنے لگے۔

وائٹ بریخٹ نہایت مردم شناس شخص تھے جن کے احسان اللہ کے ساتھ پرانے تعلّقات تھے۔ وہ اُنہیں اپنے گھر لے گئے جہاں وہ کئی دن اُن کے مہمانِ عزیز رہے۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ میاں صاحب نے نہ تو اپنی جماعت کو خیرباد کہا ہے اور نہ وہ سالویشن آرمی میں بھرتی ہوئے ہیں۔ وائٹ بریخٹ اُن کے رُجحانات اور طبیعت سے خوب واقف تھے۔ اُنہوں نے دلائل و بُرہان سے اُنہیں قائل کر دیا کہ جس چیز کی تلاش میں وہ تھے وہ شے اُنہیں اُن کے موجودہ رویے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

جب احسان اللہ انگلینڈ پہنچے تو اُن کی یہ بڑی خواہش تھی کہ جس طرح وہ جنرل بُوتھ کی صُحبت سے فیض یاب ہوئے ہیں وہ مشہور واعظ چارلس سپرجن کے احباب سے ملاقات کر

کے اُن سے جماعتوں کو بیدار کرنے کے طریقے اور وسیلے معلوم کریں۔ سپرجن ایک نہایت زبردست واعظ تھا جس نے جھنجھوڑے دے دے کر انگلینڈ کے ہر چھوٹے بڑے کو وزیرِ اعظم گلیڈسٹن سے لے کر معمولی مزدور تک کو جگا دیا تھا۔ وہ میاں صاحب کے انگلینڈ جانے سے پہلے فوت ہو گیا تھا، اِس لئے وہ اُس کے بھتیجے ٹامس سپرجن سے ملے جو اُس کا جانشین تھا۔

وہ اُن لوگوں سے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے جو سپرجن کے وعظوں سے متاثّر ہوئے تھے۔ اُنہیں سپرجن کی متعدّد کتابیں بھی حاصل ہوئیں جو زندگی بھر میاں صاحب کو نہایت عزیز رہیں۔ اِن کتابوں میں سپرجن کی سب سے زبردست کتاب خزانۂ داؤد[a] اُن کی محبوب ترین کتاب تھی۔ اِس کے علاوہ تین جلدیں بھی تھیں جن میں اُس کے وعظوں کا انتخاب تھا۔

The Treasury of David[a]

8
بیداری

خدمت کرنے کا نیا ولولہ

> اپنے تمام غلط کام ترک کر کے نیا دل اور نئی روح اپنا لو۔ اے اسرائیلیو، تم کیوں مر جاؤ؟ کیونکہ مَیں کسی کی موت سے خوش نہیں ہوتا۔ چنانچہ توبہ کرو، تب ہی تم زندہ رہو گے۔ یہ رب قادرِ مطلق کا فرمان ہے۔
>
> (حزقی ایل 18:31)

جب احسان اللہ لندن سے واپس پنجاب آئے تو نارووال میں آ کر اپنے فرائض ادا کرنے لگے۔ اب اُن میں

اپنے خداوند کی خدمت کرنے کا نیا ولولہ پیدا ہو گیا تھا جو اُن کے ہر عمل میں ہر لمحہ ظاہر ہوتا تھا۔ اُن کی طبیعت میں پہلے سے زیادہ گرم جوشی تھی۔ اُن کے وعظ آگے سے زیادہ تہلکہ مچا دیتے تھے۔ اُن کی گُفتگو دلوں کو فریفتہ کر لیتی تھی۔ اُن کی ہر بات میں جادو تھا جو نہ صرف نارووال کے قصبے کے مسیحیوں کو بلکہ دیہات کی اَن پڑھ جماعتوں کو اُن کے نجات دہندے کی جانب کھینچتا چلا جاتا تھا۔ اُن کے دلوں کو اُبھارنے والی تقریریں شُعلے تھیں جو چنگاریاں بن کر ہر سُننے والے کے دل میں آگ لگا دیتے تھے۔ ایسا کہ وہ بے اختیار ہو کر خود خداوند کا ایک جوشیلا پیغام بن جاتا تھا۔ عبادت گزار اُن کے وعظ سُن کر تھرّا اُٹھتے، اپنے گناہوں کو یاد کر کے دیوانہ وار روتے اور چیخیں مار کر اُن کا علانیہ اقرار کر کے خدا سے مُعافی مانگتے تھے۔

کہاں نارووال کی پہلی ظاہر پرست، وضع دار اور نفاست پسند عبادتیں جو آب و رنگ سے محروم تھیں اور کہاں اب عبادتوں کی خود فراموشی اور مدہوشی! کہاں پہلے لطیف اور ہر لفظ تولنے والے وعظ جن کا کوئی اثر نہیں تھا اور کہاں اب میاں صاحب کے وعظوں کی بے ساختگی اور بے خودی، اُن کی تقریروں کی گرمی اور تیزی جو یکسر محویّت کا عالَم پَیدا کر دیتی تھی! خدا نے نارووال اور ارد گرد کی عبادتوں کو اِس طور پر استعمال کیا کہ پرانے دُشمن ایک دوسرے سے مُعافی مانگ کر بغل گیر ہو گئے۔ سخت دل گناہ گار اپنے گناہوں سے تائب ہو کر خدا سے نئے دل اور نئی روح کے طالب ہو گئے۔

انگریزیت سے جہاد

اُن دنوں میں احسان اللہ معرفتِ الٰہی اور قُربتِ خداوندی میں روز بہ روز ترقی کرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ خدا سے ہر وقت یہی دُعا کرتے تھے کہ مجھے زیادہ سے زیادہ استعمال

کر! مجھ پر ظاہر کر کہ مَیں کس طرح تیری خدمت بہترین طور پر کرسکوں، کس طرح مسیح کی جماعتوں کو تیرے بدن کے زندہ عُضو بنا سکوں اور کِن طریقوں سے غیر مسیحیوں کو تیرے قدموں میں لا سکوں۔ اُنہوں نے دیکھا کہ جماعتوں میں "انگریزیّت" بڑھتی چلی جا رہی ہے، کہ دُنیا داری اور وضع داری حقیقی دین داری اور عبادت گزاری کی جگہ زبردستی قبضہ کرتی چلی جا رہی ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے یہ مصمّم ارادہ کرلیا کہ انگریزی طرزِ لباس، رہائش اور معاشرت کے خلاف جہاد کروں گا۔ اب سے مَیں خود کُرتہ پاجامہ اور پگڑی پہن کر سادہ ہندوستانی طرز پر زندگی گُزاروں گا۔

اُنہوں نے یہ بھی دیکھا کہ مغرب کی عیسائی سوسائٹیوں کا روپیہ ہندوستان کی ذمے داری کی راہ میں بڑی رُکاوٹ کا باعث بن گیا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے یہ قصد کرلیا کہ جو بھی ہو مَیں چرچ مشنری سوسائٹی سے تنخواہ لینی بند کروں گا۔ وہ

پہلے ہی بہت کم تنخواہ لیتے تھے اور صرف اُتنا لیتے تھے جو اُن کی سادہ گُزران کے لئے کافی تھی۔ لیکن اب اُنہوں نے یہ مصمّم ارادہ کرلیا کہ مَیں یہ بھی نہیں لوں گا۔ مَیں مغرب کے روپئے کی ایک کَوڑی پر بھی انحصار نہیں کروں گا۔ اُن کی اہلیہ محترمہ نے بھی اُن کے ساتھ اتّفاق کرلیا۔ اب وہ مغربی جماعتوں کے روپوں کی غلامی کے خلاف باقاعدہ جہاد کرنے لگے۔

جب اُن کے دیرینہ رُفقا اور پرانے شاگردوں کو معلوم ہوا کہ احسان اللہ کا پکا ارادہ ہے کہ وہ چالیس روپئے کی قلیل تنخواہ بھی چھوڑ دیں گے تاکہ ہندوستانی جماعت خود اپنے خادمانِ دین کو سہارا دے کر اپنی ذمے داری کا احساس کرے تو اُنہوں نے مل کر صلاح مشورہ کیا اور چالیس روپئے ماہوار کو اپنے ذمّے لینے کی پیشکش کی۔ یہ سن کر میاں صاحب نے اپنے خدا کا شُکر کیا جس نے نہ صرف اُنہیں خوراک و پوشاک کی فکر سے آزاد کر دیا بلکہ اُن کے لئے آزادانہ خدمت

کرنے کی وہ راہ بھی کھول دی جس کی طرف کافی دیر سے اُن کا رجحان تھا۔ اب وہ دیہات تک کی جماعتوں اور خادمانِ دین کو اُن کی ذمّے داری کا احساس دلا سکتے تھے تاکہ نہ صرف شہروں اور قصبوں کی جماعتیں بلکہ گاؤں کی جماعتیں بھی اپنے خادمانِ دین کی پرورش کے بوجھ کو اُٹھائیں۔

میاں صاحب کے دل میں دن بہ دن یہ خواہش بڑھتی گئی کہ وہ جماعتوں کو جھنجھوڑے دے کر جگائیں تاکہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرکے رجوع لائیں اور پنجاب میں "رب کے حضور سے تازگی کے دن میسر آئیں۔"[a] اُن کا یہ احساس روز بہ روز بڑھتا جا رہا تھا کہ جس طرح خدا نے حزقی ایل نبی کو بنی اسرائیل کی جانب بھیجا تھا[b] اُسی طرح اُس نے مجھے ہندوستان کی جماعت کی طرف بھیجا ہے۔ خداوند کی آواز بار بار اُن کے کان میں آتی تھی، "مَیں نے تجھے پنجاب کی

---

[a] اعمال 3:20
[b] حزقی ایل 2؛ 3:1-10

جماعت کا نگہبان مقرر کیا ہے۔ اب میرے مُنہ کا کلام سُن اور میری طرف سے اُنہیں آگاہ کر دے۔ مَیں تیرا مُنہ کھولوں گا۔"

> کیا میرا کلام آگ کی مانند نہیں؟ کیا وہ ہتھوڑے کی طرح چٹان کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرتا ؟ (یرمیاہ 23:29)
>
> شیر ببر دہاڑ اُٹھا ہے تو کون ہے جو ڈر نہ جائے؟ رب قادرِ مطلق بول اُٹھا ہے تو کون ہے جو نبوّت نہ کرے؟
>
> (عاموس 3:8)

احسان اللہ نے خدا کی آواز سُنی اور اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ گھُٹنے ٹیک کر خدا کے حضور گڑگڑائے کہ اے خدا، ہم کو تُو وہ راہ دکھا جس پر تُو چاہتا ہے کہ ہم اور ہمارے بچے چلیں۔ دُعا کے بعد اُنہوں نے چرچ مشن کے سیکرٹری رابرٹ کلارک سے امرتسر جا کر مُلاقات کی اور اُس پر سب باتیں واضح کیں۔ کلارک نے کہا، "احسان، اگر خدا تم کو پنجاب کی جماعتوں میں آزادانہ طور پر کام کرنے کے لئے بُلاتا ہے تو مَیں

کون ہوں جو تمہاری راہ میں رُکاوٹیں ڈالوں؟ تم نارووال کو اپنا مقام بنا کر جہاں چاہو اور جس طرح چاہو، خدا کی خدمت کرو اور تبلیغ کا کام سرانجام دو۔ مَیں ہر طرح سے تمہاری مدد کروں گا۔"

میاں صاحب نے واپس نارووال آ کر اپنی رفیقۂ حیات سے بات کی۔ اُنھوں نے کتابِ مقدّس کو کھولا اور اُن کی نظر یرمیاہ 42:5–6 پر پڑی،

> رب ہمارا وفادار اور قابلِ اعتماد گواہ ہے۔ اگر ہم ہر بات پر عمل نہ کریں جو رب آپ کا خدا آپ کی معرفت ہم پر نازل کرے گا تو وہی ہمارے خلاف گواہی دے۔ خواہ اُس کی ہدایت ہمیں اچھی لگے یا بُری، ہم رب اپنے خدا کی سنیں گے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب ہم رب اپنے خدا کی سنیں تب ہی ہماری سلامتی ہو گی۔

تب دونوں میاں بیوی نے یہ فیصلہ کیا کہ میاں صاحب تو نارووال میں قیام کریں اور وہاں سے جہاں اُنہیں خدا بُلائے

جایا کریں جبکہ بیوی بچے بٹالہ میں جا کر رہائش اختیار کریں تاکہ بچے بیرنگ سکول میں پڑھ سکیں۔ میاں صاحب اُنہیں بٹالہ لے گئے اور اسٹیشن کے نزدیک ایک گھر کرائے پر لے دیا جس کے پیچھے باغ بھی تھا۔ بابو سنگھا نے میاں صاحب کے احباب مثلاً ہوشیار پور کے سِول سرجن ڈاکٹر دینا ناتھ پریتُو دِتّا، اجنالہ کے وکیل پنڈت بشن داس بھنوٹ وغیرہ کی مدد سے "پنجاب مشنری سوسائٹی" قائم کی جس کے پہلے مشنری احسان اللہ مقرّر ہوئے۔ اِن احباب نے چالیس روپئے ماہوار جمع کر کے دینے کا ذمّہ اُٹھایا تاکہ میاں صاحب کے خاندان کے اخراجات چل سکیں۔

اب احسان اللہ نے مصمّم ارادہ کرلیا کہ ہندوستانی طریقوں کو اختیار کر کے خدا کی خدمت کریں اور اپنے نجات دہندے کے اچھے نمونے پر چل پڑیں جس نے فرمایا تھا،

> لومڑیاں اپنے بھٹوں میں اور پرندے اپنے گھونسلوں میں آرام کر سکتے ہیں، لیکن ابنِ آدم کے پاس سر رکھ کر آرام کرنے کی کوئی جگہ نہیں۔ (متی 8:20)

یہ سرانجام دینے کے لئے اُنہوں نے فقیرانہ زندگی بسر کرنے کا قصد کر لیا تاکہ سادُھوؤں کی طرح جا بہ جا آزادانہ آ جا سکیں، انجیل جلیل کا پرچار ہر جگہ کر سکیں، جماعتوں کو مستحکم کرتے پھریں اور اُن پر نگہ بان بٹھائیں۔[a]

1896ء میں اُنہوں نے نارووال کی عبادت گاہ میں آخری پبتسمہ دیا۔ اِس کے بعد وہ آزادانہ کام کرنے لگے۔ اب اُن کا علاقہ نارووال چرچ مشن کا علاقہ ہی نہیں بلکہ سارا پنجاب تھا۔ اب اُن کا تعلّق چرچ مشن کی جماعتوں سے ہی نہیں بلکہ تمام مشنوں کی جماعتوں سے تھا جن کو وہ اپنے اُصولوں کے

---

[a] دیکھئے یسعیاہ 21:6–8۔

سانچوں میں ڈھال کر ابدیّت کے ہم کنار کرنے کے لئے خدا کی طرف سے مامور ہوئے تھے۔ ؎

> آج کے جنُوں سے ہیں کل کی حکمتیں روشن
> اِس جگر گدازی میں سوز ہے دوامی بھی۔

یہ سب کچھ نہایت جان جوکھوں کا کام تھا۔ جماعتوں کو صراطِ مُستقیم پر چلانا تھا، اُن کی مُردہ رگوں میں جان ڈالنی تھی، شہری اور دیہاتی مسیحیوں کو اُن کی فرض شناسی اور ذمّے داری کا احساس دلانا تھا، اُنہیں خداوند مسیح کے غیور اور دلاور سپاہی بننے کی ترغیب دلانی تھی، اُنہیں انجیل جلیل کے رضا کار مُبلّغ بنا کر مغربی قیود اور زر کی غلامی سے چھُڑانا تھا۔ احسان اللہ کو اِس بات کا احساس بھی تھا کہ ؎

> شاخِ افسُردہ کو گر ذوقِ نُمو[a] دینا ہے
> اپنی رگ رگ سے صداقت کا لہو دینا ہے۔

---

[a] بڑھنے پھولنے کی قوّت

اُنہوں نے خدا سے دُعا کی کہ مجھے اِس مُشکل کام کے لئے توفیق عطا کر تا کہ مَیں ایسے بھاری بوجھ باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر نہ رکھوں جن کو مَیں خود اپنی اُنگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتا۔[a] اللہ کا نام لے کر پہلے اُنہوں نے اپنے لباس کو بدلا اور فقیری سادھوانہ کپڑے پہن لئے۔ گہنا مَل صاحب لکھتے ہیں،

اپریل 1896ء میں نارووال کے علاقے کے مُنادوں اور اُستادوں کا حسبِ دستور "سمرسکول" رعیّہ میں ہوا۔ مجھے بھی بُلایا گیا۔ مَیں بزرگ احسان اللہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُنہوں نے جوگیا رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جوگیا رنگ کا کُھلے بازوؤں والا کُرتہ اور کُھلا پائجامہ تھا۔ پاؤں میں کوئی جوتا نہ تھا۔ ننگے پاؤں سفر کرتے تھے۔ میری حیرت کو دیکھ کر وہ فرمانے لگے، "بیٹا، خدا ہم سے اب ایک اور قسم کی خدمت لینا چاہتا ہے۔" وہاں مَیں اُن کے ساتھ چند روز رہا۔ اُن دنوں میں

[a] دیکھئے متی 4:23۔

میاں صاحب خداوند کی قُربت میں بہت رہتے تھے اور اپنے وعظ و نصیحت میں اُستادوں اور مُبلّغوں کو اُبھارتے رہتے تھے کہ وہ خلوص نیّت اور سرگرمی سے انجیل کی خدمت کریں۔ اُن کے اپنے نمونے نے سب کو متاثّر رکھا تھا۔ اُن کی ایثار نفسی اور خود انکاری سب کو ملامت کرتی تھی۔ وہ اُنہیں انجیل جلیل اور خداوند کے کلماتِ طیّبات سے اُن کی عقل کے مطابق نکات اور رموز سکھاتے تھے جو زندگی نواز تھے۔ اُن کی دُعائیں اور ہنگامہ آرا تقریروں نے اُن میں حرارت اور تاب پَیدا کر دی۔

جب سمر سکول ختم ہو گیا تو احسان اللّٰد نے اپنا آزادانہ دَورہ شروع کر دیا۔ گہنا مَل لکھتے ہیں،

ہم رعیّہ سے چل پڑے۔ تقریباً بارہ آدمی ہمارے ہمراہ تھے اور میاں صاحب ننگے پاؤں جوگیا کپڑوں میں ملبوس تھے۔ پہلا کوچ رعیّہ سے موضع ڈھوڈہ کی جانب ہوا جہاں پرسبٹیرین مشن میں حمید الدین سالک صاحب کام کرتے تھے۔ ہم سب بھوکے اور پیاسے تھے۔ لیکن گرمی، بھوک اور پیاس کے باوجود

میاں صاحب انجیل کی مُنادی کرنے لگے اور کرتے رہے۔ پھر کھانا کھانے کے بعد دو پہر کے وقت درختوں کے سائے تلے گاؤں کے مسیحی جمع ہو گئے۔ اُن کی تقریر کی گرمی اور تیزی سورج کی گرمی سے زیادہ معلوم ہوتی تھی۔

رات کے وقت جب عیسائی پھر جمع ہوئے تو میاں صاحب نے ایسی گرما گرم تقریر کی کہ لوگوں نے مجبور ہو کر رونا، چِلّانا اور اپنے گناہوں کا اقرار کرنا شروع کر دیا۔ میاں صاحب کے ہمراہی بھی اپنے دیرینہ گناہوں کو یاد کر کر کے رو رہے تھے اور گاؤں کے عیسائی چوری چکاری، لڑائی جھگڑوں وغیرہ کا اقرار کر رہے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ گُزر چکی تھی۔ بزُرگ میاں صاحب نے مختلف لوگوں اور پارٹیوں میں صُلح کرا دی۔ یوں سب خدا کی برکت پا کر سونے کو چلے گئے۔

صبح سویرے جب مُرغ نے بانگ دی تو ہم سب نے عبادت کی اور ڈھوڈہ سے روانہ ہو کر دوپہر کے وقت پسرور پہنچے جہاں بابو ہلاسی رام کے مکان پر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد بازاروں کے موڑوں اور سڑکوں پر انجیل کا پیغام ہندوؤں اور

مسلمانوں کو سُنایا گیا۔ اِس کے بعد ایک بڑا بھاری جلسہ ہوا جو ساری رات ہوتا رہا۔ اُس میں پسرور کے تمام عیسائی، سکول کی لڑکیاں اور اُستانیاں، علاقے کے گاؤں کے مُبلّغ، خادم الدین، اُستاد، مردانہ اور زنانہ مشنری سب حاضر تھے۔ اُن میں سالک صاحب اور بابولکّھو مَل صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ جلسہ نہایت کام یاب ثابت ہوا۔ میاں صاحب کی جوش دلانے والی تقریر نے ایک بے ساختگی پَیدا کر دی۔ روح القدس کی برکت اِس کثرت سے نازل ہوئی کہ بعض لوگ جو محض تماشا دیکھنے کے لئے جلسہ گاہ میں آئے تھے بے اختیار ہوکر روح سے مجبور ہو گئے اور اپنے گناہوں کا اقرار کرکے توبہ کرنے لگے۔ دُعا اور مناجات کی روح لوگوں میں پھونکی گئی اور تمام رات عبادت ہوتی رہی۔

جب صبح ہوئی تو ہم سیالکوٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ سالک اور بابولکّھو مَل ہماری پارٹی کے ساتھ تھے۔ اُن کے ہمراہ مشن کے چند ملازمین بھی ہو گئے۔ سب سے آگے بزرگ احسان اللہ صاحب ننگے پاؤں پیدل چل رہے تھے۔ وہ حسبِ دستور

کتابِ مقدّس کے کسی حصّے پر یا انجیل شریف کے کسی مقام پر یا مسیحی عقائد پر گُفتگو کرتے جاتے تھے۔ اور ہر شخص اُن کی باتیں سُننے کے لئے آگے آگے بڑھتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے مُنہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ اُن کی باتیں ایسی دل آویز تھیں کہ کسی کو تکان بھی محسوس نہ ہوئی۔ یہ خدا کے کلام کے مطابق تھا جس میں لکھا ہے،

> وہ قابلِ اعتماد تعلیم دیتے تھے، اور اُن کی زبان پر جھوٹ نہیں ہوتا تھا۔ وہ سلامتی سے اور سیدھی راہ پر میرے ساتھ چلتے تھے، اور بہت سے لوگ اُن کے باعث گناہ سے دُور ہو گئے۔ اماموں کا فرض ہے کہ وہ صحیح تعلیم محفوظ رکھیں، اور لوگوں کو اُن سے ہدایت پانی چاہیئے۔ کیونکہ امام رب الافواج کا پیغمبر ہے۔ (ملاکی 2:6–7)

ہمارے پاس خداوند مسیح کے حُکم کے مطابق ایک پیسہ بھی نہ تھا اور نہ کوئی فکر تھی۔ راستے میں ایک گاؤں منجکے خورد آیا۔ وہاں ہم نے اپنی پارٹی کے دو ٹولے بنائے۔ ایک کا لیڈر جیون مَل تھا اور دوسرے کا لیڈر بندہ تھا۔ ہم گاؤں کے مختلف حصّوں

میں گئے۔ ہم ڈھولک، جھانج اور چمٹا بجا کر گیت گاتے، انجیل کا پیغام سناتے اور پھر بھیک مانگتے تھے۔ مشن کے ملازم تو سڑک کے درختوں کے سائے کے نیچے بیٹھے رہے اور ہم کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ کیونکہ یہ طریقہ اُن کے لئے نیا تھا مگر ہمارے لئے نہ تو نیا اور نہ مُشکل تھا۔ اُن میں سے ایک ہم پر ہنسا، کیونکہ ہم اُن آدمیوں کے لئے ایک تماشا ٹھہرے تھے۔ ہم مسیح کی خاطر بے وقوف تھے مگر وہ عقل مند۔ ہم مُفلس اور کنگال تھے اور وہ دولت مند۔ وہ عزّت دار تھے اور ہم بے عزّت۔ ہم بھوکے، پیاسے، ننگے تھے۔

> ہم دُنیا کا کُوڑا کرکٹ اور غلاظت بنے پھرتے ہیں۔
>
> (1۔کُرِنتھیوں 13:4)

وہاں سے چل کر ہم موضع بڈیانہ پہنچے۔ اب بھوک سے ہم نِڈھال ہو رہے تھے اور دُھوپ بھی شدّت کی تھی۔ مشن کے ملازم تو کُچھ خرید کر روٹی کھانے لگے جبکہ ہم نے جو آٹا پچھلے گاؤں سے مانگا تھا وہ پکوایا۔ لیکن ہم زیادہ تھے اور روٹیاں کم تھیں۔

چنانچہ میاں صاحب اور مَیں گاؤں میں روٹیاں مانگنے کے لئے گئے اور خداوند مسیح کے نام پر بھیک مانگی۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے!

ہمیں باجرے کی ایک باسی روٹی ملی اور گاؤں کے دُکان دار سے آدھا چھٹانک گُڑ ملا۔ یہ لے کر ہم دونوں واپس اپنی پارٹی میں گئے۔ بزُرگ میاں صاحب نے کھانے سے پہلے شُکر کا کلمہ کہا اور بابولکّو مَل سے فرمایا کہ تم روٹیاں بانٹو۔ باجرے کی باسی روٹی اور گُڑ میاں صاحب کے اور میرے حصے میں آیا۔ مَیں ضد کرتا تھا کہ میاں صاحب گُڑ کھا لیں اور وہ یہ فرماتے تھے کہ تم کھاؤ۔ آخر اُنھوں نے کہا، "بیٹا، مَیں چاہتا ہوں کہ بہتر حصّہ تمہارا ہو، کیونکہ مَیں دیکھتا ہوں کہ تم بہت تھک گئے ہو اور مجھے اِتنی تھکاوٹ نہیں ہے۔" اُن کے حُکم کے مطابق مَیں نے تو گُڑ کھا لیا اور اُنھوں نے باجرے کی روٹی لے لی۔ اور کھا کر لیٹ گئے۔ جوشِ عقیدت سے ہم میں سے بعض اُنہیں دبانے لگے۔

اُنہوں نے تقریباً آدھا گھنٹا آرام کیا اور پھر اُٹھ بیٹھے اور چار بجے بعد از دوپہر تک ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کو انجیل کا پیغام سُناتے رہے۔ کیونکہ وہ انجیل کی منادی کرنا اشد ضروری سمجھتے تھے بلکہ اُن کی خوراک ہی انجیل کی منادی تھی۔ وہ ہمیشہ دُعا کے لئے الگ ویرانے میں روزانہ نکل جایا کرتے تھے۔ اُن کے پاس کتابِ مقدّس ہمیشہ رہتی تھی، اور اُس کی تلاوت پر اور الگ دُعا کرنے پر وہ عمل کرتے رہے۔ کتابِ مقدّس کے حصّوں کے حصّے اُن کو زبانی یاد تھے، اور وہ اِس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ ہم بھی اِن کو یاد کیا کریں۔

بڈیانہ سے چل کر ہم رات کے وقت سیالکوٹ پہنچے۔ وہاں امام الدین شہباز کے گھر چلے گئے۔ مشن کے ملازم ایکوں پر سوار ہو کر ہم سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ اُنہوں نے شہباز صاحب کو بتایا کہ بزرگ احسان اللہ پندرہ آدمیوں کے جتّھے کے ساتھ پیدل آرہے ہیں، اور کسی نے بھی کل رات کے بعد پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ جب ہم میاں صاحب کے گھر گئے تو اُنہوں نے کھانا تیار کر دیا ہوا تھا۔ جب کھانے سے

فارغ ہوئے تو سیمنری کے طالب علم اکٹھے ہو گئے۔ لیکن اُن کا
کوئی استاد نہ آیا۔ اِن طلبا میں لبّھو مَل، ملو چند، منگو مَل،
برکت مسیح اور نتھو مَل بھی تھے۔

جب احسان اللہ نے سیمنری کے طلبا کا گروہ دیکھا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ اب اُنہیں خدا نے ایک سُنہری موقع عطا کیا تھا جسے وہ استعمال کر کے اُن طلبا کو اور اُن کی مستقبل کی زندگیوں کو اپنے اُصولوں کے سانچوں میں ڈھال سکتے تھے۔ اُنہوں نے پہلے ہر ایک سے انفرادی طور پر گُفتگو کی۔ جب جلسہ شروع ہوا تو اُنہوں نے دُعا کر کے ایک ایسی جوشیلی تقریر کی جس کے ایک ایک لفظ میں اُن کے دل کی دھڑکنیں تھیں۔ جلسے میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گھنا مَل لکھتے ہیں،

اِس جلسے میں خدا کے روح نے بڑی قُدرت کے ساتھ کام کیا۔ حاضرین نے چیخیں مار کر اپنے گناہوں کا اقرار کرنے شروع کر دیئے اور خدا سے سچّا وعدہ کیا کہ وہ اُس سے فضل پا کر نئی زندگی بسر کریں گے۔

اگلے روز جب لوگوں کو پتا لگا کہ احسان اللہ آئے ہیں اور جلسے کا اہتمام شہر والے امریکن مشن سکول میں ہو گا تو سکول کا احاطہ کھچا کھچ بھر گیا۔ بھیڑ اِس کثرت سے تھی کہ کَھوے سے کَھوا چھلتا تھا۔ مختلف جماعتوں کے شرکا اِس جلسے میں حاضر تھے۔ سکاچ مشن کے مردانہ اور زنانہ مشنری، یُو۔پی مشن کے مردانہ اور زنانہ مشنری، حاجی پورہ سکول کی پرنسپل مِس ایم۔ جے کیمبل، ٹھل سنگھ اپنے مُبلّغوں اور استادوں سمیت، نیز ارد گرد کے دیہات کے مسیحی مُبلّغ سب کے سب وہاں جمع تھے۔

جلسہ دُعا اور گیت سے شروع ہوا۔ انجیل جلیل کا حصّہ پڑھا گیا۔ پھر احسان اللہ تقریر کرنے کے لئے اُٹھے۔ اُن کے الفاظ سادہ تھے، لیکن اُن میں گرمی اور گداز تھا جس نے بے ساختہ جذبات کا اظہار پَیدا کرنا شروع کر دیا۔ اُن کی قیامت خیز تقریر چلتی ہوئی شمشیر تھی جو سامعین کے دلوں اور گُردوں

کے پار ہوتی جاتی تھی۔ اُن کے اثر نے ایک محشر برپا کر دیا۔
گھنا مَل لکھتے ہیں،

عبادت میں روح کی بارش بڑی کثرت سے ہوئی۔ مشنریوں نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اُنہوں نے نہایت عاجزی سے اپنی دُنیاداری اور دُنیاوی شان قائم رکھنے کا اقرار کیا۔ ظفروال کے اینڈرسن نے کالر نیکٹائی اُتار پھینکی۔ مِس کیمبل نے اُس دن سے خالص پنجابی لباس شلوار، کُرتہ اور دوپٹہ پہننا شروع کر دیا۔ خادموں نے بھی اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور اُن سے توبہ کرکے مسیح کے حقیقی خادم الدین بننے کا خدا کے حضور وعدہ کیا۔ لبّھو مل اور ملو چند اُس روز سے بزرگ احسان اللہ کے پکّے چیلے بن گئے اور آج تک اُنہیں فخر سے اپنا استاد مانتے چلے آئے ہیں۔

اِس جلسے کے بعد بہت خادم الدین نے حُقّہ پینا چھوڑ دیا اور دیگر منشّی اشیا سے پرہیز کرنے کا وعدہ کیا۔ شہباز صاحب جنہوں نے زبوروں کو پنجابی اور اردو زبانوں میں منظوم کیا ہے بزرگ میاں صاحب کی تقریر کی گرمی اور تیزی سے آپے سے

باہر ہو گئے اور اپنے جذبات کا بے ساختہ اظہار کرنے لگے۔ بیرسٹر پی۔ڈی سنگھا نے شراب نوشی کا اقرار کیا اور ایک دن انگریزی لباس اُتار کر جوگیا رنگ کی دھوتی پہن کر جلسے میں آئے۔

سیالکوٹ سے ہم گوجرانوالہ آئے اور یہاں کے دیہات کے مسیحیوں میں بھی جلسے کیے۔ ہم جہاں کہیں گئے بزرگ احسان اللہ کے پُر تاثیر وعظوں کے بعد ہر جگہ گناہوں کا اقرار اور نالہ و فریاد کی آوازیں بلند ہوتیں، ہر جگہ روح القدس کی قدرت بڑی قوّت کے ساتھ ظاہر ہوتی۔ ہر مقامی جماعت نے تہیّہ کر لیا کہ وہ مسیح خداوند کا بدن ہو کر زندگی گزارے گی اور خدا کے فضل سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نجات کا پیغام پھیلائے گی۔ گوجرانوالہ کے بعد ہم نارووال واپس آ گئے۔

سیالکوٹ کے جلسوں کا سب سے زیادہ اور پائے دار اثر مِس کیمبل، ملو چند اور لبھو مل پر ہوا۔ مِس کیمبل احسان اللہ کی چیلی بن گئیں جس کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔ ملو چند اپنے لڑکپن ہی سے احسان اللہ کے چیلے تھے۔ وہ لکھتے ہیں،

احسان اللہ خداوند میں میرے باپ ہیں، اور مَیں نے اُن کے وسیلے سے نیا جنم پایا ہے۔ میرا گاؤں موضع مِیرک پور تھا جو موضع دھرگ سےنصف میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ جب چودھری منصب دار صاحب نے خداوند مسیح کو قبول کیا مَیں وہاں موجودتھا۔ جنرل بُوتھ کے جلسوں کے بعد جب وہ دھرگ آئے تو اُنہوں نے مجھے بُلایا۔ ہم دونوں جنگل میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اُنہوں نے مجھ سے میری زندگی کی نسبت ایسی باتیں کیں کہ مَیں بے اختیار رونے لگا۔ مَیں نے اپنے گناہوں سے پشیمان ہوکر خالص نیّت سے توبہ کی۔

تب اُنہوں نے مجھے لبّھو مل کو بُلانے کے لئے بھیجا جو بدّو ملّہی میں رہتے تھے۔ مَیں اُنہیں اپنے ہمراہ لے کر رعیّہ آیا۔ بزرگ میاں صاحب نے اُن سے بھی بڑی سنجیدگی اور سرگرمی سے اُن کی روحانی زندگی کے متعلّق گُفتگو کی۔ وہ بھی اپنے گناہوں کے قائل ہو گئے اور خدا سے سچے دل سے مُعافی مانگنے لگے۔

پھر ہم سب نارووال آئے جہاں چرچ مشن کے تمام کارندے جمع تھے۔ بزرگ احسان اللہ نے وہاں ایسی تقریریں کیں جو پہلے کبھی سُنی بھی نہ گئی تھیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں روحانی بیداری کی ایک بڑی زبردست لہر پیدا ہوگئی جس نے سب منّادوں اور استادوں کی زندگیوں پر ہمیشہ قائم رہنے والا اثر ڈالا۔

اِس واقعے کے بعد بزرگ میاں صاحب جنرل بُوتھ کے ہمراہ انگلینڈ چلے گئے، اور مَیں اور لبّھو مل سیالکوٹ کی سیمنری میں جا داخل ہوئے تاکہ ہم انجیل کی خدمت کرسکیں۔ جب میاں صاحب انگلینڈ سے واپس آئے اور رعیّہ میں سمرسکول کے لئے گئے تو ہم دونوں نے اُنہیں سیالکوٹ کی سیمنری میں آنے کی دعوت دی۔ میاں صاحب پَیدل ننگے پاؤں جوگیا رنگ کے سادھوؤں کے لباس میں رعیّہ سے سیالکوٹ پہنچے۔ ہم جو وہاں پڑھتے تھے ڈپٹی وزیر علی کی حویلی میں رہتے تھے۔ سب طلبا رات کو جمع ہوئے۔ میاں صاحب کی پُر جوش دُھواں دار تقریر کے وقت بہت ماتم ہوا اور سب نے اپنا دل خدا کو دے

دیا۔ اگلا روز اتوار تھا۔ امام الدین شہباز صاحب سیالکوٹ کی جماعت کے پاسبان تھے، اور مِس کیمبل حاجی پور گرلز سکول کی پرنسپل تھیں۔ میاں صاحب کے وعظوں اور جلسوں کا بڑا اثر ہوا، اور خدا کی عجیب قُدرت ظاہر ہوئی۔

اِن جلسوں میں بارہ پتّھر سکول کے طلبا کو حاضر ہونے کا موقع نہ ملا تھا۔ یہ ملو چند اور لبّھو مل کا پُرانا سکول تھا۔ قُدرتاً اُن کی یہ خواہش تھی کہ یہ لڑکے بھی اُس برکت میں شامل ہوں جو اُنہیں اور سیالکوٹ کے دیگر عیسائیوں کو احسان اللّٰہ کے وعظوں کے ذریعے ملی تھی۔ لیکن سکول کے پرنسپل نے دونوں جوانوں کو لڑکوں سے ملنے کا موقع نہ دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ جلسے محض جذباتی قسم کے تھے جن کا اثر دیرپا نہیں رہے گا اور جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔ اُس نے یہ بھی سُنا تھا کہ اُن جلسوں میں امریکن مشنریوں کا کیا حال ہوا تھا، اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ لڑکوں کو اُن باتوں کا پتا لگے۔ چنانچہ دونوں جوان مقصد حاصل کئے بغیر واپس چلے گئے۔ لیکن اُنہوں نے

بارہ پتھر سکول کے لئے دُعا کرنی نہ چھوڑی۔ ہم آگے چل کر اُن کی دُعاؤں کا نتیجہ دیکھیں گے۔

یہاں ہم ناظرین پر ایک بات کو واضح کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ احسان اللہ شُعلہ انگیز تقریریں اور وعظ فرمایا کرتے تھے، لیکن وہ جذباتی شخص نہ تھے اور نہ محض جذبات سے کام لیتے تھے۔ اُن کا یہ مقصد ہی نہ تھا کہ لوگ وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر خدا کے حضور اپنے گناہوں کے لئے نالہ و فریاد کریں اور اِن سے توبہ کریں۔[a] وہ خوب جانتے تھے کہ اِس قسم کی توبہ دیرپا نہیں ہوتی اور نہ اِس قسم کے جذبات سے گناہ گار انسان نیا جنم پا سکتا ہے۔ میاں صاحب کی تقریروں اور وعظوں کے الفاظ نہایت سادہ ہوتے تھے اور ہر طرح کے تصنّع اور مرصّع سازی سے پاک ہوتے تھے۔ لیکن وہ ہر ایک میں آگ لگا دیتے تھے، کیونکہ وہ دل سے نکلتے تھے اور اُن کے دل کی گرمی اور گداز کے ترجمان ہوتے تھے۔ اُن میں ہر

[a] 1۔ کُرِنتھیوں 33:14

سُننے والے کو دل کی دھڑکنیں سُنائی دیتی تھیں جن کی صدائے بازگشت اُن کے اپنے دلوں میں سُنائی دیتی تھی۔

ہم بتا چکے ہیں کہ میاں صاحب دلیل و بُرہان کے زور سے عاجز ہو کر مسیحی ایمان کے قائل ہوئے تھے۔ بپتسمے کے دو سال بعد ہی اُنہیں یہ تجربہ ہوا تھا کہ خداوند مسیح گناہ گاروں کو گناہ کے زور سے رہائی دے کر از سرِ نَو زندہ کرتا ہے۔ اُن کی طبیعت جذباتی نہ تھی اور نہ وہ محض جذبات سے مجبور ہو کر کبھی مجنونانہ حرکتیں کرتے تھے۔ وہ اُس جنون کے قائل تھے جو باشعور بھی ہو۔ وہ پولس رسول جیسے "دیوانہ" تھے۔[a] اُن کی زبان "شعلے کی لَوئیں جیسی" زبان[b] تھی جو اُن بڑے کاموں کا بیان کرتی تھی جو اُن کے اپنے تجربے میں آئے تھے۔ اُن کے الفاظ ابتدائی رسولوں کے الفاظ کی طرح کلام کے تقاضے کے مطابق نہایت سادہ ہوتے تھے۔ لیکن اُن سے حاضرین

---

[a] اعمال 25:26
[b] اعمال 3:2

کے "دل چِھد" جاتے تھے،[a] اور وہ بے اختیار ہو کر توبہ کرتے اور گناہوں کی مُعافی پا کر روح القدس انعام میں پاتے تھے۔

میاں صاحب کے الفاظ ابتدائی رسولوں کے الفاظ کی طرح تھے۔ وہ بے معنی باتیں نہیں ہوتے تھے بلکہ اُن کا کلام قُدرت کے ساتھ ہوتا تھا۔

> کیونکہ اللہ کی بادشاہی خالی باتوں سے ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی قدرت سے۔ (1۔کرِنتھیوں 20:4)

اُن کے الفاظ کی ہڈیوں پر نسیں اور گوشت چڑھ جاتے تھے۔[b] اوگسطین نے خوب کہا ہے،

> جس کی زندگی بجلی اور برق ہے اُس کے کلام میں کڑک اور گرج ہوتا ہے۔

اُن کی آواز نرسنگے کی سی تھی۔ جب لوگ اُن کے ساتھ عبادت کرتے تھے تو وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ خدا کا جلال اُن کے

---

[a] اعمال 37:2
[b] حزقی ایل 8:37

چاروں طرف ہے۔ وہ فصیح البیان شخص نہ تھے اور نہ اُن کے وعظوں میں مختلف قسم کی رنگینیاں اور وضع داریاں پائی جاتی تھیں۔ بالکل اُسی طرح جس طرح پولس رسول فرماتا ہے،

> مَیں نے ارادہ کر رکھا تھا کہ آپ کے درمیان ہوتے ہوئے مَیں عیسیٰ مسیح کے سوا اَور کچھ نہ جانوں، خاص کر یہ کہ اُسے مصلوب کیا گیا۔ (1۔کُرِنتھیوں 2:2)

رسول کی طرح اُن کی منادی روح کی قُدرت سے ثابت ہوتی تھی جس وجہ سے اُن کی تقریریں ہنگامہ آرا ہوتی تھیں۔ جب وہ گناہ اورشیطان کے زور کا بیان کرتے تھے تو وہ کھری کھری سُنایا کرتے تھے، لیکن اُن میں جلی کٹی سُنانے کا انداز نہ ہوتا تھا۔ اُن کا اثر بے ساختہ جذبات میں ہیجان پَیدا کر دیتا تھا، لیکن اِن جذبات کو پَیدا کرنا میاں صاحب کا مقصد نہ ہوتا تھا۔ اُن کے جلسوں میں سالویشن آرمی کے سے جذباتی نعرے مثلاً ''ہیلیلویاہ'' وغیرہ بُلند نہیں ہوتے تھے، کیونکہ

اُنہیں اب تجربے سے معلوم ہو چکا تھا کہ اعلیٰ روحانیّت اِس قسم کی واعظانہ بے قراری سے علیٰحدہ ہے۔ وہ خوش گُفتار تھے اور کتابِ مقدّس کے نکات و رموز کو کتابِ مقدّس کے مطالعے کے وقت ایسے دل چسپ طریقے سے پیش کیا کرتے تھے کہ بات میں جان پڑ جاتی اور سُننے والوں پر محویّت طاری ہو جاتی تھی۔ دل کشی ایسی کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ ؎

> وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی۔

مَیں نے لبّھو مل صاحب سے خود سُنا ہے کہ اُنہوں نے کتابِ مقدّس کے حقائق کا علم سیمنری سے نہیں بلکہ احسان اللہ سے حاصل کیا ہے۔ خدا یرمیاہ نبی کی معرفت فرماتا ہے،

> جس پر میرا کلام نازل ہوا ہو وہ وفاداری سے میرا کلام سنائے۔ بھوسے کا گندم سے کیا واسطہ ہے؟ رب فرماتا

> ہے، کیا میرا کلام آگ کی مانند نہیں؟ کیا وہ ہتھوڑے کی طرح چٹان کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرتا؟
>
> (یرمیاہ 23:28–29)

احسان اللہ ایک دیانت دار نبی تھے۔ اُن کے چیلے مرتے دم تک فخر سے اُنہیں اپنا استاد مانتے رہے۔ گہنا مل بھی لکھتے ہیں،

جب کبھی کوئی شخص ہم میں سے کسی کو منادی کرتے سُن لیتا ہے تو فوراً پہچان لیتا ہے کہ ہم بزرگ احسان اللہ کے شاگرد ہیں۔ ے

> اِسی چراغ سے روشن چراغ بھی ہوئے۔

اِس قسم کے مستقل نتائج محض وقتی جذبات کے شُعلوں کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ یہ بےخودی زندگی بھر اُس انسان کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے جس نے روح القدس کے زندگی نواز تاثرات کا ذاتی تجربہ کیا ہو۔ وہ لوگ اِن رموز کو نہیں سمجھ سکتے

جو حقیقی تصوّف اور معرفت کا لباس پہننے کے بجائے برہنگی پسند کرکے اِس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ؎

> میری اُلفت میں کبھی رنگِ جنوں آ نہ سکا۔

میاں صاحب کو مصنوعی فصاحت و بلاغت اور لفاظی سے نفرت تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کلام اللہ میں خود ہی ایسی کشش ہے کہ اُسے کسی چمکیلی زبان کی ضرورت ہی نہیں۔ ؎

> آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روے زیبا را۔
> آب تاب، رنگ، خال اور خط کے حساب سے خوب صورت چہرے کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

اُن کے وعظ سادے تھے، لیکن وہ لوگوں کو ابدیّت کے ہمکنار کر دیتے تھے۔ وہ شاعرانہ بُلندیاں نہیں بلکہ حقیقت بیان کرتے تھے۔ اُن کے وعظوں میں زندگی تھی اور اپنے آقا کی طرح لوگوں سے اُن کی سمجھ کے مطابق کلام کیا کرتے تھے۔

اُن ہزاروں لوگوں میں جو اُن کا کلام سُنتے تھے ہر ایک یہی خیال کرتا تھا کہ اُن کا وعظ میرے ہی لئے ہے اور مَیں ہی وہ گناہ گار ہوں جس کا وہ ذکر کر رہے ہیں۔ اُن کا ہر وعظ زور دار تھا، لیکن وہ ٹھنٹھناتا پیتل یا جھنجھناتی جھانجھ نہ تھا، کیونکہ وہ ایک درد بھرے دل سے نکلتا تھا۔ جس طرح لوہا آگ میں دہک کر خود انگارہ ہو جاتا ہے اُسی طرح وعظ کے سُننے والے دہک اُٹھتے تھے۔[a] حقیقت تو یہ ہے کہ کلامِ الٰہی کا خادم کوہِ حورب کی طرح ہوتا ہے جو ایک ننگی چٹان تھی لیکن جب خدا کا ہاتھ اُسے چھوتا ہے تو اُس میں سے زندگی کے پانی کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں جو دشت و صحرا کو سیراب کر دیتے ہیں۔

احسان اللہ کی منادی پر خدا کی مُہر لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنے آقا کی طرح خدا اور انسان کی مقبولیّت میں بڑھتے گئے۔ موجودہ نسل کے لئے اُن کی ہر دل عزیزی کا اندازہ لگانا نہایت

[a] بمقابلہ یرمیاہ 20:9؛ 14:5

مُشکل ہے۔ لوگ چاروں طرف اُن کے چیلے بنتے چلے جا رہے تھے، اور جو اُن کے چیلے نہیں تھے وہ اُن سے حد سے زیادہ کی عقیدت اور دلی اُنس رکھتے تھے۔ میاں صاحب کا حال حزقی ایل نبی کا سا تھا،

> اے آدم زاد، تیرے ہم وطن اپنے گھروں کی دیواروں اور دروازوں کے پاس کھڑے ہو کر تیرا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، 'آؤ، ہم نبی کے پاس جا کر وہ پیغام سنیں جو رب کی طرف سے آیا ہے۔' (حزقی ایل 30:33)

ہر شخص جو اِس قدر اور اِتنی جلدی ہر دل عزیز ہو جائے ایسی آزمائشوں میں گرفتار ہو جاتا ہے جن کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ غرور اور تکبّر اُسے آسمان کی بُلندیوں سے پاتال میں بڑی جلدی سے گرا دیتے ہیں۔ اُس کی روحانی زندگی ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ تب وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ لیکن میاں صاحب اُن آزمائشوں میں نہ گرے اور خدا سے توفیق پا کر اُن پر ہمیشہ غالب آئے۔ اُنہیں خوشامد سے پرلے درجے کی نفرت تھی۔

وہ کہا کرتے تھے کہ جب مَیں کسی کو اپنی تعریف کرتے سُنتا ہوں تو مجھ پر ایسی اُداسی چھا جاتی ہے کہ میرا رونے کو جی کرتا ہے۔ کیونکہ اُس کا دھیان مسیح کی طرف نہیں ہوتا جس کے قدموں میں مَیں اُسے لے جانا چاہتا ہوں بلکہ اُس کا دھیان ایک کمزور انسان کی طرف ہوتا ہے۔

وہ اکثر موریوین[a] نماز کی کتاب کی یہ دُعا پڑھا کرتے تھے،

> اپنی بڑائی اورشُہرت حاصل کرنے کی خراب خواہش سے، اے کریم خداوند، ہمیں بچا۔

وہ خدا کا ہمیشہ شکر کرتے تھے کہ

> خداوند کا کلام زبردست طریقے سے بڑھتا اور زور پکڑتا گیا۔ (اعمال 20:19)

پولُس رسول کے ہم زبان ہو کر وہ کہتے تھے،

Moravian[a]

> لیکن خدا کا شکر ہے! وہی ہمارے آگے آگے چلتا ہے اور ہم مسیح کے قیدی بن کر اُس کی فتح مناتے ہوئے اُس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ یوں اللہ ہمارے وسیلے سے ہر جگہ مسیح کے بارے میں علم خوشبو کی طرح پھیلاتا ہے۔
>
> (2۔کُرِنتھیوں 2:14)

9

سیالکوٹ کنونشن کا آغاز

نارووال

اپنے کمر بند میں پیسے نہ رکھنا — نہ سونے، نہ چاندی اور نہ تانبے کے سِکے۔ نہ سفر کے لئے بیگ ہو، نہ ایک سے زیادہ سوٹ، نہ جوتے، نہ لاٹھی۔ کیونکہ مزدور اپنی روزی کا حق دار ہے۔ (متی 10:9-10 بمقابلہ لوقا 10)

کون سا فوجی اپنے خرچ پر جنگ لڑتا ہے؟ کون انگور کا باغ لگا کر اُس کے پھل سے اپنا حصہ نہیں پاتا؟ یا کون ریوڑ کی گلہ بانی کر کے اُس کے دودھ سے اپنا حصہ

> نہیں پاتا ؟... ہم نے آپ کے لئے روحانی بیج بویا ہے۔ تو کیا یہ نامناسب ہے اگر ہم آپ سے جسمانی فصل کاٹیں ؟... خداوند نے مقرر کیا ہے کہ انجیل کی خوش خبری کی منادی کرنے والوں کی ضروریات اُن سے پوری کی جائیں جو اِس خدمت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔
>
> (1۔کرنتھیوں 9:7، 11، 14)

1896ء کا سال پنجاب کی جماعت کی زندگی میں نُمایاں طور پر سنگِ میل ہے۔ کیونکہ اِس سال خدا نے احسان اللہ کے ذریعے سیالکوٹ کنونشن کی بُنیاد ڈالی اور پنجاب کی جماعتوں اور خادمانِ دین کو یہ احساس دلایا کہ اپنا بوجھ خود اُٹھانے کی ذمّے داری کو پہچان کر نجات کا پیغام پھیلانا اپنا پہلا فرض خیال کریں۔

گزشتہ باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ خدا نے سیالکوٹ میں میاں صاحب کے ذریعے اپریل اور مئی 1896ء میں جماعت کو اور اُس کے خاندانِ دین کو غفلت کی نیند سے بیدار کیا۔

جب میاں صاحب مئی میں نارووال واپس آئے تو مِس کیمبل اُن کے ہم راہ تھیں۔ نارووال میں جلسوں کا انتظام کیا گیا۔ صبح کے وقت میاں صاحب اور رات کے وقت مِس کیمبل کی تقریریں ہوتی تھیں۔ میاں صاحب صبح کی عبادت میں عیسائیوں کو بار بار اللہ اور اُس کے فرزندوں کے حقوق کی یاد دلاتے تھے۔ حسبِ معمول اُن کی تقریریں ولولے پیدا کر دیتی تھیں اور اُن کے آتشیں الفاظ ناپاک دلوں کو خاکستر بنا دیتے تھے۔ اُن کے وعظ نیم گرم دلوں کو ہلا کر اُن میں جُنبش پیدا کرتے اور اُنہیں حسّاس بنا دیتے تھے۔

نارووال کی بڑی عبادت گاہ صبح سویرے مردوں، عورتوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھری ہوتی تھی۔ وہ دن بھر شہر کے بازاروں میں کھڑے ہو کر یا دوستوں اور رشتے داروں کی دُکانوں میں بیٹھ کر نجات کا پیغام سناتے اور گناہ گاروں کو اُن کے نجات دہندے کی دعوت ایسے الفاظ میں دیتے کہ سُننے والے تھرّا اُٹھتے اور اُن کے جان پہچان ایک دوسرے کو

کہتے، ”کیا وہ یہی احسان ہے جس کو ہم بچپن سے جانتے تھے اور جب وہ عیسائی ہوا تو ہم کہتے تھے کہ اُسے دُکان کے سَودے میں خسارہ ہوا ہے؟ عیسائی ہو کر اُس کے ہاتھ کیا آیا ؟ اب تو یہ سادھو فقیر ہو گیا ہے۔ یقیناً ہمارا خیال غلط تھا۔“

بہت لوگوں نے اُن کی مُنادی سُن کر کتابِ مقدّس کو پڑھنا شروع کر دیا۔ خاص کر اُن کے چھوٹے بھائی شیخ رحمت علی کا دل اُن کی موجودہ طرزِ زندگی سے بہت متأثّر ہوا، اور وہ زیادہ سے زیادہ زوق و شوق سے قرآن و کتابِ مقدّس کا مطالعہ اور موازنہ کرنے لگے۔ وہ کہتے ہیں،

جب بھائی جی اسلام کو ترک کر کے عیسائی ہو گئے تو سب خاندان کے دلوں پر کاری صدمہ ہوا۔ میرے دل پر تو بہت چوٹ لگی، کیونکہ مجھے اُن سے دلی اُنس تھا۔ ہم اُنہیں اپنا دُشمن سمجھنے لگے، کیونکہ ہمارے نزدیک اُنہوں نے اللہ کو، اللہ کے رسول کو، اللہ کی کتاب کو اورشیعہ مذہب کو ترک کر دیا

تھا۔ ہم اِس بات کے درپَے ہو گئے تھے کہ اگر موقع ملے تو اُنہیں جان سے مار دیں۔ چند مُدّت کے بعد یہ خیال تو نہ رہا، لیکن غم نے اِس کی جگہ لے لی کہ ہائے میرا عزیز بھائی جس پر ہماری سب اُمیدیں بندھی تھیں، وہ ہم سے جُدا ہو گیا ہے، اور ہم اُس سے الگ تھلگ ہو گئے ہیں۔ ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ، خوشی اور غم تک میں شریک نہیں ہو سکتے۔ ہم اُسے اپنی داستان نہیں سُنا سکتے۔ وہ ہم کو اپنی کہانی نہیں بتا سکتا۔

پھر کئی سال بعد وہ نارووال آئے اور خادم بن کر ہم کو نجات کی خوش خبری سُنانے لگے۔ مَیں اُن دنوں میں حق کی تلاش میں نہایت پریشان تھا۔ پھر جب وہ فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگے اور ہزاروں مرد و زن اُن کی زیارت کو آنے لگے تو ہمارے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم تو اُنہیں مُرتد اور کافر سمجھتے ہیں، لیکن تمام دُنیا اُن سے برکت پانے کو اُن کے قدموں میں گرتی ہے۔ وہ کس طرح راندۂ درگاہِ الٰہی ہو سکتے ہیں؟ لوگ اُن کا نام جپتے ہیں اور گھر بار چھوڑ کر اُنہیں پیر و مُرشد مان کر اُن کے چیلے بنتے جا رہے ہیں اور اُن کی بیعت کر رہے ہیں۔ تب

ہماری قوم کے بعض لوگوں کے دلوں میں بھی یہ خیال آنے لگا کہ کہیں ہم ہی تو بُھولے بھٹکے نہیں پِھرتے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ اُن کا دل محبت اور خوشی سے بھرا نظر آتا ہے؟ اُن کا چہرہ ہر وقت نُور کی طرح چمکتا رہتا ہے اور پُھول کی طرح شگُفتہ اور بشّاش رہتا ہے۔ ؎

> اُگ رہا ہے درو دیوار سے سبزہ غالب
> ہم بیابان میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے۔

اُن کی زندگی کو دیکھ کر مَیں نے یہ مصمّم ارادہ کر لیا کہ جو بھی ہو، مَیں اپنی تلاش کو جاری رکھوں گا جب تک گوہرِ مقصود میرے ہاتھ نہ لگ جائے۔

قبلہ واعظ بھی لکھتے ہیں،

ایک اور بڑا کارنامہ احسان اللہ کا ایسا ہے جس کے واسطے ہم خدا کا شکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ عموماً دیکھا جاتا ہے، اور ہے بھی سچ، کہ نبی اپنے وطن میں عزّت نہیں پاتا۔ ”گھر کا جوگی جوگڑا، باہر کا جوگی سِدھ۔“ باہر کے لوگ ہم کو ہاتھوں ہاتھ

اُٹھا لیتے ہیں لیکن گھر کے لوگ قبول نہیں کرتے۔ مگر احسان اللہ کا اثر اپنی قوم اور خاص کر اپنے قریبی رشتے داروں پر بہت اچھا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا سگا بھائی رحمت اللہ اُن کی روحانی تاثیر سے خاندان سمیت عیسائی ہو گیا۔ یہ صرف احسان اللہ کی زندگی کا، ہاں اُن کی مسیحی زندگی کا پھل ہے۔

رات کے وقت جلسے "جھنڈا" کے وسیع احاطے میں ہوتے اور مِس کیمبل تقریر کرتی تھیں۔ وہ ایک نہایت شریف النفس اور مسیحی طبیعت کی خاتون تھیں جو احسان اللہ کی چیلی بن گئی تھیں۔ اُن کی سادہ زندگی اور پنجابی لباس نے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا تھا، اور اُن کی سادہ لیکن پُر مغز تقریروں کے ذریعے خاص کر جماعت کی عورتیں بہت متاثّر ہوئیں۔

جون اور جولائی 1896ء کے مہینوں میں شدّت کی گرمی تھی۔ لیکن مسیح کے اِس عاشقِ زار کو نہ گرمی کی پروا تھی، نہ دُھوپ کی۔ وہ ننگے پاؤں فقیرانہ لباس میں نارووال کے علاقے کے

دیہات میں دَورہ کرتے رہے۔ اور گاؤں گاؤں جا کر ہندوؤں، مسلمانوں، سِکھوں اور بُت پرستوں کو زندہ خدائے واحد اورنجات دہندہ مسیح کا پیغام سناتے رہے۔ رات کو وہ جماعت کے عیسائیوں کو جمع کرکے سادہ پنجابی زبان میں اُن کے ایمان کومضبوط کرتے۔ اُنہیں روحانی زندگی بسرکرنے اور خداوند مسیح کے زندہ عُضو بننے کی تلقین کرتے تھے۔ یہ جماعتیں وہ تھیں جن کی قوّتِ حرکت و عمل ڈھیلی ہو چکی تھی اور جن میں میاں صاحب نے گزشتہ پانچ سال کام کرکے از سرِنَو جان ڈالی تھی۔ اُن کے شرکا خداوند میں اُن کے بچے تھے جن کو اُنہوں نے جنا تھا اورجن کے لئے اُنہیں دردِ زِہ سے زیادہ درد لگے تھے۔ ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ میاں صاحب نے اُن میں رہ کر اِن دو ماہ میں کس قدر محنت اورمشقّت کی ہو گی تاکہ وہ خداوند میں تربیت پاکر روح میں ترقی کرتے جائیں۔

سیالکوٹ

مئی کے وُسط میں ظفروال کے یُو۔پی مشن کے علاقے کے مُبلّغ سمر سکول کے لئے جمع ہوئے تو میاں صاحب ایک دن کے لئے وہاں لیکچر دینے کے لئے گئے۔ وہاں اُنہوں نے روح القدس کی معموری پر ایسے جوش اور سرگرمی کے ساتھ لیکچر دیا کہ پردیسی اور دیسی مُبلّغین مرد و خواتین اور استاد سب کے سب نہایت متاثر ہوئے۔ اُنہوں نے اُن سے وعدہ لے لیا کہ وہ پھر سیالکوٹ جائیں گے اور اِس کے بعد یُو۔ پی کے علاقے کے گاؤں اور قصبوں کا دَورہ کریں گے۔

چنانچہ احسان اللہ اگست کے شروع میں سیالکوٹ پہنچے اور امام الدین شہباز صاحب کے ہاں ٹھہرے۔ دونوں صاحبِ علم تھے اور مسلمانوں میں سے عیسائی ہوئے تھے۔

شہباز صاحب غازی وال گاؤں کے تھے جو نارووال سے ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہ اچھے شاعِر تھے اور

اُنہوں نے زبور کی کتاب کو پنجابی اور اردو میں منظوم کیا تھا۔ پنجاب کی تمام جماعتیں تب سے اُن کے منظوم زبور کو عبادت میں گاتی ہیں جس سے اُنہیں غیرفانی شُہرت نصیب ہو گئی ہے۔ افسوس ہے کہ اُن کے اردو "نظم المزامیر" کی کتاب اردو بولنے والی جماعتوں میں مروج نہ ہوئی ورنہ اُن جماعتوں کو بھی اُن سے روحانی فائدہ حاصل ہوتا۔ مَیں نے 1938ء میں اِس کتاب کی صدہا جِلدیں گوجرانوالہ سیمنری میں پڑی دیکھیں۔ معلوم نہیں کہ اُن کا کیا حشر ہوا۔

شہباز صاحب شاعر تھے تو احسان اللہ سُخن فہم تھے جن کے حافظے میں بےشمار اشعار محفوظ تھے۔ دونوں کتابِ مقدّس کے رموز و نکات کے ماہر تھے۔ دونوں تصوّف اور معرفت کے لباس سے مزیّن تھے۔ ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کی مُلاقات سے کس قدر محظوظ ہوئے ہوں گے۔

گزشتہ اپریل جب احسان اللہ صاحب نے سیالکوٹ کے جلسوں میں وعظ کئے تھے تو جیسا گہنا مل بتا چکے ہیں شہباز

صاحب نہایت متاثّر ہوئے تھے۔ اب اُنہوں نے سیالکوٹ کے جلسوں کا بڑے پیمانے پر انتظام کر دیا تھا تاکہ سیالکوٹ کے تمام ادارے اور مسیحی اور اردگرد کے دیہات کے مسیحی، سب کے سب احسان اللہ کے وعظ و نصیحت سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

سیمنری کے طلبا خاص کر لبّھو مل اور ملو چند نے اُن کی آمد سے پہلے دُعاؤں کا لگاتار سلسلہ جاری کر رکھا تھا تاکہ سب طلبا زیادہ سے زیادہ برکات پائیں۔ مِس کیمبل نے حاجی پورہ سکول کی لڑکیوں کو دُعا کے وسیلے سے تیار کیا۔ اِس وسیع تیاری نے بیج بونے کے لئے زمین پہلے سے تیار کر رکھی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے روح نے احسان اللہ کو خوب اچھی طرح استعمال کیا۔ ایک خادم لکھتے ہیں،

جب سیالکوٹ میں روحانی بیداری کے لئے جلسے ہوئے تو خدا نے بزرگ میاں صاحب کے کام اور خدمت پر بڑی برکت کی بارش برسائی۔ یہ جلسے بڑے کام یاب ثابت ہوئے۔

سیمنری طلبا اور استادوں کو، سکولوں کے لڑکوں اورلڑکیوں کو، اُن کے استادوں اور استانیوں کو، شرکائے جماعت اور ان کے پاسبانوں کو ازسرِنَونئی زندگی حاصل ہوئی۔ وہ سب کے سب روحانی جوش سے بھرگئے، اور اُنہوں نے نیّت باندھ لی کہ آئندہ ہم نئے طور پر زندگی بسرکریں گے۔ اُنہوں نے خدا اور جماعت کے رُو برُو علانیہ اپنی نیّت اور ارادہ کا اظہار کر کے اپنے آپ کو خداکی خدمت کے لئے مخصوص کیا۔ شہر کے عیسائی ہرطرف خوش وخُرّم نظرآتے تھے، کیونکہ اُن کے دل روحانی شکرگزاری سے معمور تھے۔

سیالکوٹ کے جلسوں کی روحانی بیداری کی شُہرت پنجاب کے دیگرشہروں اورقصبوں میں دُور دُور تک پھیل گئی۔ جن لوگوں نے خداوند میں نئی زندگی گزارنے کا پکّا ارادہ کرلیا تھا اُنہوں نے اپنے رشتے داروں، دوستوں اور پرانے رفیقوں کو اُن بڑی برکتوں کی خبر دی جو اُنہوں نے احسان اللّٰد کے ذریعے پائی تھیں اور ہر جگہ کے خادمانِ دین کو بھی ترغیب

دی کہ وہ رکھ رکھاؤ اور وضع داری کی زندگی چھوڑ کر حقیقی طور پر خداوند مسیح پر ایمان لا کر نئی زندگی گزاریں۔ یوں سیالکوٹ کے جلسوں کی خوشبو دُور دُور تک پنجاب کی جماعتوں کی فضا کو معطّر کرتی رہی۔

ظفروال

جب احسان اللہ سیالکوٹ کی روحانی بیداری کے کام اور انجیل کی خدمت سے فارغ ہوئے اور اُنہوں نے دیکھا کہ جماعت میں روحانی بیداری کی لہریں موج زن ہو رہی ہیں اور کام خود بخود ترقی کرنے لگا ہے تو وہ مِس کیمبل اور چند دیگر مسیحی طبیعت اور جوش رکھنے والی عورتوں اور مردوں کے ساتھ ظفروال کے لئے روانہ ہوئے۔ سیمنری کے طلبا لبّھو مل اور ملو چند اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ اُن کے ہم راہ تھے۔ ڈاکٹر اینڈرسن علاقے کے مشنری تھے جنہوں نے احسان اللہ اور اُن کے رُفقا کے لئے پہلے ہی تیاری کر رکھی تھی۔ اُنہوں

نے یو۔ پی مشن کے علاقے کے خادمانِ دین اور اُستادوں، مُبلّغوں اور مُبشّروں کو ظفروال بُلا لیا تھا تاکہ میاں صاحب کے وعظ و نصیحت سے فیض پائیں۔ ظفروال کی جماعت کے شرکا بھی مدعو کئے گئے۔ میاں صاحب سرِ شام ظفروال پہنچے اور رات کو جلسہ شروع ہوا۔ گنڈا مل صاحب لکھتے ہیں،

مَیں بھی موضع نڈالہ سے بیوی بچوں سمیت اِن جلسوں میں شریک ہونے کے لئے ظفروال گیا۔ جس وقت مَیں وہاں پہنچا تو رات کا ایک بج چکا تھا اور ابھی جلسہ ہو رہا تھا۔ مَیں بھی بیٹھ گیا۔ بزرگ میاں صاحب وعظ کر رہے تھے اور لوگ اپنے گناہوں کو یاد کرکے توبہ کر رہے تھے۔ جب جلسہ ختم ہوا تو وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملے اور بغل گیر ہو کر فرمانے لگے، ”بھائی گنڈا مل، آپ کا بڑا انتظار ہو رہا تھا۔ بہت اچھا ہوا کہ آخر آپ آ گئے۔ خدا کا شکر ہو۔“ جلسے کے بعد ہم سب اپنی اپنی جگہوں کو سونے کے لئے چلے گئے۔

اگلی صبح 20 اگست کا دن تھا۔ مَیں صبح سویرے اُٹھا اور وہاں کی طرف گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بزرگ میاں صاحب فرش پر

بیٹھے ہوئے ہیں اور لوگ اُن کے چوگرد حلقہ بنائے بیٹھے، اُن کی باتیں نہایت دل چسپی سے سُن رہے ہیں۔ مَیں بھی خاموش ایک طرف بیٹھ کر اُن کی باتیں غور سے سُننے لگا۔ وہ پنجاب کی جماعتوں میں اپنی مدد آپ کی ضرورت پر اِتنی زور سے گفتگو کر رہے تھے کہ سیمنری کا ایک طالب علم بے ساختہ بول اُٹھا، "ہاں، میاں صاحب۔ ہم دل سے چاہتے ہیں اور دُعا بھی کرتے رہتے ہیں کہ ہماری تمام جماعتیں اپنا مالی بوجھ خود اُٹھائیں اور ہم اپنی ہی مشن قائم کریں تاکہ ہم بھی اپنے مشنری غیرممالک میں بھیج کر اُن میں مسیح کا جھنڈا گاڑیں۔" احسان اللہ نے بڑے پیار سے اُس کی طرف دیکھا اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نہایت نرمی اور ملائمت کے ساتھ فرمایا، "ہاں، بھائی۔ تم وہ ہو جو کہتے ہو پر کرتے نہیں۔" بزرگ میاں صاحب کے یہ الفاظ اُس تیز تیر کی مانند جس کو کسی تجربہ کار اور ماہر تیرانداز نے کمان سے چھوڑا ہو، سیدھے میرے دل پر لگے اور آر پار ہو گئے اور مجھے کاری زخم لگا کر گھائل کر گئے۔ اُن کا یہ سیدھا سادہ فِقرہ میرے دل و دماغ بلکہ

تمام وجود میں لگاتار زور کے ساتھ ہر وقت گونجنے لگا۔ میں جس جگہ بھی جاتا شخصی طور پر اور علانیہ اُن کی آواز سُنتا رہتا، "تم وہ ہو جو کہتے ہو، پر کرتے نہیں۔"

جلسے کے اختتام پر اُنہوں نے فرمایا کہ آج رات کا مضمون اپنی مدد آپ کی ضرورت کے متعلّق ہو گا اور گنڈا مل صاحب اِس موضوع پر تقریر کریں گے۔

اُن کا اعلان سُنتے ہی اُس ایک فِقرے کے الفاظ میرے دل میں پھر بُری طرح چُبھنے لگے، "تم وہ ہو جو کہتے ہو پر کرتے نہیں۔" اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اِس گہرے لگے ہوئے تیر کو پکڑ کر زور کے ساتھ بُری طرح ہلاتا اور مجھے زیادہ گھائل کرتا چلا جاتا ہے۔ مَیں بڑی مُشکل سے اُٹھا اور کانپتے ہوئے عرض کیا، "جناب، اِس وقت مجھے معاف فرمائیں۔ مَیں ابھی اِس موضوع پر کچھ بھی کہنے کو تیار نہیں۔" میرے انکار کی وجہ یہ تھی کہ مَیں خود مشن سے تنخواہ لیتا تھا اِس لئے مَیں اپنے ہم خدمتوں کو یہ تعلیم نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ یوں مَیں

ایسے بھاری بوجھ باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتا جن کو مَیں اپنی اُنگلی سے بھی ہلانا نہ چاہتا۔

دن کے دس بجے جلسہ شروع ہوا۔ بزرگ میاں صاحب نے ایسا مؤثّر وعظ کیا کہ لوگوں پر بے خودی چھا گئی اور وہ خود فراموشی کی حالت میں آ کر علانیہ اپنے گناہوں کا اقرار کرنے لگے۔ آپس کی مُدّت کی دُشمنیاں اُن کے کلام سے دُور ہو گئیں۔ بہتوں میں صُلح صفائی ہوگئی اور ہر ایک شخص کا دل محبّت اور شُکر گزاری سے معمور ہو گیا۔ یہ جلسہ ڈھائی بجے تک ہوتا رہا۔ رات کے وقت پھر عبادت شروع ہوئی۔ بزرگ میاں صاحب خود عبادت میں ہادی ہوئے۔ اگرچہ دن بھر آندھی اور بارش کا طوفان رہا تاہم لوگ پیش از وقت ہال میں جمع ہو گئے اور تِل بھر جگہ نہ رہی۔

میاں صاحب نے اپنی مدد آپ کے مضمون پر تقریر شروع کی اور برابر دو گھنٹے تک بادل کی گرج اور بجلی کی تڑپ کی طرح جلیبے روح نے اُن کی ہدایت کی بولتے رہے۔ اُن کے الفاظ نہایت چیدہ اور سنجیدہ تھے۔ اُن کے فِقرے بجے تُلے

ہوئے تھے۔ اُنھوں نے عام فہم لیکن مؤثّر کہانیوں اور تمثیلوں کے ذریعے جماعت پر اِس اہم مضمون کے مختلف تاریک پہلو روشن کر دیئے۔ گو اُن کا اندازِ بیان سادہ تھا لیکن تقریر ہنگامہ آرا تھی۔ سُننے والوں پر رِقّت طاری ہوگئی۔ اُن کے دل پگھل گئے اور لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ جلسے کے ہال کا نقشہ "بوکیم" کا سا ہو گیا۔[a] لوگوں نے رو رو کر اپنی غفلتوں، کمیوں اور کوتاہیوں کا اقرار کیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ وہ اپنی ذمّے داریوں کو نبِاہیں گے اور اپنی زندگیوں کو اپنے نجات دہندے مسیح کی خدمت میں گزاریں گے۔

یہ جلسہ رات کے ڈیڑھ بجے تک ہوتا رہا۔ لوگ اُٹھنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ جوشِ عقیدت سے سب یہی چاہتے تھے کہ بزرگ میاں صاحب بولتے جائیں اور وہ اُن کے قدموں میں بیٹھے سُنا کریں۔ سب حاضرین اُن کے خاندان سے واقف تھے اور اِس سے بھی واقف تھے کہ نارووال کے مسلمان اُن کے والد کا کتنا احترام کیا کرتے تھے۔ ایسے خاندان کے چشم و

---

[a] قضاۃ 5:2

چراغ کا عیسائی ہو کر فقیرانہ لباس میں ننگے پاؤں پِھرنا اور بھیک مانگنے سے نہ شرمانا، خود ایک ایسا سبق تھا جو جلسے میں سب کے دلوں کو مجروح کر رہا تھا۔ اُن کی زندگی سب کے لئے ایک چلتی پِھرتی زندہ ملامت تھی۔ گو اُن کے الفاظ سیدھے سادے تھے، لیکن وہ اُن کے دل سے نکلتے تھے اور سُننے والوں کے دلوں پر چوٹ لگا کر بے ساختہ ہیجان پیدا کر رہے تھے۔ سب کے دلوں میں ولولے اُٹھ رہے تھے اور سب خادمانِ دین کا یہی جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اُن کے چیلے بن جائیں۔ لیکن بزرگ میاں صاحب چاہتے تھے کہ وہ مسیح کے حقیقی چیلے بنیں۔

اِس اجلاس میں خود مجھے بڑی برکت ملی۔ میرا پکّا ارادہ ہو گیا کہ مَیں مشن کی تنخواہ چھوڑ دوں گا اور جو کچھ مجھے جماعت سے ملے گا اُس پر قناعت کروں گا۔ مَیں یہی دُعا کرتا تھا کہ خدا میری رفیقۂ حیات کو یہ توفیق دے کہ وہ میرے ساتھ اتّفاق کرے۔ لبّھو مل اور ملو چند نے بھی خدا سے وعدہ کر دیا کہ وہ جب سیمنری کو چھوڑ کر انجیل جلیل کی خدمت پر مامور ہوں

گے تو وہ بھی مشن سے ایک کوڑی تنخواہ نہیں لیں گے بلکہ جو جماعتوں سے ملے گا اُس پر ہی گُزارہ کریں گے۔

اگلے روز پھر جلسہ ہوا جس میں بزرگ میاں صاحب نے وعظ فرمایا۔ اُن کی شُعلہ انگیز تقریر کے تاثّرات نے سب سامعین کے ایمان کو مستحکم کر دیا اور اُن کے ارادوں کو جو وہ خدا کے حضور کر چکے تھے تقویّت دی۔

نڈالہ

جلسہ برخاست ہونے سے پہلے اعلان کیا گیا کہ آج رات کو جلسہ میرے گاؤں موضع نڈالہ میں ہو گا اور میاں صاحب اپنے ساتھیوں سمیت وہاں جائیں گے۔ حاضرین میں سے جو خوشی سے جانا چاہے وہ بھی وہاں پہنچ جائے۔ چنانچہ جلسے کے بعد بزرگ میاں صاحب اپنے ہم راہیوں اور بہت سے اَور لوگوں کے ساتھ میرے اور میری بیوی کے ہم راہ ہمارے گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں حسبِ معمول وہ کتابِ مقدّس کی آیات اور مقامات کو سمجھاتے اور اُن کے نکات

و رموز بتاتے رہے۔ جب ہم نڈالہ پہنچے تو مَیں نے آدمیوں کو قریب کے گاؤں میں بھیجا تاکہ وہاں کے عیسائیوں کو بزرگ میاں صاحب کی آمد کی اطلاع ہو جائے۔

اِس اچانک اورغیرمعمولی جلسے کی خبرسُن کر بہت سے مسیحی جمع ہو گئے۔ رات کے کھانے کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ اگرچہ ہم پیدل سفر کرنے کی وجہ سے اور گاؤں کے عیسائی دن بھر کی محنت اورمشقّت سے تھکے ہوئے تھے تاہم ہرشخص اُن کی تقریر سُننے کا خواہش مند تھا۔ عبادت کے شروع میں گیت اور زبور گائے گئے۔ بڑی دل سوزی سے دُعائیں ہوئیں اورمیاں صاحب نے پنجابی میں سادہ لیکن ایسا پُرمعنی درس دیا جس نے حاضرین میں بے خودی پیدا کر دی۔ وعظ کے بعد اُنہوں نے لوگوں کو دُعا مانگنے کے لئے کہا اور چند ایک نے دلی درد کے ساتھ دُعائیں کیں۔ چونکہ رات بہت گُزر چکی تھی اُنہوں نے برکت کا کلمہ پڑھ کر سب کو رُخصت کیا۔

اگلے روز صبح کے وقت پاک کلام کی تلاوت کے بعد جلسہ شروع ہوا جو تمام دن ہوتا رہا۔ لوگ صرف روٹی کھانے اور

ضروری حاجات سے فارغ ہونے کے لئے چند لمحوں کے لئے جلسے میں سے اُٹھ کر گئے۔ سارا دن خدا کی حمد و تعریف کے زبور اور گیت گانے میں، دُعائیں مانگنے میں، کلامِ پاک کا غور و فکر سے مطالعہ کرنے میں صَرف ہوا۔ بزرگ میاں صاحب نے بہت سے لوگوں سے شخصی طور پر مُلاقات کر کے اُن کی روحانی مُشکلات کو حل کرنے میں اپنا وقت گُزارا۔

جب شام ہوئی تو لوگوں نے جلدی جلدی اپنے کھانے وغیرہ کو ختم کیا تاکہ جلسے میں شرکت کریں۔ مقررہ وقت سے بہت پہلے جماعت کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو گئی۔ بُزرگ میاں صاحب دُعا مانگنے کے لئے باہر ویرانے میں چلے گئے تھے۔ جب واپس آئے تو عبادت شروع ہوئی۔ اُس رات اُنہوں نے ایک مختصر سی تقریر کی جس سے لوگ بہت متاثّر ہوئے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ آج دُعا کے وقت مجھے یہ ہدایت ہوئی ہے کہ مَیں اِس سے زیادہ نہ بولوں تاکہ آپ سب زیادہ وقت دُعا اور مناجات میں صَرف کریں۔ خدا کی حمد و تعریف کے گیت بُلند آواز سے گائیں۔ ایک دوسرے کو اپنے روحانی

تجربوں سے مستفید کریں۔ ایک دوسرے کو نصیحت دیں۔ اور میری بجائے خدا کا روح آپ کا ہادی ہو۔ یہ کہہ کر جناب میاں صاحب فرش پر بیٹھ گئے۔

چند منٹوں تک کامل خاموشی طاری رہی۔ اِس کے بعد بہتوں نے اُن برکتوں کا بیان کیا جو خدا نے اُنہیں اُس ہفتے میں بخشی تھیں اور اُن کے لئے خدا کا شُکر کیا۔ بعض نے نصیحت کے چند فِقرے ٹوٹی پھوٹی زبان میں کہے جن کا حاضرین پر بہت اثر ہوا۔ کسی نے کوئی آیت پڑھی جو حسبِ موقع تھی۔ کسی نے درخواست کی کہ میرے ساتھ فلاں زبور یا گیت گایا جائے۔ اگرچہ اکثر لوگوں نے کچھ نہ کچھ کہا لیکن جلسے میں کسی قسم کا شور یا غوغا نہ ہوا اور نہ کسی قسم کی گڑبڑ مچی۔ ہر ایک کا دل خدا کی نجات کے باعث شادمان تھا۔ مگر نہ جذبات کا مظاہرہ ہوا اور نہ جذباتی نعرے لگائے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روح القدس کے زیرِ اہتمام ہر بات قرینے سے ہو رہی ہے۔ عبادت کا یہ حصّہ بڑا جلالی اور نہایت سنجیدہ اور شان دار تھا۔ عبادت کے آخر میں ایک شخص نے درخواست کی کہ

میرے ساتھ سولھویں زبور کا پہلا حصّا گایا جائے۔ جماعت کھڑی ہوگئی اور بلند آواز سے روحانی جوش میں معمور ہو کر یہ زبور گانے لگی۔ جب اِن آیات پر پہنچے کہ ے

> تُوں میراث ہے میری، میرا تُو پیالہ،
> جیہڑا میرا حصّہ، اوہدا تُوں رکھوالا
> تھاں ہے ملیا گیا، میرے واسطے جیہڑا
> اوہ ہے جگہ سوہنی، سُتھرا حصّہ میرا

اُس وقت مَیں اُن برکتوں کے لئے جو مجھے ملی تھیں خدا کا شکر کر رہا تھا اور خاص کر اِس بات پر خوشی کر رہا تھا کہ خدا نے میرے دل میں اپنی مدد آپ کا پاسبان ہونے کا ارادہ پکّا کر دیا ہے اور میری بیوی کو بھی میرا ہم خیال بنا دیا ہے۔ مَیں خوشی سے جھوم جھوم کر گا رہا تھا اور میرا دل مجھ میں نہایت مسرور تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا کوئی نادیدنی طاقت اور زور آور ہاتھ مجھے عالَمِ بالا کی جانب اُٹھا رہا ہے۔ میرے دہنے ہاتھ ایک خادم نے میرے چہرے پر غیر معمولی خوشی کے آثار دیکھ کر مجھ سے پوچھا، "بھائی جی، کیا ہوا ؟"

مَیں نے اُسے کہا، "بھائی، اِس وقت میرا دل خداکی بے شمار برکتوں کے باعث بے بیان خوشی سے معمور ہو رہا ہے۔ اورمیری روح خداکی شکرگُزاری میں خوش وخُرّم ہو رہی ہے۔"

جب زبور کا گانا ختم ہوا تو احسان اللّٰہ نے ایک مختصرلیکن مؤثّر دُعاکی اور برکت کے کلمے سے جماعت کو رُخصت کیا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، مگر میاں صاحب گھر سے باہر دُعا کرنے کے لئے نکل گئے اور تمام رات دُعا میں گُزار دی۔ جب مُرغ نے بانگ دی تو وہ گھر کے اندر آئے۔ اُن کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔ تھکاوٹ کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ اُن کا چہرہ فرشتے کے چہرے کی طرح نورانی تھا اور چمک رہا تھا۔[a]

شکرگڑھ

یہ دن[b] پنجاب کی جماعت میں ایک تاریخی دن ہے۔ اُس روز میاں صاحب، مِس کیمبل، سیالکوٹ کی سیمنری کے طلبا

---

a بمقابلہ خروج 29:34

b یعنی 24 اگست 1896ء

اور بہت سے مردوں اور عورتوں کے ساتھ شکر گڑھ کی طرف روانہ ہوئے جو آٹھ میل پر واقع ہے۔ ہم سب بھی اُن کے ہم راہ ہو لئے اور راہ میں میاں صاحب کی روحانی برکات میں حصّہ دار ہوئے۔ ہم سب پیدل تھے لیکن مقررہ وقت پر جلسے میں پہنچ گئے، کیونکہ بزرگ جناب کو وقت کی پابندی کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ یہ اُن کی عادت میں داخل تھا کہ وقت کے پابند رہیں، اور تا حیات یہی اُن کی عادت رہی۔ جلسہ میاں صاحب کی زیرِ صدارت شروع ہوا۔ اُنہوں نے دُعا اور گیت کے بعد ایک مختصر لیکن پُر تاثیر تقریر کی اور کل کی عبادت کی طرح جلسے کی کار روائی کو حاضرین پر چھوڑ دیا تاکہ وہ روح القدس کی زیرِ ہدایت دُعائیں کریں، اپنے تجربے لوگوں کو سُنائیں، حمد و ستائش کے گیت اور زبور گائیں اور کتابِ مقدّس کی آیات کو پڑھ کر ایک دوسرے کو نصیحت دیں۔

جب وہ بیٹھ گئے تو بہتوں نے مختصر طور پر اُن برکتوں کا ذکر کیا جو اُنہوں نے خدا سے اِن ایّام میں پائی تھیں اور بڑی سنجیدگی سے اپنے آپ کو نئے سرے سے خدا کی اور انجیل کی

دل و جان سے خدمت کرنے کے لئے مخصوص کیا۔ بعض نے دُعائیں اور مناجاتیں کیں، اور بعض نے خدا کی تمجید کے گیت اور زبور گائے۔

اُس وقت میری بیوی اُٹھی اور کلام اللہ میں سے آستر 16:4 پڑھی،

> (مَیں) بادشاہ کے پاس جاؤں گی، گو یہ قانون کے خلاف ہے۔ اگر مرنا ہے تو مر ہی جاؤں گی۔

اُس کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ وہ جماعت کی طرف متوجّہ ہو کر جماعت کی غُربت وناداری اور اپنی مدد آپ کی ضرورت کا ذکر کرکے بولی، "چونکہ جماعت کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا لازمی ہے گو وہ اپنے افلاس کی وجہ سے ہماری موجودہ تنخواہیں نہیں دے سکتی پھر بھی مَیں نے اور میرے خاوند نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ہم مشن کی تنخواہ کو چھوڑ دیں گے اور خدا کی مدد سے اُس آمدنی پر کفایت کریں گے جو ہم کو جماعت سے ملے گی، خواہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو۔ مَیں اپنی زندگی ہاتھوں

میں لے کر بادشاہ کے پاس جاؤں گی۔ اگر ایسا کرنے سے مَیں ماری گئی تو ماری گئی۔ آپ سب ہمارے لئے دُعا کریں۔"

جماعت پر خاموشی طاری ہوگئی۔ پھر چند منٹوں کے بعد ایک شخص اُٹھا لیکن رِقّت کے غلبے کی وجہ سے کچھ بول نہ سکا اور "بھائیو" کہہ کر زار زار رونے لگا۔ اُس کے ساتھ ساری جماعت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بزرگ میاں صاحب نے کلامِ پاک میں سے آیات سُنائیں اور ایمان داروں کی مثالیں دیں جن کا ایمان ہر آزمائش میں ثابت قدم رہا۔ تب جماعت کے بہت سے لوگوں نے ہمارے واسطے دُعائیں کیں۔

دُعا کے بعد ایک خادمِ دین نے بڑے جوش سے کہا، "مَیں بہت چاہتا ہوں کہ جماعت میں اپنی مدد آپ کی تحریک کو ترقی ملے، لیکن گنڈا مَل ہم سب سے زیادہ دلیر ہیں۔ میرا جی تو بہت کرتا ہے کہ مَیں بھی اُن کی طرح ساری تنخواہ قربان کر دوں، لیکن حالات سے لاچار ہوں۔ چنانچہ مَیں اپنی تنخواہ کا تیسرا حصّہ چھوڑ دیتا ہوں۔"

ایک اور خادمِ دیس نے اُٹھ کر کہا، "مَیں تنخواہ تو نہیں چھوڑ سکتا، پر اپنا سفر خرچ چھوڑ دوں گا اور آئندہ خود اپنے خرچ سے جماعتوں میں پِھرا کروں گا۔"

ایک شخص نے کہا، "مَیں اپنی مدد آپ کی تحریک کی ترقی کے لئے اپنی تمام آمدنی کا دسواں حصّہ دیا کروں گا۔"

اِس طرح جلسے کے اکثر حاضرین نے خود انکاری اور ایثار کے وعدے خدا کے حضور کئے۔ تمام جماعت کے چہروں پر بشاشت اور خوشی نظر آتی تھی، کیونکہ اُن کے دل مسرور تھے۔ چاروں طرف سے خدا کی تمجید اور تعریف کی آوازیں بلند ہوئیں۔

میاں صاحب کے چہرے پر ایک خاص قسم کی خوشی نظر آتی تھی جو روح القدس کی طرف سے تھی۔ اُن کا چہرہ ایک عجیب نُور سے چمک رہا تھا۔ اُنہوں نے کھڑے ہو کر فرمایا، "بھائیو، یہ وقت خدا باپ کا خداوند مسیح کے وسیلے شکر کرنے کا وقت ہے جس نے اپنا روح بخش کر ہمارے دلوں میں نیک ارادے ڈالے ہیں۔ ہم سب پر واجب ہے کہ بھائی گنڈا مل اور اُن کے خاندان کے لئے خاص طور پر دُعا کریں جنہوں نے دُعا

کے بعد خدا کی مرضی کو معلوم کر کے سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ ہم اپنے تجربے سے جانتے ہیں کہ خدا اُن کی ہر مُشکل کو آسان کرے گا۔ ہم باقی بھائیوں کے لئے بھی دُعا کریں جنہوں نے خدا کے حضور وعدے کئے ہیں کہ خدا اُن کے ارادوں کو مضبوطی بخشے۔"

اِس کے بعد اُنہوں نے ایسی دُعا کی جو دل سے نکلتی تھی، کیونکہ اُنہوں نے اپنی کوششوں کو پھلدار ہوتے دیکھا تھا۔ شکر گزاری اور حمد کے زبور گائے گئے اور پھر حاضرین کی زندگیوں کی تقدیس کے لئے دُعائیں کی گئیں۔ آخر میں بزرگ میاں صاحب نے سب کو برکت دے کر جلسہ برخاست کیا۔

دوسرے روز صبح سویرے پھر جلسہ شروع ہوا۔ احسان اللہ نے نہایت سنجیدگی سے ایک ایسا درس دیا جو سُننے والوں کو عمر بھر نہ بھولا۔ جماعت کا دل جوشِ عقیدت سے معمور تھا۔ سب اُن کی طرف ٹکٹکی لگائے بڑے غور سے اُن کے الفاظ کو سُن رہے تھے۔ سب محسوس کر رہے تھے کہ وہ نہیں بلکہ روح القدس اُن کے ذریعے ہم سے کلام کر رہا ہے۔ یہ آخری جلسہ

تھا، اور لوگ اُن کے ایک ایک لفظ کو محویّت کے عالَم میں آ کر اپنے دلوں میں جگہ دے رہے تھے۔ کیونکہ اُن کے الفاظ انجیل شریف کے حقیقی ترجمان ہو کر جلسے میں آب و رنگ پیدا کر رہے تھے۔ جذباتی نعروں کے بلند ہونے کے بجائے دل سے دُعائیں اور شکر گُزاریاں اُٹھ رہی تھیں جو اُنہیں خدا کی محبّت کی قُربت میں لے جا رہی تھیں۔ میاں صاحب کے جذبات کا بے ساختہ اظہار، اُن کی شکر گزاری کی گرمی اور گداز کے الفاظ لوگوں کے دلوں کو فردوس کی جانب اُڑائے لئے جا رہے تھے۔

اُن کے وعظ کے بعد حمد و تعریف کے گیت اور زبور گائے گئے۔ اِس کے بعد جماعت کے چند لوگوں نے ایک دوسرے کی ہمّت بڑھائی اور ایمان کی مضبوطی اور ارادوں کی تکمیل تک پہنچانے کی نصیحت کی۔ یہ جلسہ دوپہر تک جاری رہا۔ آخر کار احسان اللہ نے دُعا اور کلماتِ برکت سے جماعت کو رُخصت کیا۔ جلسے کے بعد ایک شخص نے جس کا ہمیں گُمان بھی نہ تھا سب کو کھانے کی دعوت دی۔ سب نے مل کر اُسے بڑی

خوشی کے ساتھ کھایا۔ اگرچہ کھانا سادہ اور بغیر کسی قسم کے تکلّف کے تیار کیا گیا تھا پھر بھی ہم اُسے عمر بھر نہ بھولے۔ کیونکہ وہ پیار کے ساتھ تیار کیا گیا تھا۔ باہمی محبت اور میل ملاپ نے اُسے لذیذ اور مرغوب کر دیا تھا۔ وہ حقیقی پریم بھوجن تھا جس کو ہم کبھی نہ بھولے۔ چنانچہ 53 سال کے بعد جب مِس کیمبل فروری 1949ء میں مجھے گورداس پور میں ملیں تو شکر گڑھ کے جلسے کا ذکر کرتے ہوئے بولیں، "بھائی جی، آپ کو شکر گڑھ والا کھانا یاد ہے؟" مَیں نے جواب دیا، "بے شک، اُس محبت کی ضیافت کو کون بھول سکتا ہے؟"

کھانے کے بعد سب لوگ خوشی اور برکت، پیار اور محبت سے آپس میں بغل گیر ہو کر اپنے اپنے گاؤں کو چلے گئے۔ سب اپنے اپنے علاقوں اور گاؤں میں اُن برکتوں کا چرچا کرنے لگے جو اُنہیں اُس ایک ہفتے کے دوران ملیں۔ ہر جگہ جلسے ہوتے گئے اور جماعتوں میں روحانی بیداری کی لہر چل پڑی۔ لوگ جگہ جگہ خدا کے حضور گزشتہ گناہوں سے توبہ کر کے

نئی زندگی بسر کرنے کا وعدہ کرنے لگے۔ نیم جان پژمُردہ روحوں میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔

اپنی مدد آپ کی جو تحریک شکر گڑھ کے جلسے میں شروع ہوئی تھی وہ دن بہ دن زور پکڑتی اور ترقی کرتی گئی۔ دیہات کی جماعتوں کے عیسائی دل و جان سے خدا کے کام اور خدمت میں حصّہ لینے لگے۔ وہ دل کھول کر اپنے خادمانِ دین کی مالی مدد کرنے لگے۔ نہ دینے کے رجحان اور کنجوسی کو ہر جگہ شکست ہونے لگی، اور عیسائی خدا کے گھر میں عبادت کے وقت اچھے سے اچھے نذرانے اور قیمتی سے قیمتی ہدیئے لانے لگے۔ خادمانِ دین کے بھی حَوصلے بُلند ہو گئے، اور وہ جماعت کے لوگوں کو دل و جان سے کلامِ پاک کی تعلیم دینے اور ذوق وشوق سے انجیل سُنانے لگے۔ ہر کام محنت، محبت اورجاں فشانی سے ہوتا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے بھی اُن کے کام میں کامیابی اور اُن کے کلام پر برکت بخشی۔

شکر گڑھ کے جلسے کے بعد مِس کیمبل دیگر عورتوں اور مردوں سمیت سیالکوٹ چلی گئیں۔ وہاں جا کر اُنہوں نے اُن

واقعات کا ذکر کیا جو ظفروال، نڈالہ اور شکر گڑھ میں خدا کے روح کے ذریعے ظہور میں آئے تھے۔ جس کسی نے اُنہیں سُنا اُس نے خدا کا شکر کیا کہ اب پنجاب کی جماعت مغرب کی مالی امداد سے آزاد ہو کر اپنے پاؤں پر آپ کھڑی ہو جائے گی۔ ساتھ ساتھ مغربی جماعتوں کی پابندیوں کی زنجیریں بھی ٹوٹ جائیں گی اور جماعتیں آزاد ہو جائیں گی اور خداوند کی قُدرت سے معمور ہو کر زندگی بسر کریں گی۔ ہاں، وہ غیر مسیحیوں کو مسیح خداوند کے قدموں میں لا کر اُنہیں ابلیس کی غلامی سے رہائی دیں گی۔ جو اِن جلسوں کے حالات سُنتا وہ خدا کا شکر کرتا کہ اُس نے احسان اللہ جیسا شخص پنجاب میں برپا کیا ہے جو موسیٰ کی مانند بنی اسرائیل کو غلامی سے نکال رہا ہے۔ گنڈا مل لکھتے ہیں،

موسمِ سرما کے شروع میں گورداس پور کی جماعت نے احسان اللہ کو اور مجھے بُلایا۔ ہم دونوں میاں صاحب کے دو چیلوں کے ہم راہ وہاں پہنچے۔ جلسے شروع ہوئے۔ میاں صاحب کی

اعلیٰ روحانیّت کے پُر جوش وعظوں نے ایک عجیب سماں باندھ دیا۔ اُن کے الفاظ میں ابدی کشش تھی، کیونکہ وہ ابدی زندگی کی باتیں کرتے تھے۔ اُن کی ہیجان انگیز تقریروں نے لوگوں کے دلوں میں ولولہ پیدا کر دیا۔ سب چھوٹے بڑے، گناہوں سے قائل ہوکر نادم اور پشیمان ہو رہے تھے۔ اُنہوں نے رو روکر بڑی فروتنی کے ساتھ خدا کے حضور اپنے گناہوں کا اقرار کیا۔ جماعت کی مُدتوں کی پژمُردہ اور ٹھنڈی پڑی ہوئی محبّت دوبارہ زندہ ہوگئی، اور میاں صاحب کے شُعلے دار وعظوں کی گرمی نے اُس میں جان ڈال دی۔ سُستی اور غفلت نے پچھاڑ کھائی اور شیطانی فوج کو ہر طرف شکست ملنے لگی۔ حاضرین کے دل روحانی جوش سے بھر گئے، اور شہری اور دیہاتی عیسائیوں نے خدا کے حضوری نئی زندگی گزارنے کا پکّا وعدہ کیا۔ انجیل کے مبلّغین نے از سرِنَو دل و جان سے نجات کی خدمت کرنے کا علانیہ طور پر مصمّم ارادہ ظاہر کیا۔ جلسے کے چاروں طرف لوگوں کے چہروں پر وہ خوشی نظر آ رہی تھی جو گناہوں سے رہائی پانے کا لازمی نتیجہ ہے۔ سب جماعتوں کے

لوگ جو گورداس پور میں جمع تھے خدا کا شکر کر کے وعدہ کرنے لگے کہ وہ اپنی زندگیوں کو مسیح کے لئے مخصوص کر کے اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو بھی مسیحی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیں گے بلکہ ہندوؤں مسلمانوں کو انجیل کا پیغام سُنائیں گے۔

گورداس پور سے واپس آ کر احسان اللہ نارووال کے علاقے کے دیہات میں نکل گئے۔ وہ جہاں جاتے تھے خدا کا پاک روح اُنہیں استعمال کرتا تھا۔ اُن کے جلسوں کے نتائج ایسے کام یاب اور شان دار تھے کہ اُنہیں پڑھ کر بے اختیار آنکھوں کے سامنے رسولوں کے اعمال کی کتاب کے ابتدائی ابواب کا سماں بندھ جاتا ہے۔ جب رابرٹ کلارک نے دسمبر میں نارووال جا کر اِن واقعات کو اپنے کانوں سے سُنا اور آنکھوں سے دیکھا تو وہ خدا کا شکر بجا لائے۔ اُنہوں نے اُس وقت لکھا،

خدا نے احسان اللہ کو بُلایا ہے تاکہ وہ نارووال کو اپنا صدر مقام بنا کر جگہ جگہ جائیں، جماعتوں کو جگائیں اور اُن کی پژمُردہ زندگیوں کو از سرِ نَو شگفتہ کریں۔ یہاں اردگرد کے چرچ مشن کے گاؤں میں بھی ڈیڑھ ہزار کے قریب عیسائی بستے ہیں جن کی زندگیوں میں وہ خدا کے فضل سے جان ڈال سکتے ہیں۔

سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے،

خدا نے احسان اللہ کو نارووال اور اُس کے اردگرد کے دیہات میں عجیب طور سے استعمال کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی تنخواہ چھوڑ دی ہوئی ہے، کیونکہ وہ اِس بات کو زیادہ پسند کرتے ہیں کہ ہندوستانی جماعت اُن کے اخراجات برداشت کرے۔ امریکن مشن کی ایک خاتون لکھتی ہیں، "مَیں نے اپنی زندگی بھر ایسی روحانیّت کہیں نہیں دیکھی جیسی سیالکوٹ ضلع میں دیکھی ہے۔ اِس روحانی زندگی کا سہرا نارووال کے احسان اللہ کے سر پر ہے جس نے اپنا سب کچھ مسیح پر نثار کر دیا ہے۔ اُس کے وعظوں میں قُدرت ہے۔ سخت دلوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ گناہ گاروں کے سینے

زخمی ہو جاتے ہیں، اور وہ بے خودی کے عالَم میں اپنے اُن گناہوں کا اقرار کرتے ہیں جو پہلے کبھی سُنے نہ گئے تھے۔ ہمارے علمِ الہٰیات کے طلبا اِس قدر متأثّر ہوئے ہیں کہ وہ ہر رات کو جلسے کرتے ہیں۔ اُن کے دلوں میں روحوں کے لئے ایک غیر فانی تڑپ پیدا ہوگئی ہے۔"

دہلی تک کا دورہ

کرسمس کے ایّام بٹالہ میں اپنے خاندان میں کاٹ کر احسان اللہ نے جنوری 1897ء کے شروع میں پنجاب کے شہروں اورقصبوں کی جماعتوں کی جانب رُخ کیا۔ وہ امرتسر، جالندھر، ہوشیار پور، لُدھیانہ، انبالہ اور دہلی وغیرہ شہروں میں گئے۔ اُنہوں نے اِن جگہوں کی جماعتوں میں اُن کی بیداری کے لئے جلسے کئے۔ تمام پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ اور دہلی کے صوبوں میں دُور دُور تک اُن کی شُہرت پھیل چکی تھی۔ اخباروں میں اُن کے جلسوں کے ٹھوس نتیجوں کا ذکر

عموماً ہوتا رہتا تھا۔ اُن دنوں میں رجب علی امرتسر سے اخبار "سفیرِ ہند" نکالتے تھے اور لُدھیانہ سے ویری صاحب اخبار "نور افشاں" شائع کرتے تھے۔ اِن دونوں اخباروں کے وسیلے اور سیالکوٹ، گوجرانوالہ کے اضلاع کے ایمان داروں کے خطوط وغیرہ کے ذریعے شہروں کی جماعتیں اُن کے کام سے خوب واقف تھیں۔ چنانچہ وہ جس قصبے اور شہر میں گئے اُن کا خیر مقدّم نہایت تپاک کے ساتھ کیا گیا۔

امرتسر کے ایمان داراُن کے تبلیغی جوش اور روحانی زندگی کو جانتے تھے۔ جالندھر میں گولک ناتھ اور دیگر سربراہ اصحاب بیگم احسان اللہ کی وجہ سے اُن کے دوست اوردُور کے رشتے دار تھے۔ ہوشیار پور میں اُن کے دیرینہ دوست ڈاکٹر دینا ناتھ پریتو دِتّا تھے جو پنجاب مشنری سوسائٹی کے سیکرٹری بھی تھے جو اُن کے خاندان کی قلیل آمدنی کا ذمّہ اُٹھا چکی تھی۔ لُدھیانہ میں ویری صاحب جیسے زبردست مشنری، جوشیلے مبلّغ اور زور آور عالِم تھے جو میاں صاحب کے بڑے مدّاح

تھے۔ انبالہ میں امریکن مشن کے غیور مشنری رہتے تھے۔ دہلی میں اُن کے پرانے ہیڈ ماسٹر بھولا ناتھ گھوش کے فرزند ایس۔اے۔سی گھوش خادمِ دین تھے۔ وہاں ایس۔ ایس آلنٹ اور لیفرائے جیسے تبلیغی اور روحانی جوش سے بھرے ہوئے مشنری بھی رہتے تھے۔ اِن اور دیگر اصحاب نے اُن کی آمد پر بڑی خوشی کی اور اپنے اپنے شہروں میں بڑے اہتمام کے ساتھ جلسے کیئے۔

سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے اضلاع کے جلسوں کی طرح اِن شہروں کے جلسے بڑے کام یاب ثابت ہوئے۔ احسان اللہ کی تقریروں نے ہر جگہ آگ لگا دی۔ یہ جماعتیں اپنے خادمانِ دین کے میکانکی خُشک بیان وعظوں کی عادی ہو چکی تھیں۔ اُن کے خادمانِ دین کی زبانیں مخمل کی طرح نرم تھیں۔ اُن کے الفاظ کی تراش میں شاعرانہ مرّصع سازی اور مختلف قسم کی رنگینیاں ہوتی تھیں۔ لیکن میاں صاحب جلی کٹی

سُنائے بغیر کھری کھری باتیں کرتے تھے۔ اُن کی صاف گوئی میں محبت کی جھلک تھی۔ اُن کے چُنے تُلے مگر سادے الفاظ میں بجلی کی تڑپ تھی۔ اُن کے جذبات کے اظہار میں بَلا کی گرمی تھی۔ اُن کی تقریریں شُعلہ اثر تھیں، کیونکہ روح القدس کی آگ اُن کا اصلی اور حقیقی سرچشمہ تھی۔ یہ جماعتیں گہری نیند سو رہی تھیں، اور اُن کا پچھلا حال پہلے سے بدتر ہو رہا تھا، کیونکہ یہ اِس دُنیا کی آلودگی سے بچ نکلے تھے

> بعد میں ایک بار پھر اِس میں پھنس کر مغلوب ہو گئے تھے۔ (2۔پطرس 2:20)

احسان اللّٰہ نے اِن جلسوں میں اُن کی ذمے داریوں کو اُنہیں یاد دلایا اور تبلیغ کی ضرورت کی جانب اُن کی توجّہ دلا کر اُنہیں "انگریزیّت" کے نتائج سے آگاہ کیا۔ اُنہوں نے اُنہیں مغرب کے عیسائی فرقوں کی پابندیوں اور زنجیروں سے آزاد ہونے اور ہندوستانی ایمان داروں کو مُتحد ہو کر غیر مسیحی فرقہ

بندیوں سے جنگ کرنے کی ضرورت پر ہنگامہ خیز تقریریں کیں جن سے ہر شہر اور قصبے کے لوگ نہایت متأثّر ہوئے۔ کیونکہ یہ تلخ حقائق ایک ایسے شخص کی زبان سے نکلتے تھے جو خود سب کچھ چھوڑ کر فقیرانہ لباس میں ننگے پاؤں کھڑا اُن سے باتیں کرتا تھا۔ میاں صاحب اِس بات پر ہر شہر میں زور دیتے تھے کہ جماعتوں کو مغرب کے روپئے سے آزاد ہو کر خود اپنے اخراجات کا بوجھ اُٹھانا ہے، ورنہ وہ آزاد اور مختار نہیں ہو سکتیں۔ یہی عمل اُنہیں زندہ رکھے گا۔ جب تک مغرب کا روپیہ ہے جماعت بندر کی طرف قلندر کے اشاروں پر ناچتی رہے گی۔ اُنہوں نے جا بہ جا علانیہ کہا کہ جماعتوں کے لئے یہ از حد ضروری ہے کہ وہ مغرب کے خیالات کی بھڑکیلی پوشاکیں اُتار پھینکیں اور مسیح کے عقائد کا نئے سرے سے مطالعہ کر کے ہندوستان کے خیالات اور تہذیب و ثقافت کے مطابق اُنہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے سامنے پیش کریں

تاکہ جو عقائد اب پیچیدہ معمّے خیال کرکے رد کئے جاتے ہیں وہ ہندی اور اسلامی فلسفے کی روشنی میں قابلِ قبول ہوسکیں۔

میاں صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ مسیح کا ایمان ہندو اور مسلم تہذیبوں کا سنگم ہے جس طرح الہ آباد میں گنگا اور جمنا دریاؤں کا سنگم ہے اور کہ ہندو فلسفہ اور اسلامی خیالات صرف مسیحی ایمان کے گہوارے میں ہی صحیح نشوونما پا سکتے ہیں۔ جس طرح یہودیّت پولس رسول کے لئے مسیح تک لانے میں اُستاد بنی اُسی طرح قرآن اور اُپنشد ہندوستان کے لوگوں کو انجیل تک لا سکتے ہیں۔ اِس سے ناظرین پر ظاہر ہوگیا ہو گا کہ اجتہادِ فکر اور تجدیدِ اسلوب احسان اللہ کی ہمہ گیر خصوصیّت تھی۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ باتیں شہر کی جماعت کے علم دوست عیسائی ہی کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ ایسے طبقوں سے آئے ہیں جن کا پس منظر اسلامی اور ہندی فلسفہ ہیں۔ اُن میں سے بعض بڑے زبردست عالِم ہیں جو خود ہندو مت اور

اسلام کے عقائد کو پرکھ کر مسیحی ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ اِس عظیم کام کو سرانجام دینے کے اہل بھی ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ گاؤں اور دیہات کے مسیحی جو الف۔بے سے بھی ناواقف ہیں اِس پیچیدہ چیلنج کو سر نہیں کر سکتے۔

یہ جلسے قابلِ یادگار تھے، کیونکہ گو مختلف جماعتوں کے سربراہ اِن باتوں کو محسوس کر کے آپس میں بحث کرتے رہتے تھے کہ کیا کریں، لیکن میاں صاحب سے پہلے کسی نے جگہ جگہ جا کر جلسوں میں علانیہ ایسی صاف گوئی سے اِن مضامین پر تقریریں نہیں کی تھیں۔ اُن کی جوشیلی تقریروں نے ہر جگہ محشر برپا کر دیا، کیونکہ یہ باتیں اُن کے دل سے نکلتی تھیں اور سُننے والوں پر قُدرتاً اثر کرتی تھیں۔ اب جماعت کے راہنماؤں نے اِن باتوں کی طرف توجّہ دے کر چند تجاویز تیار کیں جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔

دہلی کے شریف النفس مشنری میاں صاحب کے لیکچروں سے بہت متاثّر ہوئے۔ خاص کر لیفرائے جو بعد میں لاہور

کے تیسرے بشپ بنے، احسان اللہ کے بڑے مدّاح ہو گئے اور تا حیات اُن کی قدر اور احترام کرتے رہے۔ وہ جب کبھی میاں صاحب کو خط لکھتے تو "برادرِ عزیز" سے شروع کرتے اور "آپ کا محبِ صادق لیفرائے" سے ختم کرتے۔ احسان اللہ دہلی کے دورے میں ایس۔اے۔سی گھوش کے گھر مہمان تھے۔ گھوش لکھتے ہیں،

جب احسان اللہ فقیرانہ لباس میں دَورہ کرتے دہلی آئے تو وہ میرے پاس ٹھہرے۔ اُن دنوں میں میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ مَیں بی۔اے کے بعد ایس۔پی۔جی اور کیمبرج مشن کا ممبر ہو گیا تھا۔ میاں صاحب ننگے پاؤں سادھوؤں کا لباس پہنے میرے پاس آئے۔ اُن کی تقریروں میں غضب کا جوش ہوتا تھا جن کی گرمی اور تیزی مدہوش کر دیتی تھی۔ مَیں اُن کا چیلا ہو گیا۔ میرا محبوب مشغلہ یہی تھا کہ اُن کے قدموں میں بیٹھا رہوں۔ اُن کی باتیں ایسی ہوتی تھیں جیسے آسمان کا کوئی فرشتہ بات کر رہا ہو۔ ایک دن کہیں مَیں نے اُن کے سامنے اپنے بھنگی

کو "او بھنگی" کہہ کر بُلایا۔ بس میری شامت آ گئی۔ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا "اُس کا کیا نام ہے؟"

مَیں نے کہا، "کیوَل۔"

اُنہوں نے مجھے حکم دیا کہ اُسے بُلاؤ۔ وہ آیا اور ہم دونوں کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا۔ اُنہوں نے فرمایا، "تم کُرسی پر سے اُٹھ کر اُس کے ساتھ فرش پر بیٹھو اور اُسے بھائی کیوَل کہو۔"

مَیں نے کہا، "آپ کا فرمان بر سر و چشم۔" مَیں اُس کے پاس بیٹھ گیا اور کہا، "بھائی کیول۔ کہو، طبیعت کیسی ہے۔"

تب اُنہوں نے فرمایا، "اُسے خداوند مسیح کی نجات کی خوش خبری سُناؤ۔"

مَیں نے اُسے بتایا کہ ہمارا خداوند دُنیا میں خدا کا اوتار ہو کر آیا تاکہ جہان کے لوگوں کو شیطان کی غلامی سے نجات دے۔

وہ اِن باتوں سے ایسا متأثّر ہوا کہ اُس روز کے بعد وہ عیسائی ہو کر خداوند میں میرا بھائی ہو گیا۔

مَیں ہمیشہ مغربی تہذیب سے جس نے جماعت میں گھر کر رکھا تھا اور مغربی فِرقوں کی قیود سے بیزار تھا۔ محبِّ وطن ہونے

کی وجہ سے مَیں مختلف مشنوں کی پابندیوں سے اور سِول اور فوجی حکّام اور انگریز مسیحیوں کے دستوروں سے سخت نالاں تھا۔ چنانچہ میاں صاحب کی تقریروں نے میرے دل میں گھر کر لیا اور مَیں اپنے خیالات میں پکا ہو گیا۔ احسان اللہ میں الیاس نبی اور یوحنّا پپتسمہ دینے والے کی روح کارفرما تھی، اور وہ اُن نبیوں کی طرح نِڈر اور بے باک ہو کر صاف گوئی سے کام لیتے تھے۔ اگرچہ اِس قسم کی صاف گوئی مشنری حلقوں میں ویسی ہی ناپسند کی جاتی تھی جس طرح الیاس نبی کی بے باکی شاہِ اسرائیل اخی اب کو اور یوحنا پپتسمہ دینے والے کی صاف گوئی ہیرودیس اور ہیرودیاس کو پسند نہ آئی تھی۔ اُن کی تقریریں ایک آندھی تھیں جو بھوسے کو گیہوں سے جُدا کر دیتی تھیں۔ وہ آگ تھیں جس میں بھوسی جل جاتی تھی۔ خالص دل اُس آگ میں سے خالص سونا ہو کر نکلتے تھے۔ اب تک میاں صاحب جیسا آدمی پنجاب کے مسیحیوں میں پیدا نہیں ہوا۔

بوبک مرالی

شہروں اور قصبوں کا دَورہ کرنے کے بعد احسان اللہ نارووال واپس لَوٹ آئے۔ ایّامِ روزہ میں یو۔پی مشن کے علاقے کے گاؤں بوبک مرالی کی جماعت نے اُنہیں اور گنڈا مل کو دعوت دی۔ یہ گاؤں نارووال سے تقریباً 5 میل کے فاصلے پر ہے۔ مقدّس ہفتہ نزدیک تھا۔ وہاں کے نثار علی صاحب نے اپنے علاقے کے تمام مبشّروں، مبلّغوں، استادوں، دیہات کے مسیحیوں اور اردگرد کے یو۔پی مشن کے علاقوں کے خادمانِ دین کو اکٹھا کر لیا۔ گنڈا مل صاحب لکھتے ہیں،

جب ہم دونوں بوبک مرالی پہنچے تو وہاں ایک بڑی جماعت جمع تھی۔ عبادت شروع ہوئی۔ دُعا کے بعد زبور گائے گئے۔ پھر بزرگ احسان اللہ نے دیہاتی بھائیوں کی سمجھ کے مطابق پنجابی زبان میں خداوند مسیح کی صلیبی موت پر وعظ کرنا شروع کیا۔ اُنہوں نے نجات دہندے کے دُکھ کو جماعت کے

سامنے ایسے درد ناک الفاظ اور لہجے میں پیش کیا کہ سُننے والے بے اختیار رونے لگے۔ وہ نہایت موزوں اور مؤثر مثالوں سے خداوند کی صلیبی موت کا بیان کر رہے تھے، ایسا کہ حاضرین محسوس کر رہے تھے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اُس نظارے کو دیکھ رہے ہیں۔ اُن کا ایک ہی مضمون تھا کہ اگرچہ جہان کا نجات دہندہ ہمارے گناہوں کی خاطر صلیب پر موا توبھی ہم اب بھی اپنے گناہوں سے محبّت رکھ کر اُنہیں اپنے سینوں سے لگائے رکھتے ہیں۔ نہ ہم اُنہیں چھوڑتے ہیں اور نہ ہی اُنہیں ترک کرنا چاہتے ہیں۔ جماعت کے لوگ دہاڑیں مارکر رو رہے تھے۔ خداوند کے دُکھوں کو یاد کرکے وہ آنسو بہا رہے اور اپنے دلوں کو اِن آنسوؤں سے پاک کر رہے تھے۔

جب رونے کی آواز قدرے دھیمی ہوئی تو ایک خادمِ دین اُٹھا۔ لیکن اُس پر ایسی رِقّت طاری تھی کہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ اُس کے آنسو بہتے جا رہے تھے اور وہ آخر میں مجبور ہوکر بیٹھ گیا۔ جماعت کے لوگوں کی نظریں اُن کے اپنے اپنے گناہوں پر لگی تھیں اور تمام لوگ سوگ وار ہوکر خاموش بیٹھے

تھے۔ چند منٹوں کے بعد لوگ دُعا کرنے لگے۔ اُنہوں نے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی اور سچی توبہ کی توفیق مانگی۔ بعض لوگوں نے علانیہ دوسروں کے سامنے اپنی دُشمنی کا اقرار کیا اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر اپنے قصوروں کی مُعافی مانگی اور باہمی میل و محبّت کے ساتھ رہنے کا عہد کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماتم کے بعد گناہوں کی مُعافی کے احساس نے اُن کے دلوں کو روحانی خوشی سے معمور کر دیا۔ جب میاں صاحب نے دُعائے برکت سے جلسہ برخاست کیا تو دیہات کے خادمانِ دین اور دیگر لوگ خدا کی حمد و تعریف کے گیت، زبور اور روحانی غزلیں گاتے ہوئے اپنے اپنے گاؤں کی طرف چلے گئے۔

واعظ کے ساتھ خدمت

اُن ہی سالوں میں رحمت مسیح صاحب واعظ نے چرچ مشن سے قطعِ تعلّق کر لیا۔ اُس وقت وہ بٹالہ میں گف صاحب کے ساتھ کام کرتے تھے۔ گف صاحب نے اُنہیں بہتیرا اُونچ نیچ

سمجھایا مگر اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جب بابو سنگھا کو اِس معاملے کی خبر ہوئی تو اُنہوں نے میاں صاحب کو بُلایا۔ واعظ صاحب نے اُنہیں سب کچھ بتایا کہ کس طرح خدا کے ساتھ اُنہوں نے انجیل کی خدمت کرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے اور اب وہ آزادانہ احسان اللہ کی طرح خدا کی خدمت کریں گے۔ بابو سنگھا اور وارث الدین نے بھی اُنہیں بہتیرا سمجھایا، لیکن سب بے حاصل۔ وہ یہی کہتے گئے ؎

> مت کہو کچھ بھی مسیح یسوع کے مستانے کو
> شمع ساں جلنا سکھاتا ہے وہ پروانے کو

آخرکار پنجاب مشنری سوسائٹی اُن کے بیوی بچوں کے اخراجات کی کفیل ہوگئی، اور وہ بھی سادھوانہ لباس پہن کر خدا کا نام لے کر گھر سے نکل پڑے۔ قبلہ واعظ لکھتے ہیں،

خداوند کے قول پر میرا ایمان پختہ تھا کہ

> مَیں تجھے کبھی نہیں چھوڑوں گا، مَیں تجھے کبھی ترک نہیں کروں گا۔ (عبرانیوں 5:13)

حبقوق نبی کی غزل کے الفاظ میری تسلّی کا باعث تھے،

> ابھی تک کونپلیں انجیر کے درخت پر نظر نہیں آتیں، انگور کی بیلیں بے پھل ہیں۔ ابھی تک زیتون کے درخت پھل سے محروم ہیں اور کھیتوں میں فصلیں نہیں اُگتیں۔ باڑوں میں نہ بھیڑ بکریاں، نہ مویشی ہیں۔ تاہم مَیں رب کی خوشی مناؤں گا، اپنے نجات دہندہ اللّٰہ کے باعث شادیانہ بجاؤں گا۔ رب قادرِ مطلق میری قوت ہے۔ وہی مجھے ہرنوں کے سے تیز رَو پاؤں مہیا کرتا ہے، وہی مجھے بلندیوں پر سے گزرنے دیتا ہے۔
>
> (حبقوق 3:17–19)

قبلہ واعظ بھی احسان اللّٰہ کی طرح جا بہ جا خداوند کی نجات کی منادی کرنے اور جماعتوں کو جگانے لگے۔ بعض اوقات خداوند مسیح کے یہ دونوں عاشق اکٹھے کام کرتے تھے، لیکن

اکثر اوقات ایسا ہوتا تھا کہ اگر ایک پنجاب کی ایک طرف جاتا تو دوسرا دوسرے کونے میں انجیل کی خدمت کرتا تھا۔

کانگڑہ

اپریل 1897ء میں چرچ مشن نے احسان اللہ کو کانگڑہ کے علاقے کی جماعتوں کو بیدار کرنے کی خاطر بُلایا۔ اِن جماعتوں کی دھڑے بازیوں اور باہمی جھگڑوں نے اُن کی روحانی زندگی کو تباہ حال کر رکھا تھا۔ میاں صاحب نے کانگڑہ میں جلسے کیئے۔ پہلے جلسے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جگہ جگہ کے عیسائی علانیہ اپنے قصوروں کا اقرار کرکے ایک دوسرے کے گلے لگے۔ ہر جگہ باہمی میل ملاپ ہوگیا۔ لوگوں نے خدا کے حضور سچے دل سے توبہ کرکے مسیح کے زندہ بدن کے عُضو ہونے کا وعدہ کیا۔ احسان اللہ کے ساتھ ملو چند بھی تھے۔ اُنہوں نے واعظ صاحب کو بھی بُلا لیا تھا۔ یہ جلسے ایک ہفتے تک ہوتے رہے۔ قبلہ واعظ لکھتے ہیں،

ایک جلسے میں احسان اللہ نے خداوند مسیح کی عجیب قُدرتوں کا بیان کیا اور روح القدس کی تاثیر پر نہایت پُر جوش وعظ کیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ مسیحی ایمان میں کس قدر قوّت اور جو خود ہے جو دُنیا کی اور ہرانسان کی زندگی کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ اُنہوں نے تاریخِ عالَم سے مثالیں دے دے کر اُن عجائب کا ذکر کیا جو روح القدس کے وسیلے وقوع میں آتے چلے آئے ہیں۔ روح القدس کی قُدرت کی مثال دُنیا بھر کے مذاہب میں نہیں ملتی، اور اگر ہم اِس قُدرت کا اپنی شخصی زندگی میں استعمال نہ کریں تو ہم سے زیادہ بدنصیب کوئی انسان نہیں ہو سکتا۔

کانگڑہ میں جلسے کرنے کے بعد احسان اللہ ملو چند کے ساتھ پالم پور، بیج ناتھ اور دھرم سالہ گئے۔ وہاں کی جماعتوں میں جلسے ہوئے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِن جماعتوں میں یہ احساس پیدا ہوگیا کہ وہ اِس کوہستانی علاقے کے کٹر ہندو آبادی کی

روحوں کے ذمے دار ہیں۔ ایمان داروں نے ازسرِنو خداوند مسیح کی انجیل کے مطابق زندگی گُزارنے کا تہیّہ کرلیا۔

راجا شام سنگھ کے ہاں تاج پورہ میں

احسان اللہ نے واپس نارووال پہنچ کر ایک پروگرام تیار کیا تاکہ وہ اور واعظ صاحب پنجاب اور یو۔پی کا دَورہ کریں تاکہ جماعتیں ہر جگہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوکر خداوند مسیح کا حقیقی بدن بن جائیں۔ واعظ صاحب لکھتے ہیں،

احسان اللہ دُور دُور دَورے کرتے تھے۔ ایک دفعہ اُنہوں نے مجھے لکھا کہ کلکا آو۔ وہاں سے ہم تاج پورہ گئے۔ وہاں کا رئیس راجا شام سنگھ عیسائی ہوگیا تھا، لیکن باقی تمام خاندان ہندو مت کا پیروکار تھا۔ ایک دن مَیں نے راجا صاحب سے اُن کے عیسائی ہونے کا حال پوچھا۔ اُنہوں نے اپنی داستان سُنائی، ”مَیں عام ہندوستانی رئیسوں کی سی دُنیا دار زندگی گُزارتا تھا اور عیش اُڑانے کے لئے انگلینڈ پہنچا۔ پر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہاں میرا ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا جو اعلیٰ درجے کی روحانی

طبیعت رکھتے تھے۔ اُن کی زندگی اور انجیل کی تعلیم کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ مَیں مسیح کا پیروکار ہو گیا۔ اب میرا چھوٹا بھائی رومی فرقے میں ہے اور میرے بیٹے نے انگلینڈ میں پبتسمہ پا لیا ہے۔ میری یہی خواہش ہے کہ میری رانی بھی مسیح کے قدموں میں آ جائے۔

احسان اللہ بھی میرے ساتھ تاجپورہ میں تھے۔ اتوار کے روز عبادت ہوئی جس میں اُنہوں نے جوشیلا مگر نہایت موزوں درس دیا جس سے سُننے والے وجد میں آ گئے۔ عبادت کے بعد راجا صاحب نے اہلکاروں کو بُلایا۔ وہ دیوان خانے میں جمع ہو گئے۔ محل کے باہر شہر کے ہندو بھی دینی گُفتگو کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ میاں صاحب نے مجھے کہا کہ آپ اِن اہل کاروں کو نجات کا پیغام سُنائیں اور مَیں باہر جا کر ہندوؤں کو خداوند کے نام کی بشارت دیتا ہوں۔ وہ اُنہیں انجیل کا پیغام سُنا رہے تھے کہ ایک آریہ پنڈت نے اُن کی تقریر میں بار بار خلل ڈالنا شروع کر دیا۔ شور اور غوغا کی آواز سُن کر مَیں باہر آیا۔ پنڈت بے چارہ حقیقت میں بے علم بلکہ بے ہودہ باتیں

کر رہا تھا۔ مَیں نے میاں صاحب کو اندر بھیج دیا تاکہ وہ اہل کاروں سے بات کریں اور مَیں نے دس پندرہ منٹ میں پنڈت کی زبان ایسی بندکر دی کہ لوگوں نے اُس غریب پر تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ پنڈت اپنا سا منہ لے کر بھاگ گیا۔

راجا شام سنگھ کے محل سے ہم دونوں ریاست کے گاؤں میں گئے۔ یہاں میتھوڈسٹ مشن کا کام بہت پھیلا ہوا ہے۔ میاں صاحب ایک طرف کو چلے گئے اور مَیں دوسری طرف نکل گیا۔ مَیں ایک گاؤں میں گیا جہاں ایک پرانے عمر رسیدہ بلکہ یوں کہو کہ بوسیدہ خادم الدین سکونت کرتے تھے۔ رات کو مَیں اُن کے ہاں ٹھہرا۔ کھانے کے بعد مَیں نے اُن سے اُن کے مسیحی تجربے اور روحانی زندگی کی باتیں کرنے کو کہا۔ جواب ملا، "ارے میاں، کیسا تجربہ اور کیسی نجات۔ تم سے پہلے احسان اللہ نجات لئے پِھرتا تھا، اب تم آئے ہو اور نجات نجات کرتے پِھرتے ہو۔ ہم کیا جانیں کہ نجات ملی ہے یا

نہیں۔ جب مریں گے تو دیکھا جائے گا۔" یہ آدمی ہزاروں ایسے عیسائیوں کے خادم تھے جو پہلے چمار اور بھنگی تھے۔

ایک دن گُفتگو کے دوران راجا صاحب نے بیان کیا، "یہاں سے چار کوس کے فاصلے پر ایک عیسائی کُٹھیا[a] میں رہتا ہے جو پہلے بھنگی ہوا کرتا تھا۔ لیکن اُس کی مسیحی زندگی ایسی ہے کہ مَیں اُس کے پاؤں دھونے کے لائق بھی نہیں۔" چنانچہ احسان اللہ اور مَیں وہاں گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ گاؤں کے باہر ایک چھوٹی سی کُٹھیا میں ایک فقیر بیٹھا ہے جس کے ارد گرد بہت سے ہندو اور مسلمان مرد اور عورتیں جمع ہیں جو اُس سے دُعائے خیر کے طالب ہیں۔ کیونکہ اُس کی دُعا سے بیمار شفا پاتے ہیں۔ اکثر مائیں اپنے بچوں کو اُس کے قدموں میں ڈال کر اُس سے دُعائے برکت مانگتی ہیں۔ اِس نظارے کو دیکھ کر ہم نے خدا کا شُکر کیا۔

راجا صاحب کی خاکساری کا یہ عالَم تھا کہ ایک موقعے پر اُنھوں نے احسان اللہ کے ولولہ انگیز وعظ کے بعد تمام عیسائی

---

[a] اناج کی کوٹھڑی۔ گودام

بھائیوں کے جو عبادت میں حاضر تھے پاؤں دھوئے۔ یہی حال
مَیں نے ڈاکٹر برخوردار خاں کا دیکھا ہے۔ چمبہ کے ہسپتال میں
وزیر آئے یا امیر، کسی کی اُٹھ کر تعظیم نہیں کرتے تھے۔ لیکن
جب کوئی غریب بیمار یا کوڑھی آتا تو فوراً کھڑے ہو کر اُس کے
حال کی طرف متوجّہ ہو کر اُسے عزّت سے بٹھلاتے۔ وہ کہتے
تھے کہ میرا خداوند امیروں کے بھیس میں نہیں آتا بلکہ غریبوں
کی صورت میں آتا ہے۔ کیا معلوم کہ وہ کس موقعے پر آ جائے
اور مَیں اُس کی خدمت سے محروم رہوں۔

احسان اللّٰہ تاجپورہ سے دہرہ دون، رُڑکی اور سہارن پور
آئے۔ ہر مقام میں اُن کا بڑے تپاک سے خیر مقدّم کیا گیا۔
عیسائی اُن کے قدموں میں اِس عقیدت سے بیٹھتے تھے گویا
پولس رسول اُن کے درمیان آ گئے ہیں۔ دہرہ دون کی ایک
خاتون نے مجھے بتایا، "جب کبھی وہ دہرہ دون آتے تو وہ
ہمارے گھر مہمان ہوتے اور مَیں ایک پیڑھی لے کر اُن کے
قدموں میں بیٹھ جاتی اور اُن کی باتیں سُنتی رہتی۔ وہ ہر بات

کو ایسے دل کش طریقے سے پیش کرتے کہ میرا یہی جی کرتا تھا کہ بس وہ بولتے رہیں اور مَیں سُنتی رہوں۔ وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ میری عُمر اُس وقت نو یا دس سال کی تھی، لیکن اُن میں ایسی کشش تھی کہ مجھ پر اُن سے ایک منٹ کے لئے بھی جُدا ہونا بُرا لگتا تھا۔"

ہر جگہ میاں صاحب کے جلسے بڑے اہتمام سے کئے جاتے تھے اور نہایت کام یاب ثابت ہوتے تھے۔ یہ جلسے کئی کئی دن ہوتے رہتے اور اُن جگہوں کی جماعتوں کے لئے برکت کا باعث ہوئے۔ ایمان داروں نے اُن کی ہنگامہ خیز تقریروں سے متاثّر ہو کر ایک دوسرے سے کینہ رکھنے کے لئے مُعافی مانگی بلکہ میاں صاحب نے بہتوں کے گھروں میں خود جا کر صُلح صفائی کروا دی۔ جماعتیں از سرِ نَو جوش میں آ گئیں۔ اُنہوں نے خدا کے حضور وعدہ کیا کہ آئندہ ہم مسیح کی ہو کر رہیں گی اور اُس پر دل و جان قربان کر کے ہندوؤں

اور مسلمانوں کو نجات کا پیغام سُنائیں گی۔ غلط فہمیوں کے دُور ہونے سے اُن جماعتوں میں دلی محبّت واپس آئی اور خدا کا ہر جگہ جلال ظاہر ہوا۔

احسان اللہ کے وعظ اور نصائح گاؤں اور شہروں کی جماعتوں، دونوں کو ہر جگہ مسحور کر لیتے تھے۔ عقلیّت اور روحانیّت کے ذوق نے ایک ہی دل میں بہت کم آشیانہ بنایا ہے۔ قُدرت نے اُنہیں نہ صرف غیر معمولی ذہانت بخشی تھی بلکہ اُنہیں روحانیّت کی نعمتِ لازوال بھی عطا کی تھی۔ چنانچہ شہروں کی جماعتیں جو اپنے خادمانِ دین کے یکساں اور بے کیف خُشک وعظوں سے تھک گئی تھیں نہایت ذوق و شوق سے احسان اللہ کی جدّتِ فکر اور روح کی نقش آرائیوں کی طرف دھیان لگاتی تھیں۔ کیونکہ اُن کا مُجتہدانہ انداز نرالا تھا۔ اُن بے چارے خادمانِ دین کا جوش بھی جماعتوں کی بے کیف اور خُشک مشغولیّتوں کے بارِ مسلسل سے تھک گیا تھا اور ایسا ٹھنڈا پڑ گیا تھا کہ اُن کی روحانی قوّت ڈھیلی ہو چکی تھی۔

چنانچہ وہ بھی اِس عظیم شخصیّت کی جادو نگار تقریروں اور وعظوں کو سُن کر خود متاثّر ہوتے تھے۔ وہ اُن کے لئے خدا کا شکر کرتے تھے اور دُعا مانگتے تھے کہ جو رویائیں اُن کی جماعتیں دیکھتی ہیں وہ دیرپا ہوں اور اُن کی زندگیوں کا مستقل حصّہ بن جائیں تاکہ وہ روز مرّہ کے بھاگنے، چلنے، اُٹھنے، بیٹھنے، لیٹنے اور مرنے کے چکر کے پیشِ نظر محفوظ رہ کر خدا کے جلال کا وسیلہ ہوں۔

ایسے جلسے اِس قدر کام یاب ہوتے تھے کہ سُننے والے بے اختیار خود فراموش ہو کر محشر برپا کر دیتے تھے اور بے خودی میں آ کر آپے سے باہر ہو کر خدا کے حضور اپنے گناہوں کا اقرار کر کے اُس سے معافی مانگتے تھے۔ اگرچہ میاں صاحب ہمیشہ جذبات کے مظاہروں کے خلاف تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسی باتیں وقتی اور ناپائدار ہوتی ہیں، کہ وہ اُن کانٹوں کی طرح ہیں جو جلتے وقت بہت شور مچاتے ہیں پر جب وہ جل اُٹھتے ہیں تو صرف راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اِس

کے مقابلے میں روح القدس کے پھل مسیحیوں کی زندگیوں میں مستقل طور پر ہمیشہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی تقریروں کا اثر جذباتی نعروں میں مُنتقل ہو۔ لیکن اُن کے ولولہ انگیز الفاظ سامعین کو محو و مدہوش کر دیتے تھے۔ قبلہ واعظ لکھتے ہیں،

> مَیں نے خود بار بار دیکھا ہے کہ جہاں احسان اللہ نے کلام بونا شروع کیا اور بولنے کو کھڑے ہوئے وہاں گریہ و زاری شروع ہو جاتی تھی۔ مَیں نے اُن کے وعظوں میں مشنریوں کو روتے دیکھا ہے اورعین جلسے میں کھڑے ہو کر اپنے گناہوں کا اقرارکرتے سُنا ہے۔ لوگ بالکل حواس کھوکر مبہوت ہو جاتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ مجھے بار بار اِس کا ذکرکرنا پڑتا ہے۔ آج کل اِس قسم کے واعظ شاذ ہی ملتے ہیں، اگرچہ غُل غپاڑہ مچانے والے بہتیرے ہوتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ صرف وہی احسان اللہ کے سے وعظ کرسکتا ہے جس کے سینے میں اُن

کا سا دل ہو اور دل بھی مسیح کی محبت سے سرشار ہو۔ احسان اللہ کی فصاحت اُن کی روحانی قوّت کی فصاحت تھی۔ اُن کے وعظ محض الفاظ اور فقرات کی خوبیوں سے پُر نہیں ہوتے تھے بلکہ جب وہ وعظ کرتے تھے تو گناہ گاروں کو مسیح کا چہرہ اور اُس کی لازوال محبت کی خوبی آنکھوں کے سامنے نظر آ جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ یہی تصویر پیش کرکے گناہ گاروں کو صلیب کی طرف آنے کی دعوت دیتے تھے۔

اُن کا دل حسّاس تھا، اور اِس حسّاس دل سے شور نکلتا تھا جس کو وہ دلیری کے ساتھ نِڈر ہوکر کہہ دیتے تھے۔ کیونکہ وہ کہے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خداوند نے اُنہیں کہا تھا،

> گلا پھاڑ کر آواز دے، رُک رُک کر بات نہ کر! نرسنگے کی سی بلند آواز کے ساتھ میری قوم کو اُس کی سرکشی سنا، یعقوب کے گھرانے کو اُس کے گناہوں کی فہرست بیان کر۔ (یسعیاہ 1:58)

اِن باتوں کو برہنہ کرنے کے لئے بے خوفی اور دلیری کی ضرورت تھی۔ وہ علمِ ریاضی کی بنیادی باتوں کی طرح 2 + 2 = 4 کی مانند نہیں ہوتیں جن کے اعلان کے لئے کوئی جُرأت درکار نہیں ہوتی۔ میاں صاحب خدا کی آواز کو سُن کر نڈر ہو کر کہتے تھے،

> صیون کی خاطر مَیں خاموش نہیں رہوں گا، یروشلم کی خاطر تب تک آرام نہیں کروں گا جب تک اُس کی راستی طلوعِ صبح کی طرح نہ چمکے اور اُس کی نجات مشعل کی طرح نہ بھڑکے۔ (یسعیاہ 1:62)

باقی خادمانِ دین بھی یہ سب کچھ دیکھتے تھے لیکن خاموش رہتے تھے۔

چیت رام کا اثر

احسان اللہ کو فقیری کے ایّام میں اکثر سادھوؤں، فقیروں، درویشوں اور گوشہ نشینوں سے ملنے کا اتّفاق ہوا، اور اُنہوں

نے اُن سے اپنی فقیرانہ زندگی کے لئے بہتیرے سبق سیکھے۔
وہ چیت رامی فقیروں کی زندگی سے بہت متأثّر ہوئے جن کا استھان موضع بھچو کے تحصیل شرقپور میں تھا۔ وہاں گزشتہ صدی میں ایک تارک الدُنیا مسلمان محبوب شاہ تھا جس نے انجیل کی تعلیم سے متأثّر ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ اِس کے بعد اُس کا چیلا چیت رام گدّی پر بیٹھا۔ وہ اَن پڑھ لیکن خدا رسیدہ شخص تھا اور عموماً اپنے "ملنگوں" کے ساتھ دَورہ کیا کرتا تھا۔ ہندو، مسلمان، سکھ، چوہڑے، چمار، شریف اور کمینے، سب ہی اُس کے مرید تھے۔ مگر اُس کے خاص چیلوں کی تعداد چالیس تھی جن کو اُس نے "ملنگ" کا نام دیا تھا۔ وہ صلیبیں ہمیشہ ہاتھ میں رکھتے تھے۔

اُس کی منادی کا طریقہ بھی نرالا تھا۔ ایک دفعہ وہ اپنے ملنگوں سمیت لاہور کے ایک بازار میں سے گزرا اور ایک چوک میں کھڑا ہو گیا۔ صلیبیں سب کے ہاتھوں میں تھیں۔

اُس نے ایک چیلے کو حکم دیا کہ ہیر وارث شاہ سُناؤ۔ سینکڑوں کا مجمع ہوگیا۔ پھر اُس نے حکم دیا کہ اب قرآن سُناؤ۔ سامعین کی تعداد چالیس پچاس رہ گئی۔ پھر حکم ہوا کہ اب انجیل پڑھو۔ صرف پانچ سات آدمی کھڑے رہ گئے۔ تب چیت رام نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا، "بھائیو، دُنیا کو دُنیادار کس قدر پیار کرتے ہیں۔ لوگ ہیر کے پیچھے دیوانہ وار آتے ہیں مگر قرآن کے پیچھے جس میں دُنیا اور دین دونوں ہیں تھوڑے لوگ جاتے ہیں۔ لیکن انجیل کے پیچھے گنتی کے چند آدمی جاتے ہیں۔ کیونکہ اِس میں خالص روحانیّت کا پیغام اور مُکتی کا سندیسا ہے۔"

چیت رام خداوند مسیح کا چیلا تھا، اگرچہ وہ سب مذاہب کی قدر کرتا تھا۔ وہ مسیحیوں سے اور خاص کر خادمانِ دین سے مُلاقات رکھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ بپتسمہ پانی کا نہیں بلکہ روح کا ہونا چاہیئے، کیونکہ روح القدس آگ ہے اور جو یہ بپتسمہ پاتا

ہے وہ فراقِ یار یعنی مسیح کی آگ میں جلتا ہے۔ اُسے وصال کی ضرورت ہے جو عشائے ربّانی ہے جس کو حقیقی طور پر پاکر روح کو آرامِ جان حاصل ہوتا ہے۔

احسان اللہ قُدرتاً ایسی باتوں سے متاثّر ہوتے تھے۔ مَیں نے بھی 1908ء میں اُن ملنگوں کو دیکھا ہے۔ ایک دفعہ مَیں اتوار کے روز لاہور میں تھا کہ ملنگ عبادت کے بعد صلیبوں کو ہاتھ میں لئے اِکتارا بجاتے وہاں آگئے۔ اُنہوں نے خداوند مسیح کی پیدائش، معجزات، تعلیم، صلیبی موت اور فتح یاب قیامت کو اپنے ساز پر گاکر سُنایا جس سے بعض حاضرین وجد میں آگئے۔

پشاور

اکتوبر 1897ء میں احسان اللہ نے نادیہ کے خادم ڈبلیو چارلٹن کے ساتھ پشاور اور آگرہ میں جلسے کیئے۔ پشاور میں امام شاہ صاحب جیسے حلیم اور شریف شخص جماعت کے خادم تھے۔

اُنھوں نے دونوں کا خیر مقدّم کیا اور بڑے اہتمام سے جلسوں کا انتظام کیا۔ احسان اللہ کی تقریروں نے حسبِ معمول سُننے والوں کے دلوں کو جوش سے بھر دیا، کیونکہ اُن کی انفرادی زندگی کا اثر اُن کی اپنی ذات تک ہی محدود نہیں تھا۔ اُن کا روحانی جوش دوسروں تک بھی ہر جگہ پہنچ جاتا تھا۔ پشاور کے عیسائیوں کی زندگی کی کایا پلٹ گئی، اور اُن میں روحانی زندگی ایسی لوٹ کر آئی کہ جماعت تبلیغِ انجیل کی خدمت نہایت جاں فشانی سے کرنے لگی۔ سب نے اپنی زندگیوں کی تقدیس کی۔

اُن کے وعظوں کا اثر ایسا دیرپا رہا کہ جب مَیں 17 سال کے بعد 1914ء میں وہاں کے مشن کالج میں فلسفے کا پروفیسر مامور ہوا اور پشاور کی جماعت کو معلوم ہوا کہ مَیں میاں صاحب کا بھتیجا ہوں تو اُنھوں نے نہایت تپاک سے میری آؤ بھگت کی اور ہر گھر کے دروازے مجھ پر کُھل گئے۔ اُن دنوں میں وہاں قصّہ خوانی بازار میں لوقا خان آرمینی رہتے تھے۔

وہ مجھے جب دیکھتے کہتے، "احسان اللہ خاں کے وعظوں نے ہم سبھوں پر بڑا اثر کیا تھا۔ ہم اُنہیں بھول نہیں سکتے۔"

آگراہ

پشاوتر سے میاں صاحب آگرہ گئے۔ وہاں کے لوگوں نے اُن کا نام سُنا ہوا تھا اور اُن کی آمد کے منتظر تھے۔ وہاں بھی جلسے ایسے کام یاب ہوئے کہ شہر کے کونے کونے سے لوگ آ گئے۔ افتتاحی جلسے میں احسان اللہ نے ایک مختصر تقریر کے بعد کہا، "کوئی بھائی دُعا کرے۔"

ایک شخص نے دُعا شروع کی، "اے خدا، تُو نے آدم کو بنایا اور اُسے حوّا دے کر باغِ عدن میں رکھا۔ پھر تُو نے بقائے نسل کے لئے اُسے سیت دیا اور تُو نے حنوک پیدا کیا جو تیرے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور پھر متوسلح کو لمک اور لمک کو نوح دیا جس کے زمانے میں طوفان آیا..."

میاں صاحب سے رہا نہ گیا۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ جب تک یہ بھائی موسیٰ تک پہنچے جماعت فلاں گیت گائے!"

اِس قسم کے واقعات نہ صرف ظاہر کرتے ہیں کہ میاں صاحب ظاہر پرستی کے دُشمن تھے بلکہ وہ اُن کی زبان کی شوخی اور طبیعت کی شگفتگی کو بھی منظرِ عام پر رکھ دیتے ہیں۔ عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ آدمی کا جتنا زیادہ بجُھا دل اور سُوکھا چہرہ ہو گا اُتنا ہی زیادہ وہ مذہبی ہو گا۔ گویا تقدّس اور ماتمی زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ دین داری اور آزُردہ طبیعت مترادف الفاظ گردانے جاتے ہیں، کیونکہ ہر جگہ زُہدِ خُشک اور طبعِ سرد کی گرم بازاری نظر آتی ہے۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ زُہد مزاجی اور حق آگاہی کے ساتھ ہنستا ہوا چہرہ قُدرت کے منشا کے عین مطابق ہے۔ یوں انجیل جلیل میں لکھا ہے،

> روح القدس کا پھل فرق ہے۔ وہ محبت، خوشی، صلح سلامتی، صبر، مہربانی، نیکی، وفاداری، نرمی اورضبطِ نفس پیدا کرتا ہے۔ (گلتیوں 5:22–23)

ہاں، لوقا کی انجیل اور اعمال کی کتاب کا شاید کوئی صفحہ ہو جس میں لفظ "خوشی" موجود نہ ہو۔ جماعت میں پہلی صدیوں کی طرح روحانی خوشی عموماً زُہد اورتقویٰ کے ساتھ نہیں پائی جاتی۔ ؎

> گویا نہ وہ زمیں ہے، نہ وہ آسمان ہے اب!

خیر، افتتاحی جلسے کے بعد کسی نے اِس قسم کی دُعا کرنے کی جُرأت نہ کی۔ ؎

> جس کے اظہار کی ہمّت بھی نہیں ہونٹوں پر
> وہ دُعا کیا کبھی ممنونِ اثر ہو گی؟

اِس قسم کی دُعائیں اورتقریریں بانسری کی طرح اندر سے خالی لیکن آوازوں سے بھری ہوتی ہیں۔

اِس کے بعد جو جلسے ہوئے اُن میں دُعائیں نہایت دل سوزی سے کی گئیں۔ میاں صاحب کے وعظوں میں دلوں کی باطنی حالت کو اور حقائق کو اِس تلخ نوائی کے ساتھ بیان کیا گیا اور ایسی صاف گوئی سے کام لیا گیا کہ اُن کے الفاظ تیر و نِشتر کا کام کر گئے اور دلوں کے آر پار ہو گئے۔ جامد دل پگھل گئے اور لوگ اپنے گناہوں کا اقرار کر کے خدا سے مغفرت کے طلب گار ہوئے۔ دیرینہ دُشمنیوں کی جگہ جماعت کے شرکا کے دل محبّت اور شُکر گُزاری سے معمور ہو گئے۔ ہر مسیحی خدا کا شکر کرتا تھا جس نے احسان اللّٰہ کو اُن کے درمیان بھیج کر اُنہیں دوبارہ اپنی ذمّے داری کا احساس دلایا۔ سب نے سچّے دل سے وعدہ کیا کہ ہم پرانی زندگی کو بھول کر نئی آسمانی زندگی اختیار کریں گے، ہم جماعت کی خدمت کر کے انجیل کی خوش خبری پھیلائیں گے۔

الٰہ آباد

آگرہ کے بعد احسان اللہ الٰہ آباد گئے۔ وہاں جلسوں کا انتظام بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا اور اُن کی آمد سے پہلے دُعائیہ جلسے جا بہ جا کئے گئے۔ خاص کر میور آباد کے لوگ دل و جان سے دُعا کرتے تھے کہ خدا میاں صاحب کے وسیلے اُنہیں روحانی برکتوں سے مالامال کر دے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ الٰہ آباد پہنچے تو کلام کے بونے کے لئے زمین تیار تھی۔ میاں صاحب آٹھ دن وہاں رہے۔ ہر جلسے میں پہلے سے زیادہ لوگ حاضر ہوتے تھے۔ جلسہ گاہ ایسا کھچا کھچ بھر جاتا تھا کہ تِل رکھنے کی جگہ باقی نہ رہتی تھی۔ اِس کا قُدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ میاں صاحب کے روحانی وعظوں نے حاضرین کے دلوں کو مدہوش کر دیا۔ اُن پر بے خودی کا عالَم طاری ہو گیا۔ میاں صاحب کے لفظ چلتی ہوئی شمشیریں اور آتشی تیر تھے جو حسّاس طبیعتوں کو گھائل کرتے چلے گئے۔ لوگوں نے بے خودی میں آ کر بے

ساختہ علانیہ خدا کے حضور اور جماعت کے رو برو اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور خلوص دلی سے خدا سے اور ایک دوسرے سے مُعافی مانگی۔ دونوں مقاموں کی جماعتوں کے دل روحانی خوشی اور جوش سے بھر گئے۔ لوگ خلوت میں آ کر میاں صاحب سے روحانی مشورہ پاتے تھے اور اُن کی صُحبت میں اپنی روحوں کے لئے برکات پاتے تھے۔ اُن کے مُریدوں کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا گیا۔ میاں صاحب ہر ایک کی داستان سُنتے اور اُس کی حاجت کے مطابق مناسب الفاظ میں نصیحت فرماتے رہے۔ جلسوں کے اختتام پر اُنہوں نے نہایت دل سوزی سے سب حاضرین کے لئے دُعا کی، ایسا کہ سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُن کی رُخصت کے وقت لوگوں کا ازدحام سٹیشن پر جمع تھا، اور اُنہوں نے با دلِ نخواستہ اُنہیں رُخصت کر کے خدا کے سپرد کیا۔

پسرور

نومبر 1897ء میں پسرور کی جماعت نے پھر ایک بار احسان اللہ کو آنے کی دعوت دی۔ اُن کے ساتھ گنڈا مل اور ملو چند کو بھی پسرور بُلایا گیا۔ پسرور کے مشنری نے اپنے تمام علاقے کے خادمانِ دین، مُبلّغین اور اُستادوں کو دیہات کے دیگر مسیحیوں سمیت پسرور بُلایا تاکہ وہ میاں صاحب کی تقریروں اور وعظوں سے روحانی برکتیں پائیں۔ جلسہ بڑے اہتمام سے بڑے پیمانے پر کیا گیا۔ گنڈا مل لکھتے ہیں،

احسان اللہ نے سب جلسوں کا پروگرام خود تیار کیا۔ پہلے جلسے میں اُنہوں نے افتتاحی وعظ کیا اور صاف گوئی سے کام لے کر پُر زور اور روح پروَر الفاظ میں ایسی جوشیلی تقریر کی کہ اُسی جلسے میں ایسے نتائج بر آمد ہوئے جو عموماً بیداری کے تین چار جلسوں کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ کیونکہ پہلے ہی جلسے میں حاضرین کے دل ٹوٹ گئے۔ جلسے کے بعد لوگ باہر کھیتوں اور ویرانوں میں نکل گئے اور خدا کے کلام کے مطالعے اور

پوشیدہ دُعا میں مصروف ہو گئے۔ ہر ایک نے کلام اللہ کے صاف اور شفّاف آئینے میں اپنی بھیانک صورت کو دیکھا۔

جب دوسرا جلسہ شروع ہوا اور میاں صاحب وعظ کرنے لگے تو حاضرین پر عجیب اثر ہوا۔ کیونکہ دلوں کے پرکھنے سے اُن کے پہلے ہی دل نرم ہو گئے تھے اور اُن کے لئے زمین تیار تھی۔ اُنھوں نے انسان کی گناہ گاری اور خدا کی قدوسیّت پر ایسا درس دیا کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو رہا تھا کہ خدا اُن کے وسیلے ہر ایک پر اُس کے دلی راز ظاہر کر رہا ہے تاکہ وہ اپنی گھنونی حالت کو دیکھ کر قائل ہو جائے۔ تقریر کے بعد چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔

پھر ایک بُوڑھے ایلڈر نے نہایت کرب اور رنج کی حالت میں درد بھری آہوں کے ساتھ اپنے حالِ زار کے لئے دُعا کی اور جماعت کی عورتیں اور مرد، جوان اور بُوڑھے، سب کے سب اپنے اپنے واسطے دُعا مانگنے اور گریہ کے غلبے سے بے اختیاری کی حالت میں زار زار رونے لگے۔ جب نالہ و بکا کی آواز قدرے دھیمی ہوئی تو ایک شخص کانپتا ہوا اُٹھا اور کہنے

لگا، "بھائیو، آج مجھے میرا گناہ بُری طرح ستاتا ہے گو وہ مُدّت سے میرے دل میں کانٹے کی طرح چُبھ رہا ہے۔ اگرچہ اِس کے اقرارکرنے میں مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے لیکن مَیں مجبور ہوں، باز نہیں رہ سکتا۔ کُچھ عرصہ ہوا میرے گاؤں کے دو جاٹوں کے مابَین سخت دُشمنی ہوگئی۔ ایک نے مجھے بُلاکر کہا کہ اگرتم میرے دُشمن کو مار ڈالو تو مَیں تم کو ایک سَو روپے انعام دوں گا۔ لالچ نے مجھے اندھا کر دیا۔ مَیں پہلے ہی لڑاکُو اورجھگڑالُو تھا جس وجہ سے لوگ ڈر کے مارے مجھ سے دُور رہتے تھے۔ مَیں نے روپیہ وصول کر لیا، لیکن اُس کے دُشمن کوقتل کرنے کا مجھے موقع نہ ملا۔ ہائے میرا یہ گناہ یہوداہ اسکریوتی کے گناہ سے کم نہیں ہے۔ مَیں کس طرح مُنصف خدا کو قیامت کے دن اپنا مُنہ دِکھا سکوں گا۔ مَیں اب جاٹ کا روپیہ واپس کر دوں گا اور اپنی زندگی کو جو حدِ درجہ گھنونی ہے صلیب کے قدموں میں رکھ دوں گا تاکہ مسیح کے خون سے صاف ہو جائے۔ اگرمیری مکروہ حرکتوں کے واسطے سرکار مجھے سزا بھی دے تو مَیں اِس کو خوشی سے قبول کروں گا۔ کیونکہ انسانی

عدالت میں سزا پانا عدالتِ الٰہی میں رُو سیاہ ہو کر جانے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ میرے واسطے دُعا کریں کہ مَیں اپنے اقرار پر اور اپنی زندگی کو تبدیل کرنے کی نیّت پر قائم رہنے کی توفیق پاؤں۔"

اِس پر جماعت کے دل بھر گئے اور سب اپنے اپنے گناہوں، بدکاریوں اور بدیوں کے لئے اور اپنی طبیعتوں کے بدلنے کے لئے خدا سے سچّے دل سے دُعا کرنے لگے۔ پھر بزُرگ میاں صاحب اُٹھے اور بڑی محبت اور ملائمت سے کہنے لگے، "میرے عزیز بھائیو اور بہنو۔ یہ نہایت واجب اور مناسب ہے کہ ہم اپنے گناہوں کا خدا کے حضور اقرار کریں اور اُس سے مُعافی مانگیں۔ لیکن جب تک اقرار کے ساتھ سچّی توبہ نہ ہو، اُن کا اقرار کرنا اور نالہ زاری کرنا، سب لاحاصل اور بے فائدہ ہے۔ اب سچے دل سے

> توبہ کریں اور اللہ کی طرف رجوع لائیں تاکہ آپ کے گناہوں کو مٹایا جائے۔ پھر آپ کو رب کے حضور سے تازگی کے دن میسر آئیں گے۔ (اعمال 3:19–20)

یہ آیت پڑھ کر اُنہوں نے نہایت موزوں الفاظ میں حقیقی توبہ پر ایک مختصر اور پُر مطلب نصیحت کی جس کا ایسا اثر ہوا کہ جماعت نے خدا سے سچی توبہ کی توفیق کے لئے دل و جان سے دُعا کی۔ ہر ایک نے جو وہاں حاضر تھا خدا سے عہد کیا کہ وہ اُس کے حضور نئی زندگی بسر کرے گا، اپنی زندگی کو خدا کی روحوں کی نجات کے لئے گزارے گا۔ ہر ایک نے دوسرے کے ساتھ وعدہ اور عہد کیا کہ وہ اپنے ہم سائے کے ساتھ اپنے برابر محبت رکھے گا اور خداوند مسیح کے سُنہرے اصولوں کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالے گا۔ اِس کے بعد خوشی اور فتح مندی کے زبور گائے گئے، خدا کی ستائش کے نعرے بلند ہوئے۔ دُعائیں اور مناجاتیں خوش بو کی مانند خدا کے حضور پیش کی گئیں۔ ہر ایک چہرہ خوش اور بشّاش تھا، ہر دل روحانی خوشی سے بھرا تھا۔ لوگ گیت گاتے، ڈھولک بجاتے اپنے اپنے گاؤں کو روانہ ہو گئے۔ گاؤں کی جماعتوں میں نئی زندگی اور مسیحی جوش پیدا ہو گیا اور لوگ حد سے زیادہ شوق اور ذوق سے اپنے خادمانِ دین سے خدا کا کلام سُنتے اور عبادت کے وقت

نذرانے اور ہدیے لاتے تھے۔ خادمانِ دین کا بھی حوصلہ بڑھتا گیا، اور وہ بھی دل و جان سے انجیل شریف کی خدمت کرنے لگے۔

بارہ پتھر سکول

قاری کو یاد ہو گا کہ جب 1896ء میں سیالکوٹ شہر میں احسان اللہ نے روحانی جلسے کئے تھے تو اُن کا یہ نتیجہ ہوا تھا کہ وہاں کی سیمنری کے طلبا پر اُن کا بہت اثر ہوا تھا۔ لبھو مل اور ملو چند تو اُن کے چیلے بن گئے تھے۔ دونوں ہر وقت کلام کی تلاوت کرنے اور دُعا میں مشغول رہنے لگے تھے۔ اُن کی دُعا تھی کہ اُن کا سکول، بارہ پتھر سکول خدا کے لئے ایسا مخصوص ہو کہ وہ دُعا کا مرکز ہو جائے۔

اُن کی دُعاؤں نے خدا کی بارگاہ میں قبولیّت کا شرف پایا۔ اینڈرسن ظفروال سے تبدیل ہو کر بارہ پتھر سکول کے پرنسپل ہو گئے۔ وہ احسان اللہ کے چیلے تھے۔ اُنہوں نے یو۔پی مشن

کے تمام علاقوں کے خادمانِ دین، مُبلّغین، استادوں اور مُبشّروں کو جمع کر کے میاں صاحب کو بُلایا۔ مِس کیمبل جو میاں صاحب کی چیلی بن چکی تھی وہیں تھی۔ تمام مرد و خواتین جنہوں نے اُس سال سیالکوٹ، ظفروال، نڈالہ اور شکرگڑھ کے جلسوں میں اُن سے روحانی برکات پائی تھیں، جمع ہو کر دُعا میں مشغول ہو گئے۔ بیداری اور روحانی جوش کی لہر ایسے زوروں پر آئی کہ گاؤں اور شہروں کی جماعتوں کو بہا کر لے گئی۔ کیونکہ دریا کی سطح پر جب ایک لہر زور شور سے اُٹھتی ہے تو اُس ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ گنڈا مل لکھتے ہیں،

بیداری کی یہ لہر سیالکوٹ سے شروع ہو کر پنجاب کے ہر حصے میں بہہ نکلی۔ جو لوگ روحانی بیداری کے جلسوں میں برکت پا کر واپس جاتے تھے وہ ہر کہیں اُن عجیب تجربوں کا چرچا کرتے تھے اور اپنی خط و کتابت میں بھی اُن عجیب کاموں کا ذکر کرتے تھے جو خدا نے میاں صاحب کے ذریعے اُن میں

کیئے۔ اُن کے اپنے دل تبدیل ہو گئے تھے، اور وہ چاہتے تھے کہ اُن کے عزیزوں اور واقف کاروں کے دل بھی خدا کی طرف رجوع کریں۔

سیالکوٹ کی مشہور کنونشن اُسی بڑی بیداری کے جلسے سے شروع ہوئی تھی جو اُنہوں نے 1896ء میں سیالکوٹ شہر میں کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مشہور و معروف کنونشن بزرگ احسان اللہ کی محنتوں مشقّتوں اورجاں فشانی کا ہی نتیجہ ہے۔ اِس کا اصل منبع اور سرچشمہ اُن کی اپنی روحانی زندگی، اُن کا زبردست جوش اور اُن کے وعظ ہیں جو دلوں کو گھائل کرکے لوگوں کو خدا کے پاس لاتے تھے۔

قبلہ واعظ لکھتے ہیں،

یو۔پی مشن کے لوگ احسان اللہ کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ امریکن یو۔پی کی جماعت کی لیڈیز اورمشنری اور دیگر جوان اُن کے پیچھے پیچھے پھرتے رہتے تھے۔ اُن کے جلسوں نے تمام پنجاب میں عموماً اور یو۔پی کی جماعت میں خصوصاً آگ لگا دی۔ اُن کی مشنری لیڈیز اورخصوصاً مِس کیمبل دیسی لباس

میں اُن کے ساتھ رہتی تھیں۔ لائٹل[a] اور چند دیسی جوان اُن کے مخلص مرید ہو گئے۔ اُن کے جلسوں کا نتیجہ سیالکوٹ کنونشن ہے۔

یقیناً یہ سچ ہے کہ احسان اللہ کے وعظوں کے وقت کنونشن کی ہَوا آسمانی ہوتی تھی، کیونکہ وہ روح کی ہدایت سے بولتے تھے۔ اُن ہی کے وعظوں کی وجہ سے میرا شروع سے کنونشن کے ساتھ دلی لگاؤ رہا ہے۔ احسان اللہ چلا گیا۔ وہ اب ہمارے ساتھ نہیں، مگر وہ اب تک کلام کرتا ہے۔ جب تک سیالکوٹ کنونشن ہے احسان اللہ کا نام زندہ رہے گا۔[b]

یو۔پی مشن میں اپنی مدد آپ کی تحریک

ہم بتا چکے ہیں کہ احسان اللہ کی یہ دلی آرزو تھی کہ ہندوستان کی جماعتیں مغرب کے روپئے سے بے نیاز ہو کر اور مغرب کے فرقوں کی مضبوط زنجیروں کو توڑ کر آزاد زندگی گزاریں، کہ

---

[a] Lytle

[b] مسیحی بابت، نومبر 1929ء

وہ اپنے بوجھ خود برداشت کرکے تمام اخراجات کی ذمّے دار ہو جائیں۔ مگر پنجاب کے خادمانِ دین کو یہ احساس نہ تھا۔ وہ اپنی کھال میں مست تھے۔

وہ بے بال و پر ہونے پر ہی نازاں تھے، کیونکہ اِس حالت میں اُنہیں کوئی کھٹکا نہ تھا۔

> ہَوسِ گل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا
> عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

میاں صاحب اپنی چاروں طرف نگاہ کرتے تھے۔ جماعتوں اور خادمانِ دین کو دیکھتے تھے اور حیرت سے کہتے تھے،

> بے شک لوگ بِگل بجا کر جنگ کی تیاریاں کریں، لیکن کیا فائدہ؟ لڑنے کے لئے کوئی نہیں نکلے گا۔
>
> (حزقی ایل 14:7)

وہ جس خادم سے بات کرتے وہ بات ٹال دیتا اور اِن باتوں سے گُفتگو کرنے سے گریز کرتا۔ ے

اُڑنے سے پیشتر ہی میرا رنگ زرد تھا!

آخر اُنہیں یہ احساس ہوا کہ پہلے وہ خود چرچ مشن کی قلیل تنخواہ کے بوجھ سے آزاد ہوں۔ پھر ہی وہ خادموں اور جماعتوں کی توجّہ اُن کی اہم ذمّے داریوں کی طرف کھینچ سکیں گے۔ چنانچہ اُنہوں نے اللہ توکّل اپنی تنخواہ چھوڑ دی۔ تب خدا نے پنجاب مشنری سوسائٹی کے ذریعے اُن کے کُنبے کو پالنے کا انتظام کر دیا، اور اُنہوں نے فقیری لباس پہن کر فقیرانہ زندگی بسر کرنے کا قصد کر لیا۔ تو بھی چرچ مشن کے خادموں اور مُبلّغین میں سے سوائے رحمت مسیح واعظ کے کسی نے بھی اُن کا ساتھ نہ دیا۔

شکرگڑھ کے جلسے میں احسان اللہ نے جماعتوں کی ذمے داریوں اور خادموں کے ایمان کی کمی پر جو درس دیئے تو سب کے دل چھد گئے۔ نتیجے میں پہلے پہل گنڈا مل کی خود انکاری اور ایثار نفسی کی وجہ سے نڈالہ تحصیل شکر گڑھ کی جماعت

اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی۔ پھر راولپنڈی کی جماعت نے تمام اخراجات اپنے ذمّے لے لئے۔ اِس کے بعد ڈھوڈا تحصیل پسرور اور پسرور کی شہری جماعت اپنا خرچ اُٹھانے پر آمادہ ہوئی۔ اب اپنی مدد آپ کی جماعتوں کی تعداد پنجاب کے یو۔ پی مشن کے علاقے میں دو سو کے قریب ہوگئی ہے۔ 1910ء سے پنجاب کی یو۔پی کی جماعت نے اپنا "ہوم مشن" بھی قائم کر لیا ہے جس میں متعدد کاموں اور مبلّغین مختلف مرکزوں میں کام کرتے ہیں۔ اِس مشن کا سالانہ خرچ ہزاروں روپئے ہوتا ہے۔

اِن پہلے خادموں کو اپنی مدد آپ کے تحت چلنے سے مختلف اقسام کی تکلیفوں اور آزمائشوں کا دلیرانہ مقابلہ کرنا پڑا، لیکن اُن کا ایمان پُختہ تھا، اور وہ ہر رُکاوٹ پر غالب آئے۔ یہ سب کچھ احسان اللہ کے زبردست ایمان اور لوہے کے سے مصمّم ارادے کا نتیجہ تھا کہ اُنہوں نے یہ نئی راہ نکالی۔

چرچ مشن کا اختلاف

چرچ مشن کی آنکھوں کے سامنے پنجاب کی جماعت کی کایا پلٹ رہی تھی اور خدا احسان اللہ کو گاؤں، قصبوں اورشہروں کی جماعتوں کو بیدار کرنے کے لئے اور اُن میں زندگی کا دم پھونکنے کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ یو۔پی مشن کے مردانہ اور زنانہ مشنری، خادم اور جماعتیں اُن کی عظیم شخصیّت سے ہرطرف متاثر ہو رہے تھے۔ سیالکوٹ کنونشن کی بنیاد ہو چکی تھی۔ یو۔پی مشن کی جماعتیں روحانی جوش سے معمور ہو کر خود مختار ہو رہی تھیں۔ اِس کے باوجود چرچ مشن نے اُنہیں استعمال نہ کیا۔ لیکن اِس سے میاں صاحب کے ماتھے پر بل نہ پڑا۔ اُنہیں تو مختلف مشنوں کی حدبندیوں سے لگاؤ ہی نہ تھا۔ وہ ہر فِرقے اور ذات کے عیسائیوں کی خدمت کرنا عزّت کا باعث خیال کرتے تھے، لیکن چرچ کے بشپ اور

مشنری اُن کی تحریکوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ واعظ صاحب لکھتے ہیں،

احسان اللہ جگہ جگہ بیداری کے جلسے کرتے تھے، پر جس طرح ویسلی صاحب کی بیداری کو چرچ آف انگلینڈ نے رد کر دیا اُسی طرح احسان اللہ کی بیداری کو چرچ آف انگلینڈ نے ٹھکرا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یو۔پی مشن کی جماعتوں میں جان پڑ گئی۔ سیالکوٹ کنونشن شروع ہوگئی اور ہر جگہ اپنی مدد آپ کا طریقہ رائج ہوگیا۔ خدا ہر ایک کو اُس کے ایمان اور نیّت کے مطابق پھل دیتا ہے۔ اُن سب تحریکوں کی کام یابی کا سہرا اُن کے سر پر ہے۔

آخر میں ہندوستانی مسیحیوں کے کہنے سُننے سے چرچ مشن نے احسان اللہ کو دسمبر 1897ء اور جنوری 1898ء میں انگریز ایس۔ اے سیلوِن[a] کا مترجم بننے کو کہا جس کو میاں صاحب

[a] Selwyn

نے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقرِر سے زیادہ مترجم کا جماعتوں پر اثر ہوا۔[a]

راول پنڈی

سیلوِن کی تقریروں کا ترجمہ ختم ہو چکا تو احسان اللہ راولپنڈی گئے۔ کیونکہ وہاں کی جماعت نے بھی اپنے اخراجات خود اُٹھانے کا فیصلہ کر کے گنڈا مل کو اپنا خادم منتخب کر لیا تھا۔ گنڈا مل لکھتے ہیں،

> بزرگ میاں صاحب میرے پاس راولپنڈی آئے اور فرمانے لگے، "بھائی گنڈا مل۔ مَیں صرف اِس خیال سے یہاں آیا ہوں کہ اِس نئے کام میں جس کا آپ نے ذمہ اُٹھایا ہے آپ کی مدد کروں اور آپ کے ہاتھوں کو مضبوط کروں۔"

---

[a] یوجین سٹاک، ہسٹری آف سی۔ ایم۔ ایس، جلد سوم، صفحہ 759۔

مَیں نے شکریہ ادا کیا۔ پھر پوچھنے لگے، "آپ کو اِس ذمّے داری کے ادا کرنے میں کن کن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہے؟"

مَیں نے جواب دیا، "جناب، ہر نئے کام کے شروع میں مُشکلات اور تکلیفات آیا ہی کرتی ہیں۔ پر خدا کے فضل سے اور آپ کی دُعاؤں سے وہ صبح کے بادلوں کی مانند اُڑ جاتی ہیں۔"

میرے جواب کو سُن کر وہ نہایت محظوظ ہوئے اور کہا، "شاباش۔ ہمّتِ مرداں، مددِ خدا۔"[a] وہ میرے کام کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جماعت کے لوگ ہر وقت اُن کے قدموں میں بیٹھ کر کلامِ پاک کے نکات و رموز سے اور اُن کے روحانی تجربات سے فیض اُٹھاتے رہے۔

راولپنڈی کی جماعت میں جلسے ہوئے۔ احسان اللّٰہ خاص و عام کی جائے پناہ تھے، چنانچہ ایس۔پی۔جی مشن اور یو۔پی مشن کی جماعتوں کے مسیحی اور اردگرد کے مضافات اور

---

[a] جو ہمّت کرے اُس کی مدد خدا کرتا ہے۔

قصبات کے مسیحی اِس کثرت سے شریک ہوئے کہ غیرمسیحی حلقوں میں دھاک بیٹھ گئی۔ میاں صاحب کا کلام روز بروز رنگ پکڑتا گیا جس نے سب کے دلوں کو موہ لیا۔ کیونکہ اُن کے الفاظ اور دل کے قصّے، کہانیاں نہیں تھے۔ جو بات کہی خدا لگتی کہی۔ اُن کی تقریر کا ہرلفظ دل گداز، چلتا ہوا جادو، دردمند دلوں پر اثر کرنے والے تیروں کا ترکش تھا۔

جس جوش سے سرشار ہوکر میاں صاحب تقریر کرتے تھے وہی جذبہ سُننے والوں پر بھی طاری ہو جاتا تھا۔ اُن کے وعظ محض جوشیلے نہیں ہوتے تھے، کیونکہ جذباتی اور جوشیلی باتیں کچھ دیر کے بعد اپنی موت آپ مر جاتی ہیں۔ لیکن اُن کی تقریروں سے ایسی تبدیلی آئی جو نصف صدی کے بعد بھی جماعت کی زندگی کی پیچ دار راہوں کے لئے ہدایت کی مشعل ہے۔

میاں صاحب نے راولپنڈی کی جماعت کی خاطر دن رات خون پسینہ ایک کر دیا۔ کیونکہ اِس شہر کی جماعت نے پنجاب میں اپنی مدد آپ کی نئی راہ اختیار کرنے میں پہل کی تھی۔

اُنہوں نے گنڈا مل کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی اور کہا ؎

> عزمِ جواں سے کام لے، طوفان سے نہ ڈر
> مانا کہ ٹوٹی ناؤ ہے اور بادباں نہیں۔

میاں صاحب کے ہنگامہ انگیز وعظ اور نصائح اُس قسم کے ہنگامے تھے جو اصلاحی اقدام سے پہلے رونما ہوتے ہیں اور ایسے روحانی اور ذہنی انقلابات پیدا کردیتے ہیں جو تعمیری کاموں کے پیش خیمے ہوتے ہیں۔ اُن کی تقریروں نے خداوند مسیح کی قُربت کی ابدی شادمانی کی ابتدائی ترنگیں پنجاب کی جماعتوں کے دلوں میں ڈال دیں۔ اُنہوں نے راولپنڈی کی جماعت کی ہمّت بڑھائی اور فرمایا کہ آگے بڑھتے چلو۔

راولپنڈی سے واپس لوٹتے وقت احسان اللہ نے یو۔پی مشن اور سکاچ مشن کی شہری جماعتوں کا دورہ کیا۔ اُنہوں

نے جہلم، گجرات اور وزیر آباد کی جماعتوں میں جلسے کیئے۔ ہر جگہ کی جماعت کو تازگی اور روحانی شادابی حاصل ہوئی۔ ہر جلسے میں گناہوں کا اقرار خدا کے حضور ہوا، اورلوگوں نے رونا اور ماتم شروع کر دیا۔ اُن کے آنسوؤں سے اُن کے گناہ دُھل گئے اور اُنہیں نئی زندگی حاصل ہوئی۔

جلسوں کے بعد خاموشی طاری ہو جاتی تھی جس میں ہر گناہ گار آسمان کی طرف نظر کرکے اپنے کان خدا کی آواز پر لگا کر سموایل نبی کی طرح کہتا تھا کہ

> اے رب، فرما۔ تیرا خادم سن رہا ہے۔ (1-سموایل 10:3)

وہ ہر جماعت کو اُبھارتے تھے کہ راولپنڈی کی جماعت کے نمونے پر چل کرمغرب کے روپئے سے بے نیاز ہو جاؤ اور اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو جاؤ۔ اُن کے نصائح کا لُبِ لباب یہی ہوتا کہ مغرب کے تفرقے اور اُن کی قیود پنجاب کی جماعت کی زندگی کی نشوونما میں رُکاوٹ کا باعث ہیں۔ اِس

لئے جماعتوں کے لئے لازم ہے کہ اُن زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو جائیں اور متحدہ کوششیں کر کے ہندوستان کو مسیح کے قدموں میں لائیں۔ یہ لَو اُنہیں ہر دم بے چین کئے رکھتی تھی، اور وہ دُور دراز کے سفر اختیار کرتے تھے تاکہ جماعتوں میں اِس کا احساس زندہ کریں۔

اہلیہ میں جنون کے پہلے نشان

جب میاں صاحب اپنے گھر بٹالہ میں واپس پہنچے تو بیوی بچوں کو دیکھ کر نہایت خوش ہوئے۔ وہاں اُنہوں نے چند دن قیام کرنا تھا، کیونکہ نارووال مشن سکول کے ہیڈ ماسٹر چیٹر جی کو اپنے خاندان سمیت ایسٹر کی چھٹیاں کاٹنے کے لئے اُن کے ہاں مہمان ہو کر آنا تھا۔

جب وہ وہاں تھے تو اُن کے بڑے بیٹے قربان نے بتایا کہ والدہ چند دنوں سے عجیب حرکتیں کر رہی ہیں جن سے تینوں بچوں کے دل خائف اور ہراساں رہتے ہیں۔ اُن کا

ماتھا ٹھنکا، کیونکہ جب وہ یو۔پی کے صوبے میں دَورہ کر رہے تھے تو اُنہوں نے اُڑتی خبر سُنی تھی کہ اُن کے خُسر پر دیوانگی غالب ہوگئی ہے اور وہ جنون کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ ؎

> اُڑتی سی اِک خبر تھی زبانی طیّور کی۔

اب یہ خاندانی بیماری اُن کی زوجۂ محترمہ میں آ رہی تھی۔ لیکن اُنہوں نے اپنے پر جبر کرکے اضطراب کا اظہار نہ ہونے دیا۔ کیونکہ چیٹر جی خاندان سمیت آ گئے تھے۔ اُنہوں نے خدا سے نہایت دل سوزی سے دُعائیں کیں لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا کہ اُنہیں گھر کا آرام کبھی میسّر ہو۔ اُنہیں بیوی بچوں سے والہانہ محبت تھی، اور اِس سے دل پر ایسا صدمہ ہوا جو بیان سے باہر ہے۔ اُن کا دماغ اِس خیال سے پریشان رہتا تھا کہ شاید وہ مستقبل میں خدا کی اِس طرح خدمت نہ کرسکیں گے جس طرح وہ گزشتہ دو سال سے کرتے رہے تھے۔

میاں صاحب اپنی رفیقۂ حیات میں جنون کے آثار دیکھتے اور بہت کُڑھتے، کیونکہ اُن کی اہلیہ کی زندگی پر اب مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہوگئی تھیں۔ دیوانگی کے آثار بعض اوقات ایسے ظاہر ہونے لگے کہ چیٹر جی نے یہی مناسب خیال کیا کہ وہ واپس نارووال چلے جائیں۔ اُن کے جانے کے بعد میاں صاحب اپنے دیرینہ دوست ڈاکٹر دینا ناتھ پریتو دِتّا کے پاس گئے اور اُنہیں یہ داستان سُنائی۔ یہ سب احوال سُن کر ڈاکٹر دِتّا کو بھی صدمہ ہوا، کیونکہ اُنھوں نے ہی کہہ سُن کر یہ شادی کروائی تھی۔ لیکن اُن دنوں میں کسی کو یہ گُمان بھی نہ تھا، اور نہ بیٹی کو ہی اِس بات کا علم تھا کہ اُس کے خاندان میں جنون کی بیماری ہے ورنہ وہ خود شادی نہ کرتی۔ آخر اُس نے بڑی مُشکلوں سے شادی کرنے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ دونوں دوستوں نے گھُٹنے ٹیک کر نہایت عاجزی اور زاری

سے خدا کے حضور دُعا کی کہ اگر تیری مرضی ہو تو خاندان کو اِس مُوذی مرض سے نجات دے۔

دہلی تک کا دوبارہ دورہ

دُعا کے بعد سب خاندان کی زندگیاں خدا کے ہاتھوں میں سونپ کر احسان اللہ روح کی ہدایت پا کر پنجاب کی مشرقی جانب کے شہروں میں گئے تا کہ جالندھر، لُدھیانہ، انبالہ، کرنال، دہلی وغیرہ کی جماعتوں میں دَورہ کر کے اُن کے ایمان کو پُختہ کرنے کا وسیلہ ہوں۔ اپنی رفیقۂ حیات کے مرض کی خبر سے جو سکون ہل گیا تھا وہ خداوند کے غیر فانی الفاظ سے پھر توازن پر آ گیا کہ

> تمہارا دل نہ گھبرائے... مَیں تم کو یتیم چھوڑ کر نہیں جاؤں گا... مَیں تمہارے پاس سلامتی چھوڑے جاتا ہوں، اپنی ہی سلامتی تم کو دے دیتا ہوں۔ اور مَیں اِسے یوں نہیں دیتا جس طرح دُنیا دیتی ہے۔ تمہارا دل نہ گھبرائے اور

> نہ ڈرے۔... مَیں باپ کو پیار کرتا ہوں اور وہی کچھ کرتا ہوں جس کا حکم وہ مجھے دیتا ہے۔ اب اُٹھو، ہم یہاں سے چلیں۔ (یوحنا 14:1، 18، 27، 31)

یہ پیشِ نظر رکھ کر وہ اُٹھے اور جگہ بہ جگہ گئے۔ اب اُنہیں ایک اَور طرح کا تجربہ حاصل ہو گیا تھا جو عمیق تھا۔ اِس نئے تجربے نے اُن کی روحانی زندگی کو اَور بھی گہرا کر دیا۔ نتیجے میں وہ جہاں بھی گئے اُن کے جوش کی تڑپ نے ہر جگہ آگ لگا دی۔ اُنہوں نے پہلے بھی اِن جماعتوں کو جھنجھوڑا تھا تاکہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوں۔ لیکن ؎

> ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں!

میاں صاحب نے آگے سے بھی زیادہ جوش و خروش کے الفاظ میں جماعتوں اور اُن کے خادموں کو اُن کی ذمّے داریوں کی طرف متوجّہ کیا۔

اُنہوں نے اُنہیں پھر یاد دلایا کہ روحانی آزادی ہر جماعت کا حق ہے، اور ذمے داری اور حق جڑواں بھائی

ہیں۔ ہر حق کے ساتھ ذمے داری وابستہ ہے۔ اگر اُستاد کا یہ حق ہے کہ اُسے ماہوار آمدنی ملے تو اُس کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ طلبا کو دل و جان سے پڑھائے۔ اگر والدَین کا حق ہے کہ بچے اُن کی باتوں پر کان دھریں تو اُن پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ خدا کے حُکموں کے مطابق اُن کی تربیّت اور پرورش کریں۔ اِن ذمے داریوں کے پورا کرنے میں ہر قسم کی مُشکلات جماعت کو پیش آئیں گی۔ لیکن خدا سے توفیق پا کر وہ اُن پر غالب آ جائیں گے۔ میاں صاحب نے راولپنڈی کی مثال دے کر کہا کہ خدا کرے کہ آپ میں بھی یہی لہر چل جائے۔

اُن کی بے لاگ صفائی کی باتیں جماعت کے بعض راہنماؤں کو ایک آنکھ نہ بھاتیں۔ کیونکہ اُن میں مسیحی اخلاص کی جگہ ریاکاری اور دکھاوے نے لے رکھی تھی۔ اُن کا سرمایۂ پیشوائی نمائش اور چپڑی باتیں کرنا تھا۔ ایسے اصحاب کو روحانی جوش کس طرح پسند آ سکتا تھا۔

مغرب زدہ اور فیشن پرست عیسائی بھی اُن کی جماعت کی آزادی کی داستانوں سے اُکتا جاتے تھے۔ جب دینی بزرگوں کا یہ حال ہو گا تو اُن کے پیچھے چلنے والوں کا کیا حال ہو گا؟ احسان اللہ بار بار تاکیداً سمجھاتے کہ جماعت کی زندگی کے بقا کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ مغرب کے سونے کی زنجیروں اور انگریزی رسوم و رواج اور برطانوی سماجی طرزِ معاشرت سے آزاد ہو، کہ وہ ہندوستانی بن کر رہیں۔

لیکن لوگوں کی قسم قسم کی رُکاوٹیں جو احسان اللہ کے آگے ہر شہر میں آتی تھیں، اُن کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کی بجائے کوڑے کا کام دے کر اُن میں حد سے زیادہ جوش پیدا کر دیتی تھیں۔ یہ جوش ہر جگہ زلزلے اور طوفان برپا کرتا چلا جاتا تھا۔

[a] منہ

کوئی اُن کے وعظوں اور تقریروں کو سُن کر خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ اُن کے دل پر کس قدر کاری زخم لگ چکا ہے جس کے نشان وہ ہر وقت اپنے اندر لئے پھرتے تھے۔ خداوند کا شفا کا ہاتھ اِس زخم کو مندمل کر رہا تھا، اور وہ اُس صدمے کو پورے صبر اور سکون کے ساتھ خاطر جمعی سے برداشت کر رہے تھے۔ اُن کی بے حالی اور پریشانی خدا کے فضل سے ختم ہو چکی تھی، کیونکہ اُنہیں خدا کی محبت کا احساس روز بروز خدا کے زیادہ قریب لاتا جا رہا تھا۔

10

یورپ اور امریکہ کا دورہ

امریکہ آنے کی دعوت

گُزشتہ باب میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ 1896ء میں جو جلسے احسان اللہ نے سیالکوٹ میں کئے تھے اُن کا مستقل اثر ایک تو یہ ہوا کہ سیالکوٹ کنونشن کا بنیادی پتھر قائم کیا گیا۔ دوسرا اثر یہ ہوا کہ پنجاب کی جماعت میں اپنی مدد آپ کی تحریک شروع ہوگئی۔ بیداری کی یہ لہر یو۔پی مشن کے پردیسی مشنری مردوں اور عورتوں کو بھی بہا لے گئی۔ اُن کی

زندگیوں کی کایا پلٹ گئی۔ خاص کر مِس کیمبل جو اُن دنوں حاجی پورہ سکول کی پرنسپل تھیں اور بعد میں پٹھان کوٹ کے گرلز سکول کی پرنسپل ہوئیں۔ وہ میاں صاحب کی چیلی ہوگئیں اور اُن کے ساتھ ساتھ مختلف شہروں، قصبوں اور گاؤں میں دَورہ کرتی رہیں۔ اُنہوں نے اپنے گھر اور خاندان کے افراد کو اُس تبدیلی کی خبر دی جو میاں صاحب کی عظیم شخصیّت نے اُن کی زندگی میں پیدا کر دی تھی۔ یہ پڑھ کر اُنہوں نے مِس کیمبل کی جماعت اور اُن کی سہیلیوں کو اُن کا خط دکھایا جس میں مِس کیمبل نے میاں صاحب کی زندگی کے واقعات، اُن کی گدایانہ حالت، اُن کے روحانی لیکچروں کی عظمت اور اُن کی اپنی زندگی کی کایا پلٹ جانے کا ذکر کر کے لکھا،

اُن سے میری مُلاقات میری زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اُنہوں نے خداوند مسیح کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ سیالکوٹ میں جون 1896ء میں اُنہوں نے جلسے کیے۔ اُن

جلسوں کی ہنگامہ خیز تقریروں میں روح القدس کی زبان تھی جن کے الفاظ میں حیرت انگیز قدرت تھی۔ سیمنری کے طلبا میں تو آگ لگی، اور جلسوں سے واپس آ کر وہ ہر وقت دُعا اور انجیل کے سُنانے میں مشغول رہنے لگے۔ میاں صاحب نے سکولوں اور عبادت گاہوں میں بھی وعظ کئے جن سے سُننے والوں کے دل زخمی ہو گئے۔ ہر جگہ گناہوں کے اقرار ہونے لگے اور گریہ و زاری کی آواز ہر کونے سے آتی تھی۔

اِس خط کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ کے شہر پٹس برگ کی جماعت احسان اللہ سے ملنے کی نہایت مشتاق ہوگئی۔ وہاں کے خادموں نے مِس کیمبل کو لکھا کہ اگر احسان اللہ یہاں آئیں تو جماعت اُن کے اور اُن کے تمام خاندان کے کُل اخراجات خوشی سے برداشت کرے گی۔

جب مِس کیمبل کو یہ خط ملا تو وہ فوراً نارووال آئی اور اُس نے کہہ سُن کر میاں صاحب کو خاندان سمیت امریکہ جانے پر رضامند کرلیا۔ میاں صاحب نے ڈاکٹر دِتّا کو لکھا تو اُنہوں نے

بھی اتّفاق کیا اور کہا کہ ممکن ہے کہ امریکہ کے ڈاکٹر آپ کی رفیقۂ حیات کا کوئی علاج بھی کرسکیں۔ چنانچہ میاں صاحب نے امریکہ جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

انگلینڈ کا دورہ

اتّفاق سے اپریل 1899ء میں لندن کی چرچ مشن کی صد سالہ برسی ہونے والی تھی۔ جب یہ سوسائٹی شروع ہوئی تھی اُن ایّام میں مشنریوں کو برٹش انڈیا کے اندر داخل ہونے کی برٹش سرکار کی طرف سے ممانعت تھی، لیکن اِس بات کو اب سَو سال ہو چکے تھے اور ہندوستان میں چرچ مشن کے 92 صدر مقام قائم ہو گئے تھے۔ چنانچہ سوسائٹی کے راہنماؤں نے یہ مناسب سمجھا کہ ہمارے ملک کے نمائندے بھی اِس صد سالہ برسی میں حصّہ لیں۔

کلارک پنجاب چرچ مشن کے سکریٹری تھے۔ جب اُنہوں نے سُنا کہ میاں صاحب امریکہ جا رہے ہیں تو اُنہوں نے

یہ تجویز کی کہ احسان اللہ راستے میں انگلینڈ میں کچھ دیر کے لئے رُک کر مارچ سے مئی تک جا بہ جا لیکچر دیں تاکہ لوگ پنجاب کی جماعتوں سے واقف ہوں اور کہ میاں صاحب صد سالہ برسی میں پنجاب کی طرف سے نمائندہ ہوں۔ اِس تجویز کو میاں صاحب نے خوشی سے منظور کر لیا۔ قبلہ واعظ لکھتے ہیں،

اُس وقت احسان اللہ امریکہ جا رہے تھے تو ہماری مشن کے کارکُنوں نے سوچا کہ اُنہوں نے لندن سے ہو کر جانا تو ہے ہی۔ وہ اِس بڑے جلسے میں بھی مشن کے نمائندہ ہو کر چلے جائیں۔ کام مُفت میں بن جائے گا۔

جب یہ خبر لندن پہنچی تو وہاں قیامتِ صُغریٰ برپا ہو گئی۔ احسان اللہ کی آزاد طبیعت کی دُھوم مچی ہوئی تھی۔ جب وہ پہلے جنرل بوتھ کے ساتھ انگلینڈ گئے تھے تو اُن کے وہاں ہونے سے اور اُن کی تقریروں سے چرچ کے لوگ نالاں تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے جھٹ پٹ تار کے ذریعے پوچھا کہ وہ یہاں

آ کر کیا بولے گا ؟ اُسے مشن کے قاعدوں اور قیود کے خلاف زبان بند کرنی ہوگی۔

اب یہ ٹیڑھی کھیر تھی۔ احسان اللہ نے مجھ سے پوچھا کہ بھائی واعظ۔ مَیں کیا جواب لکھ بھیجوں ؟

مَیں نے کہا، "جواب صاف ہے جو نبی نے اخی اب کے ایلچی کو دیا تھا۔ لکھ بھیجو کہ جو کچھ خداوند مجھے فرمائے گا مَیں وہی کہوں گا۔"

بس اُنہوں نے یہی لکھ بھیجا۔ اِس پر کوئی اعتراض ہی نہیں کرسکتا تھا۔ مشن والوں کو منظور کرنا پڑا۔

احسان اللہ بیوی بچوں سمیت انگلینڈ پہنچے۔ چرچ مشن والوں نے مصلحت اِسی میں دیکھی کہ اُن کا خیر مقدّم بڑے تپاک سے کیا جائے۔ اُنہوں نے وہاں تین ماہ گُزارے اور انگلینڈ کے بڑے بڑے شہروں میں وعظ و نصیحت کرتے رہے۔ وہ جس جگہ گئے وہاں کی جماعت میں جُنبش آ گئی۔

اپریل کی صد سالہ برسی میں ہندوستان کی طرف سے چار ہندوستانی خادموں نے نمائندگی کی۔ ایک سیتل صاحب اور دوسرے ایس۔ نہال سنگھ صاحب تھے۔ تیسرے مدراس کے مشہور روحانی خادم ڈبلیو۔ڈی کلارک صاحب اور چوتھے احسان اللہ تھے۔ ہر ایک نے البرٹ ہال کی عبادت میں حصّہ لیا جس میں خدا کی تعریف اور شکرگُزاری کی گئی۔ اِس کے بعد کے جلسوں میں چاروں خادموں کو دس دس منٹ تک تقریریں کرنے کا موقع دیا گیا۔ جب احسان اللہ کی باری آئی تو اُنہوں نے فرمایا،

آپ سُن چکے ہیں کہ مَیں پہلے مسلمان ہوا کرتا تھا، اور مسلمان بھی کٹر قسم کا تھا۔ میرے والدین بھی نہایت کٹر اور متعصّب مسلمان تھے۔ موروثی عقائد کے جمود اور تقلیدی ایمان نے مجھے اندھا کر رکھا تھا، اور مَیں انجیل کا سخت مخالف تھا۔ اُس خدا کی تعریف ہو جس نے اپنے بندوں کی مسیحی زندگی کے ذریعے میری آنکھوں پر سے پٹیاں کھول دیں اور مجھے دُھندلے طور

پر راہ کا سُراغ نظر آنے لگا۔ کتابِ مقدّس اور قرآن کا موازنہ کرنے پر میرے دل میں شکوک پیدا ہو گئے۔ اُنھوں نے میرے تقلیدی عقائد کی دیواروں میں رخنے ڈال دیئے۔ سرگشتگیوں کے بہت سے مرحلے طے کرنے کے بعد میری عقل نے مجھ پر ظاہر کر دیا کہ مسیحی ایمان ہی سچا مذہب ہے، اور اِس کے دلائل و بُرہان سے مَیں قائل ہو گیا۔ لیکن مجھے یہ شرم سے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ جب مجھے پپتسمہ ملا تو عقل ہی میری اکیلی راہنما تھی۔ اِس واقعے کے دو سال بعد مجھ پر یہ حقیقت کُھلی کہ خداوند مسیح گناہوں سے نجات دے کر حقیقی روحانی زندگی بھی عطا فرماتا ہے۔

جب خدا نے میرے دل کو چھوا تو مَیں نے دل و جان سے اُس کا شکریہ کیا کہ مَیں اب اُس کا لے پالک بیٹا ہونے پر فخر کر سکتا ہوں۔ خدا مجھے حلقۂ اسلام سے نکال کر اپنے بیٹے کے نور کی حیرت انگیز روشنی میں لے آیا ہے۔ اُس خدا کی ابد الآباد تعریف ہو۔ مَیں اُس کی معرفت کا نہ صرف زیادہ علم حاصل کرنا چاہتا ہوں بلکہ اپنے دل میں اُس کا روز بروز زیادہ

احساس کرنا چاہتا ہوں۔ میری یہی خواہش ہے کہ مَیں ہر ایک کو اُس کی نجات کی خوش خبری سُناؤں۔ میرے دو بھائی اَور ہیں جو ایسے کٹر نہیں ہیں جیسا کٹر مَیں تھا۔ خدا کرے کہ وہ بھی میری طرح اپنے نجات دہندہ کے قدموں میں آجائیں...

مَیں سُنتا ہوں کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو مسیحی ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اسلام کی الف۔بے سے بھی واقف نہیں ہوں گے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان مسیح کو مانتے ہیں۔ لیکن وہ اُسے صرف نبی ہی جانتے ہیں پر اُسے خداوند نہیں مانتے اور نہ قرآن کی رو سے اُسے خداوند مان سکتے ہیں۔ ہم پر واجب ہے کہ خدا کی محبت سے سرشار ہو کر اور مسیح کی سی محبت سے مجبور ہو کر مسلمانوں کے درمیان نجات کے پیغام کی خوش خبری سُنائیں اور اُنہیں مسیح کے قدموں میں لائیں...

جماعت میں ایسے لوگوں کی بھی سخت ضرورت ہے جو خدا کی قُدرت اور انجیل کے جوش سے معمور ہو کر مختلف ممالک کے نام نہاد مسیحیوں کو صلیب کے پاس لائیں۔ مَیں اقرار کرتا ہوں

کہ پنجاب کے مسیحیوں میں ابھی ہر طرح سے خداوند مسیح کی خدمت کرنے کی روح نہیں آئی۔ ہمارے لئے دُعا کریں تا کہ ہماری جماعتوں میں جوش پیدا ہو اور وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر مسیح کی روح سے معمور ہوتے جائیں۔ اُنہیں یہ احساس ہو جائے اور وہ اپنی زندگیوں کو مسیح کی زندگی کے نمونے پر ڈھالیں...

مَیں یہ بھی آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری جماعتیں تب ہی مضبوط اور توانا ہوں گی جب وہ مغرب کے خیالات کے بندھنوں سے آزاد ہو کر ہندوستانی بن کر رہیں گی۔ مسیح مشرق کے رہنے والے تھے، اور اگر مشرقی ممالک کے سامنے مسیح کو اُس کے مشرقی لباس میں ہی پیش کیا جائے تو وہ اُسے زیادہ آسانی سے قبول کرسکیں گے۔ ہندوستان کو اِس بات کی سخت ضرورت ہے کہ مسیحی ایمان میں ہندو مسلم تہذیبوں کا سنگم ہو جس طرح الٰہ آباد میں دریائے گنگا اور دریائے جمنا کا سنگم ہے۔ یہ لازم ہے کہ ہمارے ملک میں ہندوستانی جماعت قائم اور زندہ ہو جائے۔ ہندوستان کو انگلینڈ کی چرچ

آف انگلینڈ درکار نہیں۔ ہاں، ہمیں اِس بات کی ضرورت ہے کہ ہندوستان کی آزاد جماعت چرچ آف انگلینڈ کے ساتھ رفاقت رکھے۔

مَیں آپ کو خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ اپنے تفرقوں کو ہمارے ملک میں نہ لاؤ اور مشرقی ممالک میں مشرقی مسیح کو اپنا قدم جمانے دو۔ تب ہندوستان کے لوگ بھی یہ جان لیں گے کہ مسیحی ایمان ہمارے اپنے دیش کا مذہب ہے اور انگریز فاتحین کا مذہب نہیں ہے۔ وہ مشرقی مسیح کے مذہب کو مغرب کا بدیشی مذہب تصور کرتے ہیں، کیونکہ مسیحی ایمان کا لباس انگریزی ہے۔ اُس کے عقائد انگریزی خیالات میں رنگے ہوئے ہیں، اور اُس کی جماعت کی رسوم سب کی سب مغرب کی ہیں۔ اُس کے خادموں کے مذہبی لبادے تک مغربی ہیں۔ کاش کہ وہ دن جلد آئے جب مشرق کے رہنے والے مسیح کا نظارہ ہمارے لوگوں کو اُن کے اپنے مشرقی لباس میں نصیب ہو گا۔ تب وہ خداوند کی نجات کا علم حاصل کرنے میں کج فہمی سے کام نہیں لیں گے...

مَیں آپ سب کا ممنون ہوں کہ آپ نے نہایت صبر اور سکون سے میری باتیں سُنی ہیں۔ آپ کی چرچ مشن کے ذریعے مَیں اپنے نجات دہندے کے قدموں میں آیا...مَیں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنی شکرگزاری صرف اِس طریقے سے ظاہر کر سکتے ہیں کہ ہم اپنی زندگیوں کو نجات کے پیغام کے پھیلاؤ کی خاطر وقف کر دیں۔ تب آپ کو بھی حقیقی خوشی حاصل ہو گی اور خدا کے نام کی عزت اور اُس کا جلال ہو گا۔

امریکہ کا دورہ

چرچ مشن کی صد سالہ برسی کے بعد احسان اللہ لندن سے امریکہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ چونکہ وہ پنجاب کے خادم تھے اِس لئے نہ صرف پٹس برگ کی جماعت بلکہ دیگر شہروں کی جماعتیں بھی اُن سے ملنے کی بڑی خواہش مند تھیں۔ کیونکہ اُنہوں نے اخباروں میں اُن بڑے اور عظیم کاموں کو پڑھا

تھا جو خدا نے اُن کے ذریعے پنجاب، شمالی ہندوستان اور انگلینڈ میں کئے تھے۔

احسان اللہ نے بھی مشہور و معروف واعظ ڈی۔ ایل موڈی کی شہرت سُن رکھی تھی، اور اُنہیں یہ شوق تھا کہ اُس کے قدموں میں بیٹھ کر روحانی برکات پائیں تاکہ بہتر طور پر خدمت کرسکیں۔ وہ پہلے مِس کیمبل کے گھر پٹس برگ شہر میں رہے اور وہاں وعظ و تقریریں کرتے رہے۔ وہاں کے لوگوں کے دل روحانی جوش سے بھر گئے اور ملکۂ سبا کی طرح کہنے لگے،

> جب تک مَیں نے خود آ کر یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ لیکن حقیقت میں مجھے آپ کی زبردست حکمت کے بارے میں آدھا بھی نہیں بتایا گیا تھا۔ وہ اُن رپورٹوں سے کہیں زیادہ ہے جو مجھ تک پہنچی تھیں۔ (2۔ تواریخ 6:9)

پٹس برگ سے اُنہوں نے مختلف شہروں کی عبادت گاہوں میں جا کر وعظ کیئے۔ ہر جگہ اُن کی ولولہ انگیز اور جوشیلی تقریروں کی دھوم مچ گئی۔ وہ موڈی کے پاس شکاگو میں رہ کر اُس کے ساتھ بھی شہر بہ شہر پھرتے، تقریریں کرتے اور اُس کے وعظ سُنتے رہے۔ اُنہیں خدا نے یہ بیش قیمت موقع عطا کیا تھا، اور اُن کی خواہش تھی کہ وہ اُس کے ساتھ کچھ مُدّت رہیں تاکہ واپس پنجاب جا کر جماعت کی اور انجیل کی خدمت بہترین طور پر کرسکیں۔ وہ اُس کے وعظ نہایت غور اورشوق سے سُنتے رہے۔

یہ بھی الٰہی انتظام تھا کہ یہ دونوں مردِ خدا ایک دوسرے کے روحانی تجربوں سے مستفیض ہوں، کیونکہ اُن کے امریکہ چھوڑنے کے چند ہفتے بعد موڈی کا انتقال ہو گیا۔ جب وہ

امریکہ سے واپس آئے تو موڈی کی چار مشہور کتابیں اپنے ہمراہ پنجاب لے آئے جو ہمیشہ پڑھا کرتے تھے۔[a]

اہلیہ پر دیوانگی کا غلبہ

موڈی کی ملاقات کے بعد وہ جب واپس اپنے گھر گئے تاکہ بیوی بچوں کو مل آئیں تو وہاں جا کر دیکھا کہ تالا لگا ہوا ہے۔ دریافت کرنے پر ہمسایوں سے معلوم ہوا کہ اُن کی اہلیہ ایک ہفتہ ہوا کہیں چلی گئی ہیں اور بچوں کو اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔ یہ سُن کر زمین میاں صاحب کے پاؤں تلے سے نکل گئی، کیونکہ اب جنون کی بیماری نے اُن کی رفیقۂ حیات پر غلبہ پا لیا تھا۔ اُنھوں نے امریکہ کے بہترین ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تھا، لیکن سب لاحاصل ثابت ہوا تھا۔ اب وہ حیران و پریشان ہو گئے کہ ایک اجنبی ملک میں جس کا رقبہ ہزاروں میل کا ہے وہ کس طرح اپنے خاندان کی تلاش کریں۔

[a] *Selected Sermons; Short Talks; Bible Characters; Thoughts on the Quiet Hour*

آخر ایک دوست نے صلاح دی کہ یہ کام کسی سُراغ رساں ایجنسی کے سپرد کر دیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ایسا ہی کیا اور خود بھی سراسیمگی کی حالت میں اِدھر اُدھر تلاش کرتے پھرے۔ اُنھیں دن رات خاندان کی فکر لگی رہتی تھی، اور ہر دم خدا سے دُعا کرتے تھے کہ اُن کا سُراغ کہیں مل جائے۔

سُراغ رساں ایجنسی نے امریکہ کی تمام ریاستوں کے سُراغ رسانوں کو اُن کے بیوی بچوں کے حُلئے وغیرہ بھیجے۔ آخر میں ایک سُراغ رساں کو ایک دن اُن کا بیٹا قربان ملا جو مچھلیاں پکڑ کر اُنھیں بازار میں بیچ رہا تھا۔ اُس نے قربان سے حالات دریافت کئے اور اُس کے جس جگہ وہ رہتا تھا گیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو چھوٹا بیٹا نذیر بھی اخبار لے کر گھر کی طرف آ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ ماں اور بیٹی اندر بیٹھی ہیں جبکہ لڑکے مچھلیاں اور اخبار بیچ کر اشیائے خوردنی بازار سے خرید لاتے ہیں۔ سُراغ رساں اندر گیا تو اُس پر یہ راز کُھل گیا کہ

ماں بے چاری مرضِ جنون میں مُبتلا ہے اور بے اختیاری کی حالت میں گھر سے پانچ سو میل دُور بچوں کو اپنے ہم راہ لے آئی ہے۔ اُس نے ایجنسی کو تار دیا۔ میاں صاحب تار پاتے ہی بیوی بچوں کے پاس پہنچ گئے اور خدا کا شکر کیا۔

کینیڈا اور یورپ سے ہو کر واپسی

حالات کے پیشِ نظر احسان اللّٰہ نے یہی بہتر خیال کیا کہ جتنی جلدی ہو سکے واپس وطن کو چل دیں۔ لیکن امریکی اخباروں کے ذریعے اُن کی شُہرت نہ صرف امریکہ کی مختلف ریاستوں میں بلکہ ملکِ کینیڈا میں بھی پہنچ چکی تھی۔ کینیڈا کے عیسائیوں نے اُن سے وعدہ لے لیا ہوا تھا کہ وہ امریکہ سے لوٹتے وقت کینیڈا کی جماعتوں اورشہروں میں ضرورتقریریں کریں گے۔ چنانچہ وہ امریکہ سے کینیڈا کے ملک کو روانہ ہو گئے جہاں اُنھوں نے مانٹریال اور ٹورونٹو کے شہروں میں چند ہفتے قیام کیا۔

اُس ملک میں اُن کی اہلیہ کی طبیعت قدرے سنبھل گئی۔ وہ اِن دوشہروں کو صدر مقام بنا کر جگہ جگہ کا دَورہ کرتے رہے۔ جس جس جگہ بھی وہ گئے خدا نے اُن کی زبان کو استعمال کیا، اور جماعتیں ازسرِنَو شگفتہ ہوگئیں۔ اُنہوں نے اپنی زندگیوں کو خدا کی خدمت اور انجیل پھیلانے کے لئے مخصوص کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ جلسے کام یاب ہو رہے تھے، اور لوگ میاں صاحب کی آمد کے لئے خوشی اورشکر گُزاری کا اظہار کر رہے تھے کہ اچانک اُن کی رفیقۂ حیات کی بیماری عروج پر آئی۔ یہ دیکھ کر کینیڈا والوں نے با دل ناخواستہ اُنہیں رُخصت کیا اور وہ وطن کی جانب روانہ ہو گئے۔ جنوری 1900ء میں وہ واپس لندن پہنچ گئے۔

لندن آ کر بیگم کی طبیعت بہت کچھ سنبھل گئی، اِس لئے میاں صاحب نے دوستوں کے اصرار پر وہاں دو ماہ قیام کرنا اور مختلف شہروں میں جا کر تقریریں کرنا منظور کر لیا۔ اُن کی

اپنی بڑی خواہش تھی کہ جنرل بوتھ سے ایک بار پھر ملاقات کریں اور اُن سے روحانی فیض پائیں۔ اِس کے علاوہ وہ چارلس سپرجن کی عبادت گاہ بنام ٹیبرنےکل دیکھ کر اُن کے جانشین ٹامس سپرجن اور اُن کے احباب سے ملاقات کرکے اُن کی نسبت استفسار کرنا چاہتے تھے۔

اُنہوں نے دو ماہ کے قریب وہاں قیام کیا۔ اُن کی رفیقۂ حیات کی بہت خواہش تھی کہ وہ واپسی پر پیرس اور فرانس کو دیکھیں۔ میاں صاحب کو اُن سے بہت محبت تھی، اور وہ ہمیشہ اُنہیں پیار کے اَلقاب اور محبت سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ اُن کے مرض کی وجہ سے وہ اَور بھی ملائمت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اُن ہی کی خواہش کی خاطر اُنہوں نے یہ بات منظور کر لی اور لندن سے پیرس کے لئے روانہ ہوئے۔

فطرت نے بیگم احسان اللہ کی طبیعت میں آرٹ، نقّاشی اور دیگر خوب صورت عمارتوں وغیرہ سے وابستگی ڈال رکھی تھی۔ فرانس میں جا کر جب اُنہوں نے قدیم گرجے، شاہانہ عمارتیں

اور آرٹ وغیرہ کے کام دیکھے تو وہ عش عش کرنے لگیں۔ میاں صاحب اُن کا دماغی توازن دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لائے۔

فرانس سے وہ اٹلی گئے جہاں کے نظاروں نے سب کے دلوں کو موہ لیا۔ وہ مذہبی زیارت گاہوں کو بھی دیکھنے گئے اور مقدّس مقامات کی زیارت کے بعد ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے۔ جون 1900ء میں وہ خیریت سے ممبئی پہنچ گئے۔

ممبئی میں آنا تھا کہ اُن کی رفیقۂ حیات کا مرض بڑے زور سے عروج پر آیا۔ وہ ممبئی شہر کی جانب بھاگ نکلیں، لیکن اب اُن کے دونوں لڑکوں قربان اور نذیر کو تلخ تجربہ ہو چکا تھا، اور وہ چوکس رہتے تھے۔ اُنہوں نے فوراً اپنے والد کو جو ریل کے ٹکٹ خریدنے گئے ہوئے تھے اطلاع دی تو میاں صاحب اُن کا پیچھا کرکے اُنہیں واپس لے آئے۔ وہ ممبئی

سے سیدھے ہوشیار پور آ گئے جہاں اُن کے قدیم دوست ڈاکٹر دینا ناتھ پریتو دِتّا سِول سرجن تھے۔

11

جھنگ بار کی خدمت

بیٹ من کی دعوت

جب سفر کی تکان ختم ہوئی تو ڈاکٹر دتّا نے احسان اللّٰہ سے یورپ اور امریکہ کے تجربات کا حال پوچھا۔ دونوں مُدّت تک اُن جلسوں کا ذکر کرتے رہے جو لندن اور انگلینڈ، امریکہ اور کینیڈا کے شہروں میں ہوئے تھے۔ پھر میاں صاحب نے ڈی۔ایل۔ موڈی کی تحریک کا ذکر کیا اور کہا کہ

خدا نے اُس کے ذریعے مجھے اپنی قُربت حد سے زیادہ بخشی ہے۔

جب ڈاکٹر صاحب نے اُن کی رفیقۂ حیات کے دماغی توازن کی نسبت پوچھا تو گو میاں صاحب اپنی طبیعت کو ضبط میں رکھنے کے عادی تھے تاہم اپنے لڑکپن کے دوست سے جو بھائی کے برابر اُن سے محبت رکھتا تھا، اپنے آنسو چُھپا نہ سکے اور طبیعت پر قابو نہ پا کر بے اختیار رونے لگے۔

جب طبیعت کچھ سنبھل گئی تو اُنھوں نے سب باتیں تفصیلاً بتائیں جو اُن کی اہلیہ پر امریکہ، کینیڈا، انگلینڈ اور گزشتہ ہفتے ممبئی میں گُزری تھیں۔ اِس کے بعد میاں صاحب کہنے لگے، ”بھائی دینا ناتھ۔ معلوم نہیں خدا کی کیا مرضی ہے۔ مَیں تو یہ چاہتا ہوں کہ پہلے کی طرح فقیرانہ زندگی بسر کرکے جماعت اور انجیل کی خدمت کروں۔ لیکن اِن حالات کے پیشِ نظر مَیں لویزا کو اور بچوں کو کس طرح اکیلا چھوڑ سکتا ہوں؟ تم جانتے ہو مجھے اُس کے ساتھ سچی محبت ہے، اور مَیں نے

نکاح کے وقت خدا اور اُس کی جماعت کے رو برو وعدہ کیا تھا اور اُس کے ساتھ بھی قول و قرار کیا تھا کہ جب تک موت مجھے اُس سے جُدا نہ کرے خدا کے حکم کے مطابق بھلائی اور بُرائی، ناداری اور خوش حالی، بیماری اور تندرُستی میں اُس سے محبت رکھوں گا اور اُس کی خاطر و مدارات کیا کروں گا۔ مَیں نہ اِس کو چھوڑ سکتا ہوں نہ بچوں کی ذمے داری کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر سکتا ہوں، اور نہ مَیں خدا کی جماعت کی خدمت اور انجیل پھیلانے کے فرض کی آواز کی طرف سے اپنے کانوں میں اُنگلیاں ڈال سکتا ہوں۔ مَیں عجب اُلجھن میں پھنسا ہوں، میری جان نڈھال ہو رہی ہے اور مستقبل تاریک ہے۔ مجھے صلاح دو کہ کیا کروں۔"

ڈاکٹر دتّا نہایت دین دار اور خدا پر ایمان رکھنے والے شخص تھے۔ دونوں نے کمرے کا دروازہ بند کر کے گھُٹنوں کے بل خدا کے حضور نہایت دل سوزی سے دُعا کی اور اپنا دل ہلکا کر کے اُٹھے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تیسرے روز ڈاکٹر دتّا کو بیٹ من کا خط جھنگ بار سے آیا کہ "جب احسان ہندوستان سے آئے تو مجھے اطلاع دینا۔ مجھے اُس کی سخت ضرورت ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے یہ خط میاں صاحب کو دیا اور کہا، "بھائی احسان، یہ لو۔ خدا نے ہماری دُعاؤں کا جواب دے دیا ہے۔ بیٹ من کی تبدیلی جھنگ بار ہو گئی ہے۔ سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے ہزاروں مسیحی جن میں تم گزشتہ دس سال سے کام کرتے رہے ہو نقلِ مکانی کرکے وہاں چلے گئے ہیں اور اُس نئی آبادی میں رہتے ہیں۔ وہاں تم اپنے کام کو جاری بھی رکھ سکو گے اگرچہ آزادانہ فقیری کی حالت میں زندگی بسر نہیں کرسکو گے۔ لیکن تم لویزا کو اور بچوں کو، جیسا تمہارا خیال ہے، اپنے پاس رکھ سکو گے اور خدا کی خدمت اور انجیل پھیلانے کا کام اپنی مرضی کے مطابق کرسکو گے۔ تمہاری طبیعت تو یہ چاہتی ہے کہ فقیرانہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آزادانہ پھرو اور خدا کی خدمت کرو۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ خدا تم سے اب فقیری کی حالت میں خدمت لینا نہیں چاہتا۔ خدا کا انتظام انسانی ادراک سے بُلند و بالا ہے جس میں چُوں و چرا کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ رضائے الٰہی مقدّم ہے۔ آخر آزادانہ خدمت کا واحد طریقہ تو ہے نہیں۔ اب خدا تم سے دوسری قسم کی خدمت لینا چاہتا ہے، اِس لئے اُس نے یہ دروازہ کھول دیا ہے۔"

احسان اللہ بیٹ مَن کا خط لے کر باہر ویرانے میں چلے گئے اور خدا سے دل و جان سے دُعا کی کہ اگر تیری مرضی ہے کہ مَیں تیرے بندے بیٹ مَن کے ساتھ کام کروں تو اپنی مرضی مجھ پر ظاہر کر اور میرے دل کو اپنے تابع فرمان کر دے۔ وہ گھنٹوں خدا کی درگاہ میں سجدے میں پڑے رہے اور نہایت عاجزی اور زاری سے دُعا میں کُشتی لڑتے رہے جب تک اُنہیں یہ احساس نہ ہوا کہ خدا نے مستقبل کی تاریکی کا پردہ پھاڑ کر اُنہیں اِس نئی خدمت کے لئے بُلایا ہے۔ تب مکان پر واپس آ کر اُنہوں نے اپنے روحانی باپ کو خط لکھا جس

کے جواب میں بیٹ من نے اُنہیں لکھا کہ بیٹا، میرے پاس ٹوبہ ٹیک سنگھ فوراً پہنچو۔ مجھے تمہاری امداد کی ضرورت ہے۔

اب ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہو گا کہ کن حالات اور مجبوریوں کے ماتحت اُنہیں آزادانہ کام اور خدمت چھوڑنی پڑی، کہ اُن کا چرچ مشن میں پھر واپس آنا کیسے ہوا۔

جھنگ بار میں خدمت کا آغاز

چناب کی نَو آبادی جس کو جھنگ بار بھی کہتے ہیں 1892ء میں شروع ہوئی۔ یہ علاقہ دریائے چناب اور دریائے راوی کے درمیان واقع ہے اورتقریباً تین ہزار پانچ سو مربع میل ہے۔ وہ زمانۂ قدیم سے غیر آباد تھا جس میں کہیں کہیں جنگلی لوگ بستے تھے جو خانہ بدوش تھے اور اپنے اونٹوں اور چارپایوں کو لے کر ہری چراگاہوں کی تلاش میں کوسوں نکل جایا کرتے تھے۔ پنجاب سرکار نے یہاں نہریں کُھدوائیں، بلکہ 1895ء میں ریلوے لائن بنانے کی تجویزیں بھی شروع

ہوئیں۔ دیہات کے خاکے تیار ہوئے جن کی سڑکیں چوڑی ہوں۔ پنجاب کے چاروں طرف سے ہندو، مسلمان اورسکھ اِس نَو آبادی میں نقلِ مکانی کرکے آگئے جن میں سے ہر ایک کو سرکار نے 217 ایکڑ زمین عطا کر دی۔ اِن میں سے بہت ایسے اشخاص تھے جو اکیلے زراعت نہیں کر سکتے تھے۔ لٰہذا اُنہوں نے اپنے پرانے علاقوں اور گاؤں سے مزدوروں کو آنے کے لئے کہا۔ اِس کے علاوہ کئی سَو میل لمبی نہروں کی کُھدوائی درکار تھی۔ لٰہذا اِن نَو آبادکاروں نے مزدوروں کو سالانہ اُجرت پر رکھ لیا جن کو وہ فصل کے بعد اناج مزدوری کے طور پر دینے لگے۔ اِن مزدوروں کی اکثریت چوہڑوں کی تھی جن کا آبائی پیشہ زراعت تھا۔ لیکن چونکہ سرکار نے اُنہیں زراعت پیشہ قوم قرار نہیں دیا تھا اِس لئے اُنہیں کوئی زمین نہ دی گئی اور نہ وہ ایک چپّہ زمین کے مالک ہو سکتے تھے۔ اِن چوہڑوں کے علاوہ مسیحی خاندان بھی امرتسر، گورداسپور،

سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے علاقوں سے نقلِ مکانی کر کے آ گئے اور غیر مسیحی مالکانِ اراضی کے خدمت گار ہو گئے۔ بعض مسیحی نسبتاً خوش حال بھی تھے۔ اُن کے پاس اپنے ہل اور حیوان تھے۔ چونکہ وہ غیر زراعت پیشہ قومِ چوہڑا میں سے عیسائی ہو گئے تھے اِس لئے وہ بھی زمین کے مالک نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر مسیحی مالکانِ اراضی سے زمین ٹھیکے پر لے کر زراعت کا کام کرنے لگے۔

1898ء میں چرچ مشن کے وائٹ بریخٹ اور سکاچ پرسبٹیرین مشن کے ڈاکٹر ینگسن اور یو۔پی مشن کے خادم مارٹن کی متحدہ کوششوں سے سرکار پنجاب نے چند چیدہ چیدہ عیسائیوں کو زمین کے قِطعے عطا کر دیئے جہاں چرچ مشن نے منٹگمری والہ اور بیٹ من آباد (عیسیٰ نگری) کے گاؤں بسائے۔ سکاچ مشن نے ینگسن آباد، یو۔پی مشن نے مارٹن پور اور رومی فرقے نے خوش پور قائم کئے۔ 1900ء تک یہ عیسائی اُن میں آباد ہو گئے۔ یہ مسیحی اپنے دینی استادوں اور

خادموں سے دُور بستے تھے۔ گو وہ اَن پڑھ اورجاہل تھے، لیکن اُن میں سے اکثر احسان اللہ کی بیداری کی لہر سے اور اُن جلسوں سے متأثّر ہو چکے تھے جو اُنھوں نے سیالکوٹ، گورداسپور، امرتسر اور گوجرانوالہ کے اضلاع کے شہروں اور گاؤں میں 1896ء سے تین سال تک فقیرانہ حالت میں کیے تھے۔ وہ اُن کی جوشیلی تقریروں اور اُن کی تعلیم کو نہ بھول سکتے تھے اور نہ بھولے۔ چنانچہ گو اُن نئی آبادیوں میں کوئی خادم نہ تھا جو اُن کی باقاعدہ عبادتیں کرواتا اور اُنہیں انجیل جلیل کی تعلیم دیتا تاہم اُن میں سے اکثر جگہ جگہ جمع ہو کر دُعا، عبادت اور زبور گانے کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔

بیٹ من مارچ 1897ء میں نارووال سے انگلینڈ چلے گئے، کیونکہ اُن کی رفیقۂ حیات انتقال کر گئی تھی، اور وہ اپنے بچوں کی خاطر وہاں 1899ء کے موسمِ خزاں تک رہے۔ جب وہ پنجاب ائے تو اُنہیں جھنگ بار کے علاقے پر مقرر ہوا۔ بیٹ من نومبر کے آخر میں جھنگ بار پہنچ گئے۔ اُنھوں نے

ٹوبہ ٹیک سنگھ کو اُس تمام علاقے کا صدر مقام بنا لیا۔ ڈاکٹر دتّا نے وہاں زمین خریدلیا اور سادہ مکانات بنوا کر چرچ مشن کو دے دیئے۔ اِن مکانات میں بیٹ من اور اُس کا کھانا پکانے والا اور اُس کی سواری کے اونٹ رہنے لگے۔ اُس نے وارث الدین کو اپنے پاس بُلا لیا۔ جب احسان اللہ خاندان سمیت ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچے تو ڈاکٹر دتّا نے سڑک کے کنارے پر دو کمرے اور بر آمدہ بنوا دیا۔

جون 1900ء میں بار کے اُس علاقے میں جو چرچ مشن کے متعلّق تھا تقریباً ایک ہزار گاؤں آباد ہو گئے تھے۔ اُن میں سے تقریباً 125 گاؤں میں کہیں کہیں عیسائی رہتے تھے جو تعداد میں تقریباً دو ہزار نفوس تھے۔ اُن میں سے تقریباً نصف تعداد اُن عیسائیوں کی تھی جو نارووال کے اردگرد کے گاؤں سے آئے تھے اور چرچ مشن اور یو۔پی مشن سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن میں سے متعدّد ایسے تھے جو پچھلے تین سے لے کر سات سالوں سے یہاں آئے ہوئے تھے۔ اُن کے گھروں میں

عورتیں بغیر نکاح کے رہتی تھیں، کیونکہ وہاں کوئی عیسائی نکاح خواں نہ تھا۔ یہ مسیحی اکثر ایک جگہ سے دوسری جگہ تلاشِ روز گار میں نقلِ مکانی کرتے رہتے تھے۔

جھنگ بار کے علاقے میں اُن دنوں نہ کوئی ریل تھی اور نہ پکّی سڑکیں۔ کچّی سڑکوں کے کہیں کہیں نشان تھے۔ چرچ مشن کے صدر مقام ٹوبہ ٹیک سنگھ سے یہ تینوں خادم گوجرہ، سمندری، سکندر آباد، عیسیٰ نگری (بیٹ مَن آباد) اور منٹگُمری والہ جایا کرتے تھے۔ راستے تو تھے نہیں۔ ہر طرف جنگل ہی جنگل تھے جو دُشوار گُزار اور ڈاکوؤں کی کھوہ تھے۔ اُنہوں نے کئی دفعہ اِن مردانِ خدا کو گھیر کر لُوٹ لیا۔ تمام علاقے میں شِدّت کی بے پناہ گرمی تھی۔ پانی پینے کے لئے کنوئیں تک نہ تھے، اور جو تھے وہ کھاری پانی کے تھے۔ بعض اوقات نہر کے بنگلوں میں بھی پانی دست یاب نہیں ہوتا تھا، کیونکہ راجبہا خشک ہوتا تھا۔ ایسے اوقات میں یہ مردانِ خدا جوہڑوں

سے گندا پانی جو حشرات الارض سے معمور ہوتا تھا لے کر اُسے اُبال کر پی لیتے تھے۔ کھانے کو جو میسّر ہوتا کھا لیتے اور خدا کا شکر کرکے جا بہ جا خدا کی جماعتوں کی خدمت کرتے رہتے تھے۔ گرمی کی شِدّت کو آسان کرنے کے لئے ایسی کالی آندھیاں چلتیں کہ انسان کی آنکھیں اپنے ہاتھوں کو نہ دیکھ سکتیں۔

سواری کے لئے اونٹ ہوتے تھے، اور سونے کے لئے مویشیوں کے استھان، درختوں کے سائے اور جھونپڑیاں مل جاتی تھیں۔ لیکن خدا کے یہ تینوں خادم درویش صفت تھے۔ اُنہیں نہ سردی کی پرواہ تھی، نہ گرمی کی۔ نہ بھوک کی، نہ پیاس کی، نہ آرام کا خیال تھا اور نہ آسائش کا۔ آرام کو یہ جانتے ہی نہ تھے۔ خدا نے تینوں کو جسم بھی ایسے بخشے تھے جو مضبوط تھے۔ خدا کی خدمت، جماعت کی محبت اور انجیل کے پھیلاؤ میں وہ ایسے سرشار رہتے تھے کہ وہ نہ بیماری کو خاطر میں لاتے تھے اور نہ تھکاوٹ کو جانتے تھے۔ وہ ایک سال میں

کئی کئی ہزار میل سفر کر جاتے تھے۔ چنانچہ 1900ء کے آخری ساڑھے 9 ماہ میں بیٹ من نے 2,386 میل پیدل سفر کیا تھا، اگرچہ اُس کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اِس جواں ہمّت بزرگ کا نمونہ اُس کے دونوں چیلوں کے لئے جو دینی لحاظ سے اُس کے بیٹے تھے کیا اثر رکھتا ہو گا۔ دونوں خدا کے فضل سے جوان اور تنومند، غیوّر، مسیح کے عاشق اور جاں فشانی سے کام کرنے والے تھے۔

احسان اللہ پیدل سفر کرنے اور محنت مشقّت کے عادی تھے۔ جھنگ بار میں وہ میلوں سفر کرتے نکل جاتے، رات کسی جھونپڑی میں یا درخت کے سائے کے نیچے بسر کرتے جب تک کہ وہ کسی بستی یا گاؤں میں نہ پہنچتے۔ وہاں پہنچ کر وہ مسیحیوں کے ساتھ اُن کی جھونپڑیوں میں رہتے جہاں اُن کے مویشی بندھے ہوتے تھے۔ وہیں راتوں کے وقت سوتے اور اُن کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتے تھے۔

اُن دنوں میں سفریّکوں، بہلیوں، گڈّوں، گھوڑوں اور اونٹوں پر کیا جاتا تھا۔ جب وہ مویشیوں کے پاس رات گُزارتے تو وہ لوگوں کو کہتے کہ جب خداوند مسیح اِس دُنیا میں آئے تھے تو وہ بھی ایک مویشی خانے میں آئے تھے۔ آپ کے ساتھ رہنا تو عزّت کا باعث ہے۔

مجھے یاد ہے کہ پچاس سال سے زائد عرصہ ہوا ہے تو مَیں احسان اللہ کے پاس ٹوبہ ٹیک سنگھ گیا۔ وہ کسی گاؤں جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ اُنہوں نے مجھے اپنے پیچھے اونٹ پر بٹھا لیا۔ تمام دن سفر کرتے رہے۔ سورج ڈوبنے کے بعد گاؤں پہنچے۔ جاتے ہی مَیں ایک جھونپڑی کے سامنے چارپائی پر لیٹ گیا اور تھکاوٹ کے مارے وہیں سو گیا، کیونکہ مَیں اِس سے پہلے کبھی اونٹ پر سوار نہ ہوا تھا۔ کھانے کے لئے اُنہوں نے مجھے جگایا۔ مَیں کھانا کھاتے ہی پھر سو گیا۔ گرمی شِدّت کی تھی۔ آدھی رات کے بعد گرمی کے مارے

میری جاگ کھُلی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میاں صاحب ایک چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ لوگ ارد گرد بیٹھے آپس میں جھگڑ رہے ہیں، اور وہ دو پارٹیوں میں صُلح کرا رہے ہیں۔ جب تک دونوں میں صُلح نہ ہوئی کوئی اُن کے پاس سے نہ کھسکا۔

لوگوں کے رُخصت ہونے کے بعد وہ دُعا میں لگے اور رات کے تیسرے پہر تک اپنے گھُٹنوں کے بل دُعا کرتے رہے۔ اُن کے سونے کے دو گھنٹے بعد آندھی چلنی شروع ہوئی۔ پرے بَیل بندھے تھے۔ پاس ہی کھاد مٹّی کا ڈھیر لگا تھا۔ بس کچھ نہ پوچھئے کہ ہمارا کیا حال ہوا۔ خدا خدا کرکے صبح ہوئی۔ مُرغ نے اذان دی تو وہ اُٹھے اور دُعا میں مشغول ہو گئے۔ دُعا کے بعد سب کی عبادت میں ہادی ہوئے۔ وعظ گوئی پر اُنہیں حاکمانہ قُدرت تھی۔ مَیں تب مسلمان تھا، اُن کی زندگی اور باتوں سے نہایت متاثّر ہوا۔ عبادت کے بعد سب چھوٹے بڑوں سے لُطف و محبّت کی باتیں کرتے رہے۔

اُن کی خاطر داری مُلاقات کرنے والوں کو بے حد متاثّر کرتی تھی۔ اگرچہ وہ لوگوں سے بڑی گرم جوشی سے ملتے تھے، لیکن ہر شخص اُن کی محفل میں زیادہ حدِ ادب کے حدود میں رہتا تھا۔ اُن کی مجلس میں لوگ ہمیشہ رکھ رکھاؤ اور وضع داری کا خیال رکھتے ہوئے نہایت مؤدّب انداز سے اُنہیں مخاطب کرتے تھے۔

جب مَیں امرتسر میں آرچ ڈیکن تھا تو ایک ضعیف العمر عیسائی مجھے ملنے آیا اور کہنے لگا،

مَیں نے سُنا ہے کہ آپ بڑے آرچ ڈیکن کے بھتیجے ہیں اور اب خود آرچ ڈیکن ہیں۔ مَیں نے اُنہیں فلاں گاؤں میں اُن کے تایا جی کے ساتھ دیکھا تھا جب وہ ابھی مسلمان تھے۔ وہ دن بہت اچھے تھے۔ تب وہ بزرگ ہمارے پاس راتوں جھونپڑیوں میں ٹھہرا کرتے تھے۔ اُن کے مزاج میں بڑی سادگی تھی۔ صاحبِ رائے اور مردم شناس، سُخن فہم تھے اور اصل بات کو فوراً تاڑ جاتے تھے۔ لیکن اب جو بزرگ ہیں

وہ موٹروں پر چھک چھک کرتے آتے ہیں اور جس طرح بچے
کبڈی کھیلتے وقت ہاتھ لگا کر بھاگ اُٹھتے ہیں اُسی طرح وہ
عبادت کرا کے چند ایک سے ہاتھ ملا کر موٹر میں بیٹھ، یہ جا،
وہ جا۔

یوں تو احسان اللہ جماعت اور انجیل جلیل کی خدمت کے لئے ہر جگہ مشہور تھے۔ لیکن جو خدمت اُنہوں نے جھنگ بار کے علاقے میں کی وہ آپ ہی اپنی مثال تھی۔ تمام جھنگ بار میں اُنہوں نے چپّا چپّا کا دَورہ کئی بار کیا۔ وہ خود محنت مشقّت سے کام کرتے تھے۔ اُن کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ اُن کے گاؤں کے ماتحت مُبلّغین بھی اپنی جماعتوں کی خدمت جاں فشانی سے محنت کر کے کریں۔ یوں وہ نہ صرف خود کام کرنے والے انسان تھے بلکہ اپنے ماتحتوں سے بھی کام لینا جانتے تھے۔ جو ماتحت کام سے گھبرانے والے نہیں تھے وہ اُن کے ساتھ کام کرنے میں فخر اور خوشی محسوس کرتے تھے۔ لیکن کام چور ماتحت کی جان نکل جاتی تھی۔ مروّت کا دباؤ ڈال کر اُنہوں

نے کسی سے کام نہ لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ میرے ماتحت مجھے اپنا رفیق اور ساتھی خیال کریں، کہ وہ بے غرضانہ اور بلالوث خدمت کر کے ہر بات میں سرگرم حصّہ لیں۔

جب وہ کسی کے کام سے ناخوش ہوتے تھے تو تلخیوں کی آمیزش کے باوجود اُن کے کلام میں شیرینی ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ محبّت سے معمور تھے۔ نفرت اور کدورت کے ذرّات اُن کے نزدیک پھٹکنے بھی نہ پاتے تھے۔ جو بات کہتے خدا لگتی کہتے تھے۔ ہر ایک بات نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کرتے اور کہتے تھے۔ محبّت سے کام لینا اُن کی فطرت کے موافق تھا۔ اُن کی نگاہ لُطف سے ماتحتوں کا دل بَلّیوں اُچھلتا تھا۔ جو اُن کی آنکھوں میں بچ گئے خالص سونے کی مانند دمک گئے۔

ایک شخص مجھے یاد ہے جو کسی مشنری نے نکال دیا۔ مَیں اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ محنت اور

دیانت داری سے کام کرنے والا ہے۔ میری سفارش پر میاں صاحب نے اُسے اپنے پاس ٹوبہ ٹیک سنگھ بُلا لیا اور اُس سے دن رات محنت کروا کر اچھی طرح دو سال تک آزمایا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے مجھے فرمایا، "لڑکا اچھا ہے۔ تم نے خوب کیا جو اُس کی سفارش کی۔ اگر ایسا ہی رہا چند سالوں کے بعد ڈیکن بننے کے قابل ہو جائے گا۔" بہت سالوں کے بعد وہ ڈیکن اور پریسٹ ہو گیا اور خداوند کی خدمت بڑی محنت سے کرتا رہا۔ واعظ صاحب بھی لکھتے ہیں،

احسان اللہ میں ایک بڑی بھاری خوبی تھی جو ہمارے خادموں میں بالکل نہیں ہے۔ ہمارے خادم یہ چاہتے ہیں کہ پانچ دس مُنّاد اُن کے ماتحت ہوں، اُن کے آگے پیچھے اَردَلی میں چلنے والے ہوں۔ خادم کے گھر کا کام کریں۔ کوئی دودھ دوہے، کوئی گائے بھینس کی حفاظت کرے، کوئی سودا لائے، کوئی خادم کی غیر حاضری میں اُن کے خاندان اور بچوں کی چوکیداری کرے۔ مُناد اُن کے نج کے نوکر ہوتے ہیں جو ضرورت کے

وقت کھانا بھی پکا دے۔ لیکن احسان اللہ اپنے مُنّادوں سے کبھی نچ کا کام نہیں لیتے تھے، اور اُنہیں دینی اور جماعت کے کام اور انجیل کی خدمت کے سوا اَور کوئی دوسرا کام نہیں کرنے دیتے تھے۔ غرض، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

جھنگ بار کا انتظام ٹھوس کرنے کے اقدام

جھنگ بار کے علاقے میں احسان اللہ نے جگہ جگہ کی جماعتوں کو منظّم کیا۔ دُور دُور کے گاؤں اور بستیوں کو مختلف علاقوں میں جمع کر کے اُنہوں نے ہر علاقے کو ایک ہوشیار، دانا اور تجربہ کار مُبلّغ کے سپرد کیا جو ایک مرکز کے گاؤں میں رہتا تھا۔ ہر مرکز میں اُنہوں نے سکول کھول کر کچّی اور پکّی دیواروں کی عبادت گاہیں بنوائیں۔ سکندر آباد کے گاؤں کے نصف حصّے کو عیسائی کاشت کرتے تھے، اِس لئے وہاں

ایک سکول اور عبادت گاہ اور مُبلّغ کی جائے رہائش بنائی گئی۔ منٹگُمری والہ اور عیسیٰ نگری (بیٹ مَن آباد) عیسائی گاؤں تھے۔

1900ء میں احسان اللّٰہ نے اپنے قدیمی دوست وائٹ بریخنٹ کے ساتھ منٹگُمری والہ کی عبادت گاہ کا سنگِ بنیاد رکھا جو 1901ء میں مکمل ہو گیا جس کی اگلے سال بشپ لیفرائے نے تقدیس کی۔ تقدیس کے موقعے پر بشپ صاحب احسان اللّٰہ سے بغل گیر ہو کر ملے اور اُن ایّام کو یاد کرتے رہے جب وہ فقیرانہ حالت میں دہلی گئے تھے اور جماعت کی زندگی اور مشنری کی زندگیوں کو اپنے ولولہ انگیز وعظوں سے متأثّر کیا تھا۔

منٹگُمری والہ میں لڑکوں کا سکول 1900ء میں کھول دیا گیا تھا۔ 1903ء میں وہاں لڑکیوں کی پڑھائی کے لئے الگ سکول کھول دیا گیا تھا۔ بیٹ مَن آباد کا گاؤں منٹگُمری والہ سے

تقریباً 35 میل دُور تھا۔ وہاں کچّی اینٹوں کی عبادت گاہ اور سکول اور مُبلّغ کی جائے رہائش بنا دی گئی۔

منٹگُمری والہ اور بیٹ من آباد میں ہر سال 26 دسمبر کے روز میلے ہونے لگے جن میں غیر مسیحی ہزاروں کی تعداد میں آنے لگے۔ اُن دونوں گاؤں میں اجتماعی مشغلے، میلے ٹھیلے اور کھیل تماشے ہوا کرتے تھے جن میں ارد گرد کے گاؤں کی گیت پارٹیاں آتیں، انعامی مقابلے ہوتے اور انجیل جلیل کا پرچار غیرعیسائیوں میں کیا جاتا جس سے جماعت کی فرض شناسی اور اُس کے ایمان کے استحکام میں ترقی ہونے لگی۔

جھنگ بار کے علاقے کے گاؤں کے بوڑھے اب تک احسان اللہ کی خدمت کی کہانیاں بیان کرتے ہیں اور ذکر کرتے ہیں کہ کس خوشی سے وہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کیا کرتے تھے۔ وہ ہر ایک سے محبت، پیار اور گرم جوشی سے مل کر اُس کے دُکھ اور سُکھ، غم اور خوشی میں شریک ہوتے اور

ہر ایک کو ضبط میں رکھتے تھے۔ طاعون، ہیضہ اور دیگر وباؤں کے وقت وہ بیماروں سے ملنے سے کبھی نہ جھجکتے اور مرنے والوں کو خدا کے پاس جانے کے لئے تیار کیا کرتے تھے۔

فرقہ بندی کے خلاف کوششیں

ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ احسان اللہ بے خوف اور نِڈر ہو کر پنجاب کی شہری جماعتوں کو مغربی جماعتوں کی فرقہ بندی سے آزاد رہنے کی تعلیم دیتے رہے۔ وہ الیاس کی سی روح رکھتے تھے اور نہایت دلیری سے مختلف مشنوں کے مشنریوں کو بھی تاکید کرکے کہتے تھے کہ ہندوستان کی جماعت کو اپنے مغربی بکھیڑوں سے آزاد رہنے دو۔ اُنہوں نے چرچ مشن کی صد سالہ برسی کے موقعے پر بھی اُس کے بزرگوں کو خدا کا واسطہ دے کر یہی کہا تھا۔

آخر میں اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور میں چرچ مشن کی زیرِ سرپرستی 1902ء میں ایک "نیٹو کرسچن کونسل" منعقد ہوئی

جس میں مختلف جماعتوں کے سربراہ خادم اور اہلِ جماعت شریک ہوئے۔ راجا سر ہر نام سنگھ جیسے غیور عیسائی اُس کے صدر تھے۔ اُس میں کوئی پردیسی شامل نہ تھا۔ اِن اصحاب نے تین روز تک جماعت کے مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا اور بحث کے بعد متعدّد قراردادیں تجویز کیں۔ اگر اِن تجاویز پر عمل کیا جاتا تو پنجاب کی جماعت کب سے آزاد ہوکر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی ہوتی اور اپنی مختلف ذمّے داریوں کو جاں فشانی سے پورا کرتی ہوتی۔ پنجاب میں ایک متحدہ میدان قائم ہوگیا ہوتا اور تمام پنجابی عیسائی اب تک فرقہ بندی سے آزاد اور مغرب کے روپوں سے بے نیاز ہو گئے ہوتے۔ لیکن مشن کے بزرگوں کو یہ بات پسند نہ آئی۔ نتیجے میں یہ قراردادیں کاغذی پتنگ بن کر ہی ہَوا میں اُڑ گئیں۔ اِس کونسل کا اجلاس پھر دوبارہ نہ ہوا۔

پنجاب کی جماعت بدستور فرقہ بندی کی زنجیروں میں جکڑی رہی اور سونے کے طوق ہر جماعت کی غلامی کے امتیازی نشان رہے ہیں۔ میاں صاحب اکثر کہا کرتے تھے،

> آنچہ شیراں راکُند روباہ مزاج
> احتیاج است، احتیاج است، احتیاج
> جو کچھ شیروں کو لومڑیوں کا سا مزاج دلا دیتی ہے
> وہ ضرورت ہے، ضرورت ہے، ضرورت

سرگودھا کا انتظام ٹھوس کرنے کے اقدام

1873ء میں بشپ فرنچ نے لاہور میں سینٹ جانز ڈِوِنٹی کالج کی بنیاد قائم کی تھی۔ اب یہ کالج تیس سال سے لاہور کے علاقے کے لئے خادم تیار کر رہا تھا۔ 1903ء میں خدا کا شکر بجا لانے کے لئے اِس کالج میں وہ تمام خادم اکٹھے ہوئے جنہوں نے اِس ادارے میں تعلیم پائی تھی۔

اُس سال اُن خادموں کی تعداد جو اب تک زندہ تھے اور انجیل کی خدمت کر رہے تھے 50 سے زائد تھی۔ لیکن اُن میں سے صرف نصف کے قریب یعنی 27 لاہور آ سکے۔ احسان اللہ اِس موقعے پر آئے، اور سب ایک دوسرے کو دیکھ کر نہایت محظوظ ہوئے۔ حاضرین میں 17 ایسے تھے جو پہلے دائرۂ اسلام میں تھے اور اب خداوند کے فرماں بردار ہو کر انجیل جلیل کی خدمت کرتے تھے۔ اِن 17 اصحاب میں سے نو پریسٹ کے عُہدے پر ممتاز تھے۔

نومبر 1903ء میں احسان اللہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے سرگودھا چلے گئے۔ کیونکہ جہلم کی یہ نَو آبادی نئی نئی شروع ہوئی تھی وہاں اُن جیسے جفاکش شخص کی اشد ضرورت تھی۔ اِس نئے کام کو اُنہوں نے نئے طرز پر چلایا اور وہاں کے تمام گاؤں کی جماعتوں کو منظّم کر کے اُن میں لڑکوں اور لڑکیوں کے سکول کھول دیئے۔ جن مُبلّغین کو اُنہوں نے وہاں مقرّر کیا اُن کے ہاتھوں میں

اُن سکولوں کی تعلیم بھی سونپ دی۔ اُنہوں نے ایک سال کے قریب وہاں دن رات اَن تھک محنت کی۔ ہر گاؤں کا دَورہ کیا۔ عیسائیوں کو جا بہ جا اُبھارا، جماعتوں کو مُستحکم کیا اور تمام اُمور کو اِس خوبی سے سرانجام دیا کہ اِس عرصے کے بعد وہ واپس ٹوبہ ٹیک سنگھ آ سکے۔

چرچ مشن کی راہنمائی میں تبدیلیاں

جب احسان اللہ نے دیکھا کہ مُختلف مشنوں کے کارکُنوں کی یہ متفقہ خواہش ہے کہ "نیٹو کرسچن کونسل" دوبارہ منعقد نہ ہو تو اُنہوں نے ایک اَور تحریک شروع کی کہ چرچ مشن کے کام کا انتظام صرف مشنری نہ کریں بلکہ اِس انتظام میں ہندوستانی خادم اور اہلِ جماعت بھی برابر کے شریک ہوں تاکہ یہ اعتراض رفع ہو جائے کہ دیسی مشن کے کام کو سنبھالنا نہیں جانتے۔

اُن کی تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ چرچ مشن نے پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لئے ایک نئے منصوبے کا خاکہ تیار کیا جس کے مطابق مشن اور جماعت کے تمام شُعبے ایک ہی انتظام کے ماتحت کئے گئے۔ یوں ہندوستانی اور یورپین کام، بشارتی اور پاسبانی کام، تعلیم اور میڈیکل کے شُعبے، سب کے سب منظّم کر دیئے گئے اور اُنہیں سنٹرل مشن کونسل کے ماتحت کر دیا گیا جس کے صدر لاہور کے بشپ تھے۔ چرچ مشن کے تمام علاقے کو مختلف علاقوں میں تقسیم کر دیا گیا اور تمام شہروں اور گاؤں کی جماعتوں کو اِن علاقائی کونسلوں کے ماتحت کر دیا گیا جن کے سالانہ جلسوں میں یہ جماعتیں اپنے نُمائندے مُنتخب کر کے بھیجیں۔ یہ علاقائی کونسلیں اپنے نُمائندے مُنتخب کر کے مرکزی سنٹرل مشن کونسل میں بھیجیں۔ اِن علاقائی کونسلوں اور مرکزی کونسل کی انتظامیہ کمیٹیاں سال بھر کام چلائیں۔ اِن کے علاوہ مختلف شُعبوں کی خاص کمیٹیاں بھی مرکزی کونسل کے ماتحت کی گئیں۔ اور یہ

لازم کر دیا گیا کہ اِن تمام کمیٹیوں، علاقائی کونسلوں اور مرکزی کونسل میں ہندوستانی اور یورپین عنصر، دونوں ہوں۔

یہ طریقۂ کار شخصی انتظام اور حکومت سے کہیں بہتر تھا۔ احسان اللہ اور جماعت کے دیگر مدبّرین نے اِس منصوبے کو تجربے کے طور پر چند سالوں کے لئے منظور کر لیا۔ جب اِس منصوبے پر عمل در آمد شروع ہوا تو میاں صاحب اور چند دیگر لائق ہندوستانی خادم الدین اِس منصوبے کی علاقائی کمیٹیوں اور دیگر کمیٹیوں کے ممبر ہو گئے۔

جب تک یہ منصوبہ جاری رہا احسان اللہ لاہور کی علاقائی کونسل، پنجابی زبان کی کمیٹی، گورڈن فنڈ کمیٹی، گاؤں کی کمیٹی، پاسبانی اور بشارتی کمیٹی اور سنٹرل مشن کونسل کے ممبر رہے۔ اِن کونسلوں میں میاں صاحب اپنے وسیع تجربے سے جماعت کے کام کے لئے مفید مشورے دیتے رہے۔ وہ ہمیشہ کھری کھری اور بے لاگ باتیں کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا

کہ مشن کے بزرگ ایسی تجویزوں کو پیش کرنے کی جرأت ہی نہیں کرتے تھے جن سے دیسی جماعتوں کی فلاح و بہبودی میں فرق آئے۔ قبلہ واعظ لکھتے ہیں،

بات اصل میں یہ تھی کہ راستی کے اظہار میں احسان اللہ جیسا صاف گو اور نڈر بولنے والا ہمارے مشن میں کوئی نہیں تھا۔ اُنہیں کبھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ میری باتیں سُننے والے کس درجے یا رُتبے کے آدمی ہیں۔ وہ بغیر جھجک کے اپنا مطلب ادا کر دیتے تھے۔

اُن کی باتیں کبھی جلی کٹی نہ ہوتی تھیں۔ شخصی حملوں سے اُنہیں سخت نفرت تھی۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ اِن کمیٹیوں اور کونسلوں میں کوئی اہم تجویز یا قرارداد منظور نہ ہونے پاتی تھی جس کے وہ حق میں نہ ہوتے تھے۔

12
شیخ رحمت علی کا عیسائی ہونا

زلزلہ اور وبا

ہم اِس کا ذکر کر چکے ہیں کہ احسان اللہ کے چھوٹے بھائی شیخ رحمت علی نے قرآن اور کتابِ مقدّس کا غور سے گہرا مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جوں جوں مطالعہ کرتے گئے اُنہیں کتابِ مقدّس کی صداقت کا یقین ہوتا گیا۔ اب وہ اپنا زیادہ وقت کتابِ مقدّس اور خاص کر انجیل جلیل کے پڑھنے میں صرف کرنے لگے۔

1905ء کا سال نارووال کے لئے ایک بڑا منحوس سال تھا۔ اُس سال پنجاب بلکہ تمام شمالی ہند میں مارچ میں سخت زلزلہ آیا جس نے کانگڑہ کے ضلع سے لے کر تمام شمالی ہند میں تباہی مچا دی۔ نارووال میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جو گِرا نہ ہو یا جس کی دیواریں شکستہ نہ ہوئی ہوں۔ زلزلے کے جھٹکے صبح سے شروع ہوئے اور مسلسل تمام دن جاری رہے۔ لوگ اپنے گھروں سے بھاگ نکلے۔ اُنہوں نے ویران مقاموں میں درختوں کے سائے کے نیچے پناہ لی۔ محلّۂ خواجگان برباد ہو گیا۔ ہر شخص خدا سے دُعا کرنے لگا۔

شیخ رحمت علی انجمنِ شیعاں کے پریزیڈنٹ تھے۔ اُنہوں نے تمام محلّے کو عید گاہ میں بُلایا۔ لوگوں کا بڑا بھاری مجمع اکٹّھا ہو گیا۔ وہاں شیخ صاحب نے کتابِ مقدّس میں سے یونس نبی کی کتاب پڑھ کر سُنائی اور پھر ایک دل ہلا دینے والا وعظ کیا۔ تمام مجمع کے دل خدا کی جانب رجوع ہو گئے۔ اُنہوں نے

نہایت فروتنی کے ساتھ دُعا کی اور توبہ کی طرف مائل ہو کر خدا سے اپنے گناہوں کی مغفرت کے طالب ہوئے۔

ابھی زلزلے کی ہراسانی ختم نہ ہوئی تھی کہ طاعون کی وبا محلّہ خواجگان میں پھیل گئی۔ ہر گلی کوچے کے لوگ مرنے لگے۔ عیسائی آبادی سے باہر نکل گئے۔ شیخ رحمت علی نے انجمن کے پریزیڈنٹ کی حیثیت سے سب کو یہی کرنے کی صلاح دی اور پھر عید گاہ میں تمام شیعوں کا مجمع اکٹّھا کیا۔ اِس موقعے پر اُنھوں نے تقریر کی جس میں کتابِ مقدّس سے جا بہ جا حوالے دے کر انبیا کے نصائح اور تورات کی کتاب استثنا کے حوالجات پڑھے۔ اُنھوں نے خدا سے دُعا کی کہ وہ سب پر رحم کرے، سب کے گناہ مُعاف فرمائے اور وبا کو جو نارووال کے لوگوں کی واجبی سزا کے طور پر بھیجی گئی ہے اُن کے درمیان سے دُور کرے۔

خدا نے اپنا فضل کیا۔ چند دنوں کے اندر طاعون کی وبا ختم ہوگئی۔ شیخ صاحب کی اہلیہ محترمہ بھی اِس نامُراد مرض میں گرفتار ہوکر اُن دُعاؤں کے سبب سے صحت یاب ہوگئیں۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں،

میری بیوی سخت بیمار ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی دم کی مہمان ہے۔ ہم نے برکت علی کو بٹالہ کے سکول میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا تھا، اور وہ اُس کی جُدائی میں بھی تڑپ رہی تھی۔ مَیں نے دُعا مانگی کہ اے خداوند، مَیں تیری مِنّت کرتا ہوں کہ تُو اپنے مسیح کے نام کی خاطر اِس کو شفا بخش۔ دُعا کے بعد اُسے قدرے آرام ہوگیا۔ اُس کی بے ہوشی دُور ہوگئی۔ وہ بات چیت کرنے لگی، اور مَیں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ چند دنوں کے بعد اُس کی کم زوری بھی ختم ہوگئی، اور اُس نے خدا سے نئی زندگی پائی۔

عیسائی ہونے کا علانیہ اقرار

زلزلے کے جھٹکوں اور طاعون کی وبا نے شیخ صاحب اور اُن کی رفیقۂ حیات کے دلوں میں اِس دُنیا کی ناپائیداری اور دَولت کی کم مائگی کا احساس بہت تیز کر دیا۔ نتیجے میں شیخ رحمت علی زیادہ وقت کتابِ مقدّس کے مطالعے میں صَرف کرنے لگے اور دُکان میں صرف اُتنا کاروبار کرتے جس سے اُن کے مطالعے میں ہرج واقع نہ ہوتا۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں،

> کتابِ مقدّس کے مطالعے میں مجھے عجب لذّت آنے لگی۔ مَیں ہر وقت اِسی کو پڑھنے لگا۔ ایک روز مَیں کتابِ مقدّس کا مطالعہ کر رہا تھا کہ میری بیوی جو اَن پڑھ ہے مجھے کہنے لگی، "آپ مجھ سے کبھی بات نہیں کرتے۔ جب دیکھتی ہوں، بس آپ ہیں یا یہ کتاب ہے۔"
>
> مَیں نے جواب دیا، "ہاں، بولو۔ کیا بات ہے؟ تم بے شک بات کرو۔"

اُس نے کہا، "بات کیا دیواروں سے کروں؟ یہ کتاب تو آپ کے مُنہ کے سامنے ہے۔" اور پھر بڑے جوش میں آ کر کہنے لگی، "جی کرتا ہے کہ اِس کتاب کو جلا کر خاکِ سیاہ کر دوں۔ یہ کتاب ہے یا آپ ہیں؟" یہ کہہ کر میرے ہاتھ سے کتابِ مقدّس چھیننے لگی۔

مَیں نے کہا، "اِس کتاب کو عزّت سے ہاتھ لگاؤ۔ یہ خدا کا کلام ہے۔"

اُس نے گھبرا کر کہا، "کیا یہ قرآن شریف ہے؟"

مَیں نے جواب دیا، "نہیں، یہ کتاب قرآن نہیں ہے۔ یہ کتابِ مقدّس ہے جو خدا کا سچّا کلام ہے۔"

اُس نے پوچھا، "تو کیا قرآن خدا کا کلام نہیں ہے؟"

مَیں نے جواب دیا، "میرا ایمان تو یہ ہے کہ صرف یہی کتاب خدا کا سچّا اور الہامی کلام ہے۔"

اُس نے کہا، "اگر آپ کا یہی ایمان ہے تو مجھے بھی اِس میں سے سُنایا کریں تاکہ مجھے بھی تو کچھ پتا لگے۔"

مَیں نے خدا کا شُکر کیا اور اپنی بیوی کو خداوند مسیح کی زندگی اورتعلیم، اُس کی صلیبی موت اور فتح مندانہ طور پر قبر میں سے تیسرے روز جی اُٹھنے کا حال سُناتا رہا۔ مَیں ہر شام اُسے کتابِ مقدّس کے بزرگوں کی کہانیاں اور انبیا کے کارناموں کا حال پڑھ کر سُنایا کرتا تھا۔

صبح کے وقت مَیں اپنے کاروبار کوچلا جاتا اورفراغت کا وقت قرآن اورکتابِ مقدّس کے موازنے اور مقابلے میں صَرف کرتا تھا۔ جب مَیں اپنے اعمال کی طرف نظر کرتا تو میرے گناہ میرے سامنے آجاتے۔ نماز کے وقت جب مَیں کعبہ کی جانب رُخ کرتا تو غالب کا شعر مجھے یاد آتا ؎

> کعبہ کِس مُنہ سے جاؤ گے غالب شرم تم کو مگر نہیں آتی؟

لیکن مَیں اپنے دلی خیالات دوسروں پر علانیہ ظاہر نہیں کرتا تھا، کیونکہ مَیں لوگوں سے ڈرتا تھا۔ ظاہر میں اسلامی رسوم کا پابند تھا، لیکن باطن میں میرا ایمان انجیل جلیل پر قائم تھا۔ جب

میرے دل میں کشمکش ہوتی تو مجھے خداوند مسیح کے قول سے تسلّی ہو جاتی کہ

> جو ہمارے خلاف نہیں وہ ہمارے حق میں ہے۔ (مرقس 40:9)

مَیں شیعہ تھا، اور شیعہ مذہب کے اصول کے مطابق تقیّہ[a] جائز ہے۔ کئی برس تک یہ باتیں میرے دل کو غلط تسلّی دیتی رہیں۔

ایک رات کا ذکر ہے مَیں اپنی بیوی کو انجیل متی کا دسواں باب سُنا رہا تھا۔ مَیں اِن آیات پر آیا،

> اُن سے خوف مت کھانا جو تمہاری روح کو نہیں بلکہ صرف تمہارے جسم کو قتل کر سکتے ہیں۔ اللّٰہ سے ڈرو جو روح اور جسم دونوں کو جہنم میں ڈال کر ہلاک کرسکتا ہے۔ کیا چڑیوں کا جوڑا کم پیسوں میں نہیں بِکتا ؟ تاہم اُن میں سے ایک بھی تمہارے باپ کی اجازت کے بغیر زمین پر نہیں گر سکتی۔ نہ صرف یہ بلکہ تمہارے سر کے سب

[a] ظلم کی وجہ سے اپنا عقیدہ چُھپانے کی اجازت

بال بھی گنے ہوئے ہیں۔ لہٰذا مت ڈرو۔ تمہاری قدرو قیمت بہت سی چڑیوں سے کہیں زیادہ ہے۔

جو بھی لوگوں کے سامنے میرا اقرار کرے اُس کا اقرار مَیں خود بھی اپنے آسمانی باپ کے سامنے کروں گا۔ لیکن جو بھی لوگوں کے سامنے میرا انکار کرے اُس کا مَیں بھی اپنے آسمانی باپ کے سامنے انکار کروں گا۔

یہ مت سمجھو کہ مَیں دُنیا میں صلح سلامتی قائم کرنے آیا ہوں۔ مَیں صلح سلامتی نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ مَیں بیٹے کو اُس کے باپ کے خلاف کھڑا کرنے آیا ہوں، بیٹی کو اُس کی ماں کے خلاف اور بہو کو اُس کی ساس کے خلاف۔ انسان کے دشمن اُس کے اپنے گھر والے ہوں گے۔

جو اپنے باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ پیار کرے وہ میرے لائق نہیں۔ جو اپنے بیٹے یا بیٹی کو مجھ سے زیادہ پیار کرے وہ میرے لائق نہیں۔ جو اپنی صلیب اُٹھا کر میرے پیچھے نہ ہو لے وہ میرے لائق نہیں۔ جو بھی اپنی

> جان کو بچائے وہ اُسے کھو دے گا، لیکن جو اپنی جان کو میری خاطر کھو دے وہ اُسے پائے گا۔ (متی 10:28–39)

میری بیوی نے اِن کا مطلب پوچھا۔ مَیں اُسے اِن آیات کا مطلب سمجھا رہا تھا، لیکن باطن میں میرا دل مجھے ملامت کر رہا تھا۔ تب اُس نے مجھ سے کہا، "اگر یہ بات ٹھیک ہے تو ہم سب کو عیسائی ہو جانا چاہیئے۔"

مَیں نے جواب دیا کہ مَیں نہیں چاہتا کہ اپنی اولاد پر جبر کروں۔ سب بچوں کی منگنی ہوچکی ہے۔ اُن کا بیاہ کر دیں گے پھر دیکھا جائے گا۔"

میری بیوی نے کہا، "اولاد سے زیادہ پیاری کیا چیز ہو سکتی ہے؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم خود تو سچّائی کا پیچھا کر کے بہشت میں داخل ہوں اور اپنی اولاد کو مسلمان رہنے دیں اور اُنہیں بہشت سے محروم رکھیں؟ آپ خدا کو کیا جواب دیں گے؟"

اُس کی یہ بات سُن کر مَیں تمام رات جاگتا رہا۔ مجھے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ مَیں نے نہایت دل سوزی سے خدا سے

دُعا مانگی کہ وہ میری ہدایت کرے اور مجھے اِس تاریک راستے میں اپنا نُور دکھائے تاکہ مَیں جان سکوں کہ مجھے اب کیا قدم اُٹھانا چاہیئے۔ مَیں نے جواب ملنے کے لئے انجیل کھولی تو میری نظر اِس آیت پر پڑی،

> اپنی کسی بھی فکر میں اُلجھ کر پریشان نہ ہو جائیں بلکہ ہر حالت میں دُعا اور اِلتجا کر کے اپنی درخواستیں اللہ کے سامنے پیش کریں۔ دھیان رکھیں کہ آپ یہ شکرگزاری کی روح میں کریں۔ (فلپیوں 6:4)

یہ پڑھ کر مَیں دُعا میں مشغول رہا۔

1906ء جب کرسمس کی چھُٹیاں ہوئیں تو برکت علی بٹالہ سے آیا۔ مَیں نے دو چار دفعہ بہت کوشش کی کہ اُسے اپنے دلی راز سے آگاہ کروں، لیکن میرا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ کیونکہ وہ مسیحی ایمان کا جانی دُشمن تھا۔ اگرچہ سکول میں وہ بچپن سے ہر سال کتابِ مقدّس کا انعام حاصل کیا کرتا تھا تو بھی انجیل کے مُنّادوں کو بازار میں بہت تنگ کیا کرتا تھا۔ بلکہ ایک دفعہ تو اُس نے گھر میں انجیل بھی جلا دی تھی۔

اِس دفعہ جب وہ گھر آیا تو وہ بڑی خوشی سے بتانے لگا، "اگرچہ مَیں نے کتابِ مقدّس کا انعام پھر حاصل کیا ہے لیکن اپنے ہیڈ ماسٹر کو انجیل کے کلاس میں سخت تنگ کیا کرتا ہوں۔ سوالات کی بوچھاڑ سے مَیں اُس کا دم ناک میں کر دیتا ہوں۔"

یہ باتیں سُن کر مَیں اور میری بیوی ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے، اور مَیں نے اُسے کچھ نہ کہا۔ چھٹیوں کے بعد وہ واپس سکول میں چلا گیا۔

جب 1907ء کا شروع ہوا تو میری بیوی نے پھر مجھ سے تقاضا کر کے کہا، "جب آپ کا ایمان ہے کہ مسیح ہی نجات دیتا ہے تو ہم کیوں اپنی اولاد سمیت عیسائی نہ ہو جائیں؟" چنانچہ دُعا کے بعد ہم نے یہی مناسب خیال کیا کہ ہم سب عیسائی ہو جائیں اور برکت علی کو خدا پر چھوڑ دیں۔ ایک روز مَیں ایک مِس صاحبہ کو راہ میں ملا اور اُس سے کہا کہ آپ ہمارے گھر آیا کریں اور ہمارے بچوں کو پڑھایا کریں۔ اِس پر وہ ہمارے گھر آ کر ہماری دونوں لڑکیوں کو پڑھانے لگی۔ جب برادری کے

لوگوں نے دیکھا کہ مس صاحبہ ہمارے گھر میں انجیل پڑھاتی ہے تو تمام محلّے میں کھلبلی مچ گئی اور گپیں شروع ہو گئیں۔

شیخ رحمت علی صاحب کو نظر آ رہا تھا کہ موروثی عقائد کو چھوڑنے کا نتیجہ کیا ہو گا۔ جہاں تک دُنیا کا تعلّق ہے زندگی ایک بوجھ ہو جائے گی جس کو اُٹھا کر کانٹوں کے جنگل میں چلنا پڑے گا۔ اور کانٹے بھی ببُول کے، جو تلووں میں چُبھ کر اُن پاؤں کو جو اب تک گویا مخمل کے فرش پر چلتے رہے تھے، زخمی کرتے رہیں گے۔ لیکن تحقیقی عقیدہ پا لینے کی ذہنی راحت اور گناہوں سے نجات پانے کا آرامِ جان کوئی مُول مہنگا سودا نہ تھا۔

موروثی اور روایتی عقائد کی چار دیواری صرف تقلید ہی کی بُنیادوں پر مُحکم طور پر قائم ہوتی ہے۔ جب یہ بُنیادیں ہل جاتی ہیں تو ساتھ ہی طبیعت کا سکون بھی ہل جاتا ہے۔ اِس کو قرار تب نصیب ہوتا ہے جب یہ طلب مطلوب کو حاصل

کرلیتی ہے۔ لیکن اِس منزل تک پہنچنے سے پہلے ایک پُر خار راہ طے کرنی پڑتی ہے۔

وہ ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو اِس درجہ متعصّب اور بے لچک تھا کہ بال برابر بھی اِدھر اُدھر ہونا کُفر اور زندقہ تصوّر کرتا تھا۔ لیکن اُنہوں نے اب دماغی ورثے کی سختی اور جمود سے آزادی پا لی تھی اور اُس مرحلے پر آ پہنچے تھے جہاں درمیانی منزلوں میں رُکنا ایک ناممکن امر تھا۔ اب دینی عصبیّت اُن کے اور خدا کے درمیان حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اِس دُنیاوی زندگی کے آرام اور درازئ عُمر کے خواہش مند نہ تھے۔ کیونکہ یہ جسمانی زندگی آخر چند روزہ ہے اور یہ دُنیا فانی ہے۔ ؎

آجائے ایسے جینے سے اپنا تو جی بھی تنگ
آخر جیئے گا کب تلک اے خضر؟

وہ روحانی زندگی اور خدا کی قُربت کے خواہش مند تھے۔ آخر اُن کے موروثی عقائد اور دینی تعلیم کا حقیقی مطلب اور مقصد بھی تو یہی تھا۔ اور اُن کی طبیعت کا آخری تقاضا ہی یہ تھا کہ ؎

> بہرِ یک گُل زحمتِ صد خار می باید کشید
> ایک گلاب کی خاطر سَو خاروں کی زحمت اُٹھانی پڑتی ہے۔

اُن کی قوم کے افراد آپس میں اُن کی بابت چرچا کرنے لگے۔ بعض کہتے تھے کہ نہیں، وہ انجمنِ شیعاں کے پریزیڈنٹ ہیں۔ اُنہیں تجارت میں کوئی خسارہ نہیں پڑا۔ وہ عیسائی کیوں ہونے لگے؟ بعض کہتے تھے کہ وہ اپنے وعظوں میں اور نصیحتوں میں قرآن کی باتیں کم کرتے ہیں لیکن کتابِ مقدّس کے نبیوں کی کتاب کا حوالہ زیادہ دیتے ہیں۔ غرض جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔ آخر حکیم محمد وارث صاحب جو اُن کے مخلص

قریبی دوست اور رشتے دار تھے اُن کے پاس آئے تاکہ کُل حالات کا جائزہ لیں۔ شیخ رحمت اللہ لکھتے ہیں،

اُنہوں نے مجھ سے پوچھا، "یہ افواہ جو ہر جگہ اُڑ رہی ہے، اِس کی تہ میں کیا حقیقت ہے؟"

مَیں نے جواب دیا، "اگر آپ کا مطلب ہے کہ کیا مَیں عیسائی ہونا چاہتا ہوں تو یہ بات دُرست ہے کہ مَیں مسیح پر ایمان رکھتا ہوں۔"

اُنہوں نے کہا، "اچھا مَیں رات کو آؤں گا اور پھر فراغت سے گُفتگو کریں گے اور کوئی ہماری باتوں میں خلل بھی نہ ڈالے گا۔"

وہ رات کو آئے، اور ہم دونوں میں قرآن و انجیل کے مختلف پہلوؤں پر گُفتگو ہوتی رہی حتّٰی کہ آدھی رات ہو گئی۔ تب اُنہوں نے رخصت مانگی اور کہا، "انشا اللہ مَیں کل رات کو پھر آؤں گا اور ہر بات پر مفصّل طور پر اپنے خیالات کا تبادلہ کریں گے۔"

جب وہ پھر رات کو آئے تو ہم دونوں قرآن اور کتابِ مقدّس لے کر بیٹھ گئے۔ گفتگو کے شروع میں مَیں نے اُن سے کہا، ”تبادلۂ خیالات کرنے سے پہلے ہم خدا سےخلوصِ نیّت سے دُعا کریں کہ خدا ہم دونوں کی راہنمائی کرے اور سوائے حق کی تلاش کے ہمارے دلوں میں کوئی خیال اِس وقت جگہ نہ پائے۔ تب خدا ہم کو غور کرنے کی توفیق دے گا اور ہم خالی الذہن ہو کر معلوم کر سکیں گے کہ سیدھی راہ کونسی ہے۔“ ہم نے دُعا کے لئے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے اور دُعا کی کہ یا الٰہِ العالمین، تُو ہماری آنکھوں کو کھول۔ پھر ہم نہایت سنجیدگی سے رات بھر گفتگو کرتے رہےحتّٰی کہ مُرغ نے بانگ دے دی۔

مُرغ کی بانگ پر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے، ”مَیں اب یہ تسلیم کرتا ہوں کہ انجیل کلامِ الٰہی ہے اور آپ راستی کی تلاش کر کے اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسیحی دین راستی پر ہے۔ میرا بھی آپ سے بہت باتوں میں اتّفاق نظر آتا ہے۔ لیکن مَیں ابھی یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے جب تک مَیں بھی آپ کی طرح خوب اچھی

طرح سے تجسّس نہ کرلوں۔" اِتنے میں صبح کا ستارہ نمودار ہو گیا اور وہ گھر چلے گئے۔ اِس کے بعد ہم ہر روز شام کے وقت باغ کی طرف سیَر کو نکل جانے لگے اور اسلام اور عیسائی دین کے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے۔

حکیم محمد وارث صاحب مجھے بتایا کرتے تھے،

ایک دن ہم دونوں تقریباً 5 بجے بعد از دوپہر باغ کی طرف نکل گئے اور حسبِ دستور اسلام اور مسیحی ایمان پر باتیں کرتے رہے۔ جب مَیں نے دیکھا کہ شیخ صاحب کا انجیل پر ایمان پکّا ہے اور وہ کسی حالت میں بھی مسیحی دین سے نہیں ہٹیں گے تو مَیں نے اُنہیں کہا کہ بھائی جی، آپ کا موجودہ رویّہ دُرست نہیں ہے۔ قرآن کی رو سے یہ رویّہ منافقانہ ہے، اور انجیل کی رُو سے آپ اِس کو کسی صورت میں بھی جائز قرار نہیں دے سکتے۔ آپ اپنی دو ٹانگیں دو کشتیوں میں جو مخالف سمتوں کو جا رہی ہوں، رکھ کر دریا پار نہیں کر سکتے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ یا تو اسلام کے فرماں بردار ہو کر رہیں یا عیسائی دین

کو علانیہ اختیار کر کے مسیح کا سب کے سامنے اقرار کریں جیسا بھائی احسان نے کیا تھا۔

اِس پر وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے۔ مَیں اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ تھرّا کر اُٹھے اور سخت کانپنے لگے۔ اگرچہ ابھی گرمی کا موسم نہ تھا لیکن اُن کے روئیں روئیں سے پسینہ ٹپکنے لگا۔ اُن کی حالت متغیّر ہو گئی۔ اُن کے آنسو بہنے لگے اور نہایت بے قراری کی حالت میں اُنہوں نے ڈھائیں مار کر کہا، ”ہائے، مجھ سے مسیح کا انکار نہیں ہو سکتا۔ اُس نے بھی فرمایا ہے کہ

> جو بھی لوگوں کے سامنے میرا اقرار کرے اُس کا اقرار مَیں خود بھی اپنے آسمانی باپ کے سامنے کروں گا۔ لیکن جو بھی لوگوں کے سامنے میرا انکار کرے اُس کا مَیں بھی اپنے آسمانی باپ کے سامنے انکار کروں گا۔
>
> (متی 10:32–33)

اور اُس کا رسول بھی کہتا ہے،

> اگر تُو اپنے منہ سے اقرار کرے کہ عیسیٰ خداوند ہے اور دل سے ایمان لائے کہ اللہ نے اُسے مُردوں میں سے زندہ کر دیا تو تجھے نجات ملے گی۔ (رومیوں 10:9)

مَیں نے اُنہیں کہا، "بس، پھر تو معاملہ صاف ہے۔"

اُنہوں نے جواب دیا، "اچھا، اب سے مَیں سب کے سامنے علانیہ اقرار کروں گا کہ میرا ایمان مسیح پر ہے۔"

مَیں نے اُنہیں حوصلہ دلا کر تسلّی دی اور کہا، "خواہ تمام دُنیا آپ کے خلاف ہو جائے مَیں کبھی آپ کے اور آپ کے خاندان کے خلاف نہیں ہوں گا۔ مَیں آپ کا ہمیشہ مخلص دوست بن کر رہوں گا اور انشا اللہ آپ کا ساتھ دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

شیخ رحمت اللہ لکھتے ہیں،

جب ہم دونوں شہر کی جانب واپس آئے تو اُس نے میرے رشتے داروں کو خبر دی کہ مَیں علانیہ بپتسمہ پا کر عیسائی ہونا چاہتا ہوں۔ یہ خبر آناً فاناً محلّے کے لوگوں میں پھیل گئی۔ اگلے روز

میرے تین رشتے داروں نے مجھے پیغام بھیجا کہ ہم تینوں آج رات آپ کے پاس آئیں گے۔ جب شام ہوئی تو میرا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ بے قراری اور بے چَینی نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میری حالت تہ و بالا ہونے لگی۔ تب مَیں اُٹھا اور گھر کی چھت پر جا کر خدا کے حضور گڑگڑا کر دُعا مانگنے لگا کہ "اے بے چارگان کے والی۔ اِس وقت تُو میرا چارہ کر۔ مجھے طاقت اور قوّت دے۔ اَے مسیح، تُو نے کہا ہے کہ

> تمہارا دل نہ گھبرائے۔ تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو، مجھ پر بھی ایمان رکھو۔ (یوحنا 14:1)

اب مَیں تجھ پر ہی ایمان لے آیا ہوں۔ تُو مجھے اپنا اطمینان بخش۔ مَیں لاچار ہوں۔ تُو میری مدد کر۔ تُو میری زبان کو لے اور اِس کے ذریعے آج رات تُو ہی اِن لوگوں سے کلام کر۔"

مَیں دیر تک اوندھا پڑا رہا۔ دُعا کے بعد میرے دل میں عجیب اطمینان پیدا ہو گیا۔ جب مَیں نیچے اُترا تو میرے رشتے دار آ گئے تھے۔ مَیں نے قرآن اور کتابِ مقدّس کو اپنے پاس رکھ

لیا۔ چراغ دان پر دِیا رکھا اور حُقّہ اُن کے سامنے پیش کیا۔ چُھٹتے ہی ایک نے یہ سوال کیا، "اگر تورات اور انجیل سب یکساں طور پر خدا کا کلام ہیں تو جو چیزیں تورات میں حرام ہیں وہ عیسائی دین میں کیوں جائز قرار دی گئی ہیں۔"

مَیں نے قرآن لیا اور تیسرے پارہ میں سورہ عمران کی 50 آیت نکال کر اُن کے رو برو رکھ دی جس میں مسیح کا قول لکھا ہے،

> وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ۚ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ-
>
> اور مجھ سے پہلے جو تورات (نازل ہوئی) تھی اُس کی تصدیق بھی کرتا ہوں اور (مَیں) اِس لیے بھی (آیا ہوں) کہ بعض چیزیں جو تم پر حرام تھیں اُن کو تمہارے لیے حلال کر دوں اور مَیں تو تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں تو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

اِس آیت پر چند منٹوں کے لئے بحث ہوتی رہی۔ پھر مَیں نے کہا، ”بھائیو، یہ جُزوی باتیں چھوڑو اور کتابِ مقدّس کی اصل بُنیادی باتوں پر گُفتگو کرو۔“

اُنہوں نے کہا، ”جب کتابِ مقدّس محرّف ہے اورقابلِ اعتبار ہی نہیں رہی تو ہم اِس کی سند کس طرح قبول کر سکتے ہیں؟“

مَیں نے قرآن میں سے وہ تمام آیات نکال کر اُن کے سامنے رکھ دیں جن میں قرآن بار بار کہتا ہے کہ وہ کتابِ مقدّس کی تصدیق کرتا ہے اور اُسے امام، نور اور ہدایت قرار دے کر کہتا ہے کہ ہر مومن کے لئے لازم ہے کہ اِس پر ایمان رکھے۔

اُنہوں نے کہا، ”یہ باتیں اصل تورات اور انجیل کی نسبت لکھی ہیں جو تحریف ہونے سے پہلے اہلِ کتاب کے ہاتھوں میں تھیں۔“

مَیں نے جواب دیا، ”حضرت عیسیٰ مسیح کے سَوا چھ سو سال سے زیادہ عرصے کے بعد یہ باتیں قرآن میں لکھی گئیں، اور اِس

کے سَوا چھ سو سال کے عرصے میں توراتِ وانجیل ہزاروں دفعہ ہر صدی اور ہر ملک میں نقل ہوتی رہی۔ اُن قدیم صدیوں کے نسخے اب تک موجود ہیں جو موجودہ کتابِ مقدّس کے مطابق ہیں۔ اِس کے علاوہ کتابِ مقدّس کے صحائف کا ترجمہ بہت سے ملکوں کی زبانوں میں اِن سوا چھ سو سال میں ہوا تھا۔ اِن قدیم ترجموں کے نسخے بھی موجود ہیں جو موجودہ کتابِ مقدّس کے مطابق ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ اِس کتابِ مقدّس میں جو آپ کے سامنے پڑی ہے کسی قسم کی تحریف واقع نہیں ہوئی۔"

اُنہوں نے پوچھا کہ آپ کو اِن نُسخوں کا علم کیسے ہوگیا؟

تب مَیں نے اُنہیں فینڈر کی کتاب میزان الحق دکھائی جو بھائی احسان اللہ نے بہت سال ہوئے مجھے مطالعے کے لئے دی تھی۔ بحث ساری رات جاری رہی حتّٰی کہ مُرغ نے بانگ دے دی۔ اِس پر وہ اپنے گھروں کو رُخصت ہو گئے۔ لیکن یہ کہتے گئے کہ اگر آپ اپنے ارادے سے باز نہ آئے تو آپ کا بھائی احسان سے بھی زیادہ بُرا حال ہو گا۔ کیونکہ وہ تو غیرشادی

شُدہ تھے، اور آپ بیوی بچوں والے ہیں۔ آپ نہ صرف اپنے رشتے داروں کو کھو بیٹھیں گے اور برادری سے خارج کیے جائیں گے بلکہ آپ اور آپ کے بچے بھوکوں مریں گے۔ آپ سے کوئی شخص سودا نہیں لے گا اور نہ کسی قسم کا واسطہ رکھے گا۔ کیا آپ کو فارسی کا مصرع یاد نہیں کہ ؎

> روز و شب عربدہ با خلقِ خدا نتواں کرد۔
> تُو دن رات خدا کے لوگوں سے لڑ نہیں سکتا

مَیں نے جواب دیا ؎

> عشق از ایں بسیار کردست و کند
> عشق نے اِس سے زیادہ کیا ہے اور کرتا ہے

اُنھوں نے کہا، یاد رکھو کہ ؎

> مردِ آخر بین مبارک بندہ ایست
> انجام پر نظر رکھنے والا مبارک ہے

مَیں نے کہا، "تب ہی تو مجھے آخرت کا خیال دامن گیر ہے۔ اور مَیں دُنیا کو ترک کر رہا ہوں۔"

اُنہوں نے کہا، ”آخر اِس کا انجام کیا ہو گا ؟“

مَیں نے جواب دیا ۔

> کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست
> ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے مے آید
> کون نہیں جانتا کہ منزلِ مقصود کہاں ہے؟
> یوں ہے کہ گھنٹے کی آواز آتی ہے۔

وہ کہنے لگے، ”آپ ابھی ماشا اللّٰہ جوان ہیں۔ ساری عُمر آپ کے سامنے پڑی ہے۔کیا اِس کو روتے ہی گُزارو گے؟“

مَیں نے مُسکرا کر جواب دیا ۔

> ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
> دُنیا سے گُزرنا، سفر ایسا ہے کہاں کا ؟

پتسمہ اور یگانوں کا دباؤ

شیخ رحمت علی صاحب نے اپریل 1907ء کے شروع میں اپنے بھائی احسان اللہ کو خط لکھ کر تمام حالات کی اطلاع دے کر لکھا،

اِخوان صاحب دامَ لُطفہُ۔ السلام علیکم۔

خداوند کی حمد و ستائش ابد الآباد ہوتی رہے۔ مَیں اُس قدّوس قادرِ مُطلق خدا کا تہِ دل سے شُکر کرتا ہوں جس نے اپنی بڑی رحمت سے قُدرت والے بازو کے ساتھ مجھ گناہ گار کو بڑی عجیب طرح سے روشنی بخش کر اپنے کلام سے اپنے پیارے بیٹے کے قدموں میں بُلایا ہے جو جہان کا نجات دہندہ ہے اور اُن سب کو زندگی بخشتا ہے جو اُس پر ایمان لاتے ہیں۔ اُس نے اُس ایمان کے وسیلے سے جو مَیں لایا ہوں خدائے قدّوس سے مجھ گناہ گار کا میل کرا دیا ہے۔

پھر شیخ صاحب نے ایمان لانے کی تفصیلات بیان کرکے اپنے بھائی کو بتایا کہ اب وہ کس طرح مسیح کا علانیہ اقرار کرکے

سب لوگوں کو مُنجّیِ جہاں کے پاس آنے کی دعوت دیتے ہیں اگرچہ قوم کے لوگوں نے اُنہیں دھمکیاں دی ہیں۔ خط کے آخر میں اُنہوں نے دُعا کرنے کی درخواست کر کے پتسمہ پانے کی خواہش کی۔

یہ خط پاتے ہی احسان اللہ خدا کا شکر بجا لائے۔ وہ نارووال کی جانب چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر وہ سیدھے اپنے آبائی مکان کو گئے اور بھائی سے بغل گیر ہوئے۔ اُنہیں دیکھ کر شیخ رحمت علی صاحب کے دل کو تسلّی ہوئی۔ بڑے بھائی کی موجودگی نے اُنہیں حوصلہ دیا۔ میاں صاحب اُن کے پاس چھ ہفتے رہے اور اُن کے ایمان کو تقویّت دیتے رہے۔ اُنہوں نے قوم کے بزُرگوں اور رشتے داروں سے مل کر اُنہیں بہتیرا سمجھایا، لیکن وہ ایک نہ مانے۔ ہر طرف سے دھمکیوں کی اور لعن طعن کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اُن کے بھائی نے دھمکیوں کے جواب میں کہا،

اوکھلی میں سر دیا تو دھمکیوں سے کیا ڈر؟

1907ء میں عیدِ پنتکُست کے روز شیخ رحمت علی نے اپنی بیوی، دو بیٹوں اور دو بیٹیوں سمیت اپنے بھائی احسان اللہ کے ہاتھوں سے بپتسمہ پایا۔ اُن کا مسیحی نام رحمت اللہ رکھا گیا۔ بپتسمے کا پانا تھا کہ چاروں طرف سے مصیبتوں کا پہاڑ اُن پر ٹوٹ پڑا۔ اپنے یگانے سب بے گانے ہو گئے۔ برادری نے اُنہیں خارج کر دیا۔ بازار کے دُکان داروں نے سودا دینے سے انکار کر دیا۔ چاروں طرف سے لعنت و پِھٹکار کے آوازے کسے جانے لگے۔ جو لوگ پہلے اپنی انجُمن کے پریزیڈنٹ سے ہم کلام ہونا باعثِ شرف خیال کرتے تھے اب وہی علانیہ گلیوں میں اُن کے مُنہ پر صلواتیں سُنانے لگے۔ شہر کے لونڈے اُن کے گھر کے سامنے قطار باندھ کر اُنہیں گندی گالیاں دیتے۔ محلّے کی عورتیں واویلا کرتیں۔ جب وہ یا اُن کی اہلیہ گلی میں سے گُزرتے تو اپنے مکانوں سے اُن

کے سروں پر راکھ اور کوڑا کرکٹ پھینک دیتیں۔ مسلمان دھوبی نے کپڑے دھونے سے انکار کر دیا۔ سقّے نے پانی بھرنا بند کر دیا، اور وہ روٹی پکانے کو محتاج ہو گئے۔ دو دن گھر میں جو اچار، مُربّہ وغیرہ پڑا تھا، وہی کھاتے رہے۔ آخر پڑوس کی ایک عورت رات کے وقت پانی کے ایک دو گھڑے لانے پر رضامند ہو گئی۔

زندگی میں پہلی دفعہ ہندوؤں کی دُکانوں سے سودا آیا۔ غرض، مُسلمانوں نے ہر ممکن طریقے سے اپنے سابق صدرِ انجمن کا قافیہ تنگ کرنے کی کوشش کی تاکہ اُن پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے۔ لیکن خدا نے ہر بات میں اپنے بندے کی مدد کی۔ شیخ رحمت اللہ اپنی برادری کے لوگوں کو سمجھاتے تھے کہ ناجائز دباؤ اُنہیں کسی طرح خداوند کی راہ سے مُنحرف نہیں کر سکے گا۔ پولس رسول کے الفاظ اُنہیں سُناتے تھے کہ

> کون ہمیں مسیح کی محبت سے جدا کرے گا ؟ کیا کوئی مصیبت، تنگی، ایذا رسانی، کال، ننگاپن، خطرہ یا تلوار ؟ ... مسیح ہمارے ساتھ ہے اور ہم سے محبت رکھتا ہے۔ اُس کے وسیلے سے ہم اِن سب خطروں کے رُوبرُو زبردست فتح پاتے ہیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ہمیں اُس کی محبت سے کوئی چیز جدا نہیں کرسکتی: نہ موت اور نہ زندگی، نہ فرشتے اور نہ حکمران، نہ حال اور نہ مستقبل، نہ طاقتیں، نہ نشیب اور نہ فراز، نہ کوئی اَور مخلوق ہمیں اللہ کی اُس محبت سے جدا کر سکے گی جو ہمیں ہمارے خداوند مسیح عیسیٰ میں حاصل ہے۔ (رومیوں 8:35،37–39)

میاں صاحب ایک ہفتے کے قیام کے بعد اپنے بھائی کی لڑکیوں بی بی اللہ دِتّی اور برکت بی بی جن کی عُمر اٹھارہ سال اور گیارہ سال تھی، اپنے ساتھ لے گئے تاکہ اُنہیں پٹھان کوٹ مِس کیمبیل کے سکول میں داخل کر دیں۔ شیخ صاحب کے دو بیٹے عنایت اللہ اور نعمت اللہ جو آٹھ سال

اور چار سال کے تھے نارووال کے سکول میں پہلے ہی داخل تھے۔

بیٹے برکت اللہ کی ایمان تک راہ

شیخ رحمت اللہ کے بپتسمہ پانے کے تقریباً تین ہفتے بعد مَیں جو اُن کا بڑا بیٹا تھا گرمیوں کی چھُٹیاں کاٹنے کے لئے گھر آیا۔ مجھے والدین کے مسیح ہونے کی خبر نہ دی گئی تھی۔ محلّے کے لوگ آپس میں سرگوشیاں کرکے والد صاحب کے خلاف سازشیں کھڑی کر رہے تھے۔ اُنہوں نے چچا مُحسن علی کو بُلایا اور اُسے اُکسایا کہ جائداد کے لئے مقدّمہ کرے۔ چچا مُحسن علی نہایت کٹر اور متعصّب شیعہ تھے۔ لیکن والد صاحب نے اُنہیں بچپن سے پالا تھا، سکول کے اخراجات برداشت کئے تھے، شادی کر دی تھی، اُن کے بچوں کو پالا پوسا تھا، پہلی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی کر دی تھی اور دوسری بیوی کے پہلے بچوں کو بھی پال رہے تھے۔ مُحسن علی احسان

فراموش نہ ہوئے۔ اُنہوں نے مقدّمہ تو نہ کیا، لیکن جائداد کی تقسیم پر ضِد کر کے والد صاحب کو کہنے لگے، "جس طرح برکت علی آپ کا بیٹا ہے مَیں بھی آپ کا بیٹا ہوں۔" وہ نصف جائداد پر اصرار کرنے لگے۔

جواب میں والد صاحب نے تمام منقولہ اشیا، چاندی سونے کے زیورات، گھر کا سامان، حتّٰی کہ آٹا دال تک کا آدھا حصّہ اُنہیں دے دیا۔ اب شیخ صاحب پولس رسول کے الفاظ کا مطلب سمجھے،

> اُس وقت یہ سب کچھ میرے نزدیک نفع کا باعث تھا، لیکن اب مَیں اِسے مسیح میں ہونے کے باعث نقصان ہی سمجھتا ہوں۔ ہاں، بلکہ مَیں سب کچھ اِس عظیم ترین بات کے سبب سے نقصان سمجھتا ہوں کہ مَیں اپنے خداوند مسیح عیسیٰ کو جانتا ہوں۔ اُسی کی خاطر مجھے تمام چیزوں کا نقصان پہنچا ہے۔ مَیں اُنہیں کُوڑا ہی سمجھتا ہوں تاکہ مسیح کو حاصل کروں اور اُس میں پایا جاؤں۔... میرا

> خدا اپنی اُس جلالی دولت کے موافق جو مسیح عیسیٰ میں ہے آپ کی تمام ضروریات پوری کرے۔
>
> (فلپیوں 3:7–9؛ 4:19)

> وہ کرے کہ آپ کے دلوں کی آنکھیں روشن ہو جائیں۔ کیونکہ پھر ہی آپ جان لیں گے کہ یہ کیسی اُمید ہے جس کے لئے اُس نے آپ کو بُلایا ہے، کہ یہ جلالی میراث کیسی دولت ہے جو مُقدّسین کو حاصل ہے، اور کہ ہم ایمان رکھنے والوں پر اُس کی قدرت کا اظہار کتنا زبردست ہے۔ (افسیوں 1:18–19)

اِن آیات نے والد صاحب کو بہت دلاسا دیا۔ محلّے کے لوگوں نے دوسری چال یہ چلی کہ چچا کو کہنے لگے، ”اب رحمت علی عیسائی ہو گیا ہے، اِس لئے اُسے وراثت کا حق حاصل نہیں۔ جس مکان میں وہ رہتا ہے آبائی ہے؛ اُسے نکال باہر کرو، پھر دیکھیں گے کہ اُسے کون رہائشی مکان دے گا۔“

جواب میں والد صاحب نے اُسے اِس ایک مکان کے عوض پانچ مکان دے دیئے اور تین دُکانوں میں سے دو دکانیں اُسے دے دیں تاکہ اُن کرایوں سے اُس کے اور اُس کی بیوی کے بچوں کی پرورش ہو جائے۔ چچا مُحسن علی نے ایک خط میں اپنے بڑے بھائی احسان اللہ کو لکھا،

اگرچہ برادری نے مجھے اُکسایا کہ گھر تم لو، مگر حیا مجھے روکتی رہی کہ مَیں اِخوان صاحب کو کہوں کہ اِس گھر سے نکل جاؤ۔ مَیں نے لوگوں کے کہنے کی کچھ پروا نہ کی، کیونکہ سب اُن کے دُشمن ہو گئے تھے...

آپ جائداد کی تقسیم پر حیران ہوتے ہیں، لیکن ذرا غور کریں۔ قُدرت نے دونوں بڑے بھائیوں سے مجھے لیاقتوں میں کم حصّہ دیا ہے۔ آپ کو تو علمی لیاقت ہے جس کے باعث آپ نے سرفرازی حاصل کر لی ہے۔ رحمت علی کو قُدرت نے تجارت کی لیاقت دی ہے جس کی وجہ سے وہ نارووال میں سب سے بڑے تاجر گنے جاتے ہیں۔ مگر مجھے کوئی لیاقت حاصل نہیں ہے۔

جب محلّے والوں نے دیکھا کہ یہ چال بھی کارگر نہ ہوئی تو تیسری چال وہ یہ چلے کہ چچا مُحسن علی کو کہا، "باپ اور بیٹے میں جُدائی ڈال دو اور برکت علی کو اپنے پاس رکھ لو۔" کیونکہ وہ سب جانتے تھے کہ مجھے چچا سے بہت محبّت ہے۔

جب مَیں آیا تو وہ مجھے کہنے لگے، "بھائی جی تو کافر ہو گئے ہیں۔ کسی مومن کو روا نہیں کہ وہ کافر کے ساتھ رہے۔ اب تم میرے ساتھ رہو، کیونکہ اُن کے ساتھ کھانا کھانا بھی حرام ہے۔"

مَیں نے جواب دیا، "مَیں یہ ہرگز نہ کروں گا۔ وہ کافر نہیں بلکہ اہلِ کتاب ہیں۔ اُن کے ساتھ رہنا اور کھانا کھانا جائز ہے۔ مَیں عیسائی نہیں ہوں گا، لیکن مَیں اُن کا ساتھ ایسے آڑے وقت میں کبھی نہ چھوڑوں گا جب سب لوگ اور آپ بھی اُن کے مخالف ہو گئے ہیں۔"

میرے چچا دین کے معاملے میں ہمیشہ میرے ہادی رہے تھے۔ اُنہوں نے مجھے ایک کتاب دی اور کہا، "اِس کا غور

سے مطالعہ کرنا۔ یہ تم پر کتابِ مقدّس کی خامیاں ظاہر کر دے گی۔ مذہبی امور میں بھائی جی کی باتیں نہ سُننا۔"

اِس رسالے کا نام زُبدَۃ الاَقاویل تھا جس میں کتابِ مقدّس کے متضاد مقامات کو جمع کر دیا گیا تھا اور جرمن نقادوں کی کُتب سے کتابِ مقدّس کے متن کے اختلافاتِ قِرأت اکٹھے کئے گئے تھے۔ اُن سے مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ کتابِ مقدّس خدا کا اصلی کلام نہیں بلکہ محرّف ہے۔ آخری حصّے میں انجیل اور قرآن کا موازنہ کر کے پیش کر دیا گیا تھا کہ قرآن کی تعلیم دین و دُنیا کے اُمور پر حاوی ہے جبکہ انجیل کی تعلیم ناقص ہے۔ کیونکہ اُس میں ناقابلِ عمل احکام ہیں۔

جب مخالفین نے دیکھا کہ یہ چال کارگر نہیں ہوئی تو وہ ایک اَور چال چلے۔ اگلے روز اُنھوں نے قوم کے چند سربراہوں کو میرے ہونے والے سُسر شیخ غلام صادق کی دُکان پر اکٹھا

کر کے مجھے بُلا بھیجا۔ شیخ غلام صادق کہنے لگا، "دیکھ تُو میرا بیٹا ہے۔ مَیں تیرے تمام اخراجات کا حامل ہوں گا اور تجھے ایم۔اے تک تعلیم دلواؤں گا۔ تُو میرے پاس چلا آ۔ تیرا باپ تو لالچ کے مارے عیسائی ہو گیا ہے۔"

سب لوگوں نے مجھے سمجھانا شروع کیا۔ مَیں نے جواب دیا، "آپ خود جانتے ہیں کہ تمام قوم میں والد صاحب جیسا نیک اور پارسا شخص نہیں ہے۔ آپ اُن پر لالچ کی تُہمت لگاتے ہیں، جو سالوں سے آپ کا صدرِ انجُمن رہا ہے اور راست گوئی، دیانت داری، مزاج کی سنجیدگی اورغربا پروری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اگر اُنہیں لالچ ہوتا تو کیا وہ اپنی جائداد کی ایسی تقسیم کرتے؟ آپ ہی خدا لگتی بات کریں۔ آپ میرے تایا جی کی نسبت بھی کہا کرتے تھے کہ وہ لالچ کے مارے عیسائی ہو گئے ہیں۔ لیکن آپ کے سامنے اُنہوں نے دُنیا پر لات ماری اورفقیر ہو گئے۔ کیا حِرص اِسی کو کہتے ہیں؟ ہاں،

آپ لوگ مجھے لالچ دے رہے ہیں تاکہ مَیں اُن سے جُدا ہو جاؤں۔ مگر مَیں آپ سب کو چھوڑ دوں گا۔ لیکن اُنہیں ہرگز نہیں چھوڑوں گا اور اسلام کو بھی ترک نہیں کروں گا جب تک مسیحی ایمان کی صداقت مجھ پر ظاہر نہ ہو جائے۔"

جب مَیں گھر آیا تو مَیں نے والد صاحب سے اُن باتوں کا ذکر کیا جو چچا مُحسن علی نے اور غلام صادق نے مجھے کہی تھی۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ یہ بہتر ہو گا کہ تم قرآن و انجیل کا مقابلہ کرکے خود دیکھو۔ کیونکہ انجیل میں لکھا ہے،

> سب کچھ پرکھ کر وہ تھامے رکھیں جو اچھا ہے۔
> (1۔ تِھسلُنیکیوں 21:5)

اُن کے انتظام کے مطابق مَیں جون کی کڑکتی دُھوپ میں وہاں کے انگریز خادم کے پاس گیا۔ اُنہوں نے کہا، "ہم متّی کی انجیل پڑھنی شروع کریں گے۔"

مَیں نے جواب دیا، ”مَیں اناجیل کے مضامین سے خوب واقف ہوں اور اِس کے بہت سے مقامات مجھے حِفظ ہیں۔ آپ میرے اعتراضات رفع کریں۔“ یہ کہہ کر مَیں نے زُبدَۃ الاَقاویل کو کھول کر بہت سے اعتراضات پیش کر دیئے۔

اُن کو نہ قرآن سے واقفیّت تھی اور نہ اسلام کے اصولوں کا علم تھا۔ نہ وہ متناقص مقامات کے جواب دے سکے۔ سب سے بڑی دلیل اُنہوں نے یہ دی کہ مسیحی مذہب حق ہے، کیونکہ سلطنتِ برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا اور یہ سلطنت مسیحی ہے۔ وہ بے چارے نِرے انگریز تھے جو حکومت کے نشے میں سرشار تھے۔ غرور اُن کی رفتار سے ٹپکتی تھی۔ بعد کے زمانے میں جب دو عالَم گیر لڑائیاں ہوئیں تو اُنہوں نے انجیل کی خدمت چھوڑ کر برطانوی فوج کے لئے ہندوستانی سپاہیوں کی بھرتی کا کام اختیار کر لیا۔ جب پہلی جنگ ختم ہوئی تو وہ پھر مشنری ہو گئے جبکہ دوسری جنگ کے شروع میں وہ دوبارہ ”بھرتی کرنے والے صاحب“ ہو گئے۔ جنگ کے بعد

وہ پھر مشنری ہو گئے۔ ایسی طبیعت رکھنے والے انسان سے کیا اُمید ہو سکتی تھی کہ درجِ بالا دلیل کے سوا مسیحی دین کے حق میں وہ کچھ کہہ سکتے؟

ایک ہفتے کے بعد مَیں نے اُن سے کہا، "مَیں کل سے نہیں آؤں گا، کیونکہ دُھوپ میں ڈھائی میل آتا جاتا ہوں۔ آپ نے کبھی پانی تک نہ پلایا، اور نہ آپ میرے کسی اعتراض کا جواب دینے کے اہل ثابت ہوئے ہیں۔"

مَیں نے یہی بات والد صاحب سے کہی۔ اُنہوں نے مجھے میزان الحق، اثارِ شیریں، تاریخِ محمدی، منار الحق، نیاز نامہ، ینابیع الاسلام، ضربتہ عیسوی، اعتراضات المسلمین، ثلاثتہ الکُتب، حل الاشکال، تعلیمِ محمدی، اُمہات المومنین، تقویتہ الایمان، تیغ و سپرِ عیسوی، خطوط بنام جوانانِ ہند، آئینۂ قرآن وغیرہ کتابیں دیں اور کہا، "یہ کتابیں تمہاری مُشکلات کو حل کرسکیں گی۔"

مَیں اِن کتابوں کا غور سے دن رات مطالعہ کرتا رہا۔ میرے چچا اپنے کام پر واپس چلے گئے تھے۔ اُن کی غیر حاضری میں مولوی حشمت علی آئے ہوئے تھے۔ مَیں اُن کے پاس گیا، لیکن وہ بے چارے مسیحی دین کے علوم سے کورے تھے اور اِن مختلف کتابوں کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکے۔ کیونکہ وہ صرف شیعہ مذہب سے سطحی طور پر ہی واقف تھے، اور اِن کتابوں میں شیعہ اور اہلِ سُنت کی مستند کتابوں کے حوالے تھے۔ مَیں نے حکیم محمد وارث اور قوم کے سربراہوں سے اِن کتابوں کے اعتراضوں کا ذکر کیا، لیکن سب بے سود ثابت ہوا۔ لاچار مَیں اِن کتابوں کے مضامین کی روشنی میں اپنے اعتراضات اور زُبدَ الاَقاویل کے اعتراضات پر غور کرنے لگا۔

جوں جوں مَیں مطالعہ کرتا گیا مجھ پر یہ ظاہر ہوتا گیا کہ انجیل محرّف نہیں ہے اور کہ از رُوئے قرآن حضرت محمد قیامت کے روز گناہ گاروں کے شفیع نہیں ہو سکتے۔ قرآن کے مطابق

وہ صرف عرب کے رسول ہو کر دیگر انبیا کی طرح بھیجے گئے تھے اور جہان کے نجات دہندہ نہیں ہو سکتے۔ انجیل کی تعلیم روحانی ہے۔ قرآن ایک اخلاقی کتاب ہے جو کسی شخص کو ہدایت تو دے سکتی ہے لیکن گناہوں کے پنجے سے نہیں چھڑا سکتی۔ آخر مَیں نے والد صاحب سے کہا، "مَیں بھی مسیح کا پیروکار ہونے کو تیار ہوں۔"

وہ بہت خوش ہوئے اور کہا، "خدا کا شکر ہو جس نے ہم سب پر رحم کیا ہے اور سب کو نورِ ایمان عطا کیا ہے۔"

میرا بپتسمہ عیدِ تثلیث کے چھٹے اتوار کے روز 1907ء کو ہوا۔ میرا عیسائی نام برکت اللہ رکھا گیا۔ جب مَیں بپتسمہ پا کر عبادت گاہ سے باہر نکلا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مَیں گویا ہَوا میں چل کود رہا ہوں۔ کیونکہ گناہوں کے بوجھ کا احساس جو مجھے ستاتا رہتا تھا جاتا رہا، اور اُس کی جگہ خوشی، چَین اور اطمینان نے میرے دل میں جگہ لے لی۔ اِس عجیب تجربے

کو مَیں تا دمِ مرگ بھول نہیں سکتا۔ بپتسمہ پانے کے تین روز بعد مَیں واپس بٹالہ چلا گیا۔

مخالفین کا آخری حربہ زیادہ کام یاب رہا۔ ہمارے مسیحی ہونے کے چند ماہ بعد سیالکوٹ کے حاکمِ ضلع نے انگریز پادری کو میونسپل کمیٹی کا پریزیڈنٹ بنا دیا تھا۔ قوم کا ایک فرد سیکرٹری تھا۔ اُس نے پادری کو "حضور، خداوند، آقا، مالک" کہہ کہہ کر اپنے ہاتھوں پر چڑھا لیا اور والد صاحب پر میونسپل ایکٹ کے ماتحت دو تین مقدّمے کرکے کہا کہ اگر آپ نے رحمت اللہ کی حمایت کی تو آپ منصف مزاج نہ ہوں گے۔ انگریز قوم انصاف کے لئے مشہور ہے۔ پادری اردو جانتا نہ تھا اور نہ بہت پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اُس نے کاغذات پر دست خط کر دیئے اور مقدّمات دائر ہو گئے جس سے والد صاحب کو بڑی پریشانی اُٹھانی پڑی۔ یوں اُنہیں مسلمانوں سے بڑھ کر ایک عیسائی خادم الدین کے ہاتھوں زیادہ ایذا پہنچی۔ ؎

> من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
> کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد
> مَیں بے گانوں کے بارے میں ہرگز شکایت نہیں کر رہا
> کیونکہ جو کچھ میرے خلاف کیا جا رہا ہے وہ میرا واقف کار کر رہا ہے۔

رحمت اللہ کی گواہی

جب بشپ لیفرائے اُس سال نارووال آئے تو وہ والد صاحب کی دُکان پر اُنہیں ملنے گئے۔ وہاں دیکھا کہ ایک ہجوم لگا ہوا ہے، اور وہ مسلمانوں سے مباحثہ کر رہے ہیں۔ بشپ لیفرائے خود بڑے زبردست مناظر تھے۔ چنانچہ وہ بھی دُکان میں فرش پر بیٹھ گئے اور مناظرے میں حصّہ لیتے رہے۔ بشپ صاحب نے 24 نومبر کے روز اُنہیں مُستحکم کیا اور لکھا، "مجھے آج بڑی خوشی ہوئی ہے کہ مَیں نے اپنے پرانے رفیق اور معزز دوست احسان اللہ کے بھائی رحمت اللہ اور اُن کی اہلیہ

کو مُستحکم کیا ہے۔ مَیں نے اُن سے گزشتہ اتوار کی صبح بڑی دیر تک گُفتگو کی جس سے مجھے بڑی خوشی حاصل ہوئی اور میرا حوصلہ بھی بلند ہوگیا۔ اُن کا ایمان بے ریا، سچا اور خالص ہے، اور وہ بہت سرگرم ہیں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ اُن کا بپتسمہ پھل لائے گا اور اُن کا نمونہ اُن کی قوم میں سے بہتوں کو خداوند کے قدموں میں لائے گا۔ کیونکہ اِس قوم میں سے پچھلے دنوں میں بہت سے دین دار مرد اور عورتیں جماعت میں شامل ہوئی ہیں۔"

جب بشپ صاحب لاہور واپس گئے تو اُنہوں نے 30 نومبر کے روز ایک قلمی خط احسان اللہ کو لکھا،

برادرِ عزیز۔ مَیں نارووال میں آپ کے بھائی اور بھابھی سے ملاقات کرکے نہایت خوش ہوا۔ مَیں اُن سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ وہ مجھے بے حد اچھے لگے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ خدا اُنہیں استعمال کرے گا تاکہ اُن کے ذریعے بہت لوگوں پر خداوند عیسیٰ کے حق کا نور چمکے۔ مَیں اُن کے لئے اکثر دُعا

کرتا ہوں۔ خدا اُن پر کثرت سے اپنی برکت نازل کرے اور آپ کے کام پر بھی جو آپ خداوند کے لئے کر رہے ہیں برکت بخشے۔ آپ کا محبِّ صادق، جی۔اے۔ لاہور۔

جب کبھی بشپ صاحب نارووال آتے وہ ہمیشہ والد صاحب کی دُکان پر جاتے اور وہاں بیٹھ کر اُن سے اور دیگر مسلمانوں سے دینی گُفتگو کرتے۔ جب اُنہوں نے 1916ء میں والد کے انتقال کی خبر سُنی تب اُنہوں نے شملہ سے احسان اللہ کو ایک خط لکھا،

عزیز احسان، مجھے ابھی خبر ملی ہے کہ آپ کے بھائی مسیح میں آرام پا کر سو گئے ہیں اور اپنے اُس آقا کی قُربت اور حضوری میں کھڑے ہیں جس کو وہ اِس قدر پیار کرتے تھے۔ مَیں آپ کو برادرانہ ہم دردی ظاہر کرنے کے لئے یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ آپ کو تو یہ علم ہے کہ مجھے اُن سے کس قدر اُنس تھا۔ اُن کی دوستی میرے لئے فخر کا باعث تھی۔ وہ ہزاروں میں ایک شخص تھے۔ اُن کی طبیعت خلوصِ نیّت، حلیمی، انکساری اور سرگرمی سے کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مَیں جانتا ہوں کہ اُن کے

جانے سے آپ کے دل میں خلا پیدا ہو گیا ہے، لیکن مَیں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ خدا کا شکر کرتے ہوں گے کہ خدا نے آپ کے بھائی کو استعمال کیا تھا تاکہ وہ خداوند مسیح کی زندگی کا اثر بہتوں پر ڈالیں۔ خدا روح القدس جو تمام تسلّی کا سرچشمہ ہے آپ سب کو تسلّی عطا کرے۔ میری طبیعت اچھی نہیں رہتی اور یہاں کولکاتہ سے آرام کے لئے آیا ہوں۔ اِس واسطے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ اُمید ہے کہ آپ خدا کے فضل سے خیریّت سے ہوں گے۔ آپ کا محبِّ صادق۔

رحمت اللہ کی محبت کا غلبہ

بپتسمہ پانے سے پہلے جب تک مَیں گھر میں رہا۔ ہمارے مکان پر برادری نے شہر کے غُنڈوں کا پہرہ لگا دیا تھا تاکہ نہ کوئی ہم کو ملنے آئے اور نہ پانی بھرے۔ مَیں زنانہ مشن کے احاطے سے دوتین مرتبہ پانی کا ایک گھڑا اور ایک بالٹی لے آتا تھا۔ لیکن گرمیوں کے دنوں میں ہمسائی کا ایک گھڑا پانی

اور میرا لایا ہوا پانی کِس طرح کفایت کر سکتا تھا۔ تو بھی گُزارہ ہوتا گیا۔ میرے بٹالہ آنے کے بعد پانی بھرنے کی مُشکل بڑھ گئی۔ پرمانند صاحب لکھتے ہیں،

رحمت اللہ پر پانی کی وجہ سے سخت مُصیبت آئی۔ ہوتے ہوتے یہ خبر انگریز خادم تک پہنچی۔ اُس نے قوم کے لوگوں کو بہت سمجھایا، لیکن چونکہ وہ ابھی پریزیڈنٹ نہیں بنا تھا اُس کی کسی نے نہ مانی۔ آخر اُس نے اُن کے والد صاحب کو بتائے بغیر سیالکوٹ ڈپٹی کمشنر کو لکھا۔ ڈپٹی کمشنر خود نارووال آیا، اور اُس نے سب کو بُلایا۔ جب اُن کے والد صاحب کو یہ پتا چلا کہ خادم نے ڈپٹی کمشنر کو بُلا بھیجا ہے تو اُنہوں نے بہت بُرا مانا۔ کیونکہ وہ مسیح خداوند کی خاطر ہر قسم کی ایذا خوشی اور صبر سے برداشت کرنا چاہتے تھے تاکہ اُن کے صبر کا اثر قوم پر ہو۔ خیر، جب سب جمع ہوئے تو حاکمِ ضلع نے تمام باتوں کو دریافت کر کے کہا کہ ملک کے قانون کے مطابق مذہب کی تبدیلی سے سابق حقوق زائل نہیں ہو جاتے۔ اِس واسطے میاں رحمت اللہ

کا حق ہے کہ جس کنوئیں سے وہ پہلے پانی لیتے تھے اُسی کُنوئیں سے اب بھی لیں۔

یہ بات قوم کے لوگوں کے لئے مُشکل تھی، کیونکہ وہ کُنواں بڑی مسجد کا کُنواں تھا۔ تب اُس نے میاں صاحب کو کہا، "بالٹی لاؤ اور میرے سامنے کُنوئیں سے پانی نکالو۔"

تب اُن کے والد صاحب کھڑے ہو گئے اور قوم سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، "بھائیو، مَیں نے صاحب ڈپٹی کمشنر کے آگے شکایت نہیں کی اور نہ مجھے یہ خبر تھی کہ وہ آئیں گے۔ کیونکہ مَیں مسیح خداوند کے نقشِ قدم پر چل کر اپنے ایمان کے لئے دُکھ اُٹھانا چاہتا تھا۔ اور مَیں رسولوں کی طرح خدا کا شُکر کرتا تھا کہ مَیں اِس لائق ٹھہرا کہ خداوند کے نام کی خاطر بے عزّت کیا جاؤں۔ بازاروں اور گلیوں میں لعنت و پھٹکار کی آوازیں میرے لئے فخر کا باعث تھیں۔ آپ کا اِس میں قصور بھی نہیں، کیونکہ آپ اِس خیال سے یہ سب باتیں کر رہے ہیں کہ آپ خدا کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ کی شریعت کے شکنجے نے یہ سب پیچ گھمائے ہیں اور میرا مکمل قطعِ تعلق کر دیا ہے۔ لیکن

اب آپ نے خود اپنے کانوں سے حاکمِ ضلع کے حُکم کو سُن لیا ہے کہ جو میرا حق ہے وہ آپ مجھ سے قانوناً چھین نہیں سکتے۔ مَیں نے آپ کو یہی سمجھایا لیکن آپ نے نہ ماننا تھا اور نہ مانے، حالانکہ گرمی کے سبب سے ہم پیاسے رہے۔ آپ نے میرے گھر کو کربلا بنا دیا۔ یزید کی طرح آپ میرے بچوں کو روٹی پانی کے بغیر بلکتے دیکھتے رہے اور ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اب یہ کُنواں جس میں سے پانی نکالنا میرا حق ہے مسجد کا کُنواں ہے۔ اگر مَیں نے اپنا حق استعمال کرکے اُس میں سے پانی نکالا تو آپ کے خیال کے مطابق یہ پلید ہو جائے گا اور آپ اُس میں سے پانی نہیں بھریں گے۔ آپ کے بچوں کی بھوک پیاس کا وہی حال ہو جائے گا جو ہمارا ہو رہا ہے اور مَیں یہ بات ہرگز نہیں چاہتا، کیونکہ میرے خداوند کا حکم ہے کہ جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں وہی تم بھی اُن کے ساتھ کرو۔ مَیں خوشی سے اپنے حق سے سب کے رو برو دست بردار ہوتا ہوں۔ میری عرض صرف یہ ہے کہ آپ سقّے

کو میرے گھر میں حسبِ سابق پانی بھرنے دیں۔ وہ دوسرے عیسائیوں کے گھروں میں بھی تو پانی بھرتا ہے۔"

اِن باتوں کو سُن کر سب خاموش ہو گئے۔ پھر اُن کا سربراہ لیڈر اپنا سر نیچا کر کے بولا، "بھائی رحمت علی۔ آپ نے ہماری عزّت رکھ لی۔ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آئندہ آپ کو روٹی پانی کے معاملے میں کوئی رُکاوٹ نہ ہو گی۔ لیکن آپ برادری سے خارج رہیں گے۔"

یوں میاں رحمت اللہ کے الفاظ نے محلّے کی فضا کو بدل دیا اور گلی گلی میں لوگ یہی کہتے سُنائی دیئے کہ شیخ رحمت علی نے ہماری لاج اور ہمارے مذہب کی لاج رکھ لی ہے۔ خدا کا کلام میاں جی کے حق میں پورا ہوا کہ

> ازلی خدا تیری پناہ گاہ ہے، وہ اپنے ازلی بازو تیرے نیچے پھیلائے رکھتا ہے۔ (استثنا 27:33)

رفتہ رفتہ حالات نے پلٹا کھایا۔ میاں جی کی محبّت سب رُکاوٹوں پر غالب آئی۔ ایک دو سال کے اندر سب چھوٹے بڑے

اُن کی بے ریا زندگی، خلوص دلی، راست رَوی اور محبّت بھری زندگی کی وجہ سے اُن کی حد سے زیادہ عزّت کرنے لگے۔

مجھے نارووال گئے کوئی تین سال گُزرے تھے کہ ہاؤس ٹیکس کو تجویز کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں سب مذہبوں کے نمائندوں کو سب گھروں پر ٹیکس لگا کر بارہ سو روپئے سالانہ جمع کرنا تھا۔ مسلمانوں نے میاں رحمت اللہ کو اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ جب اُن سے کہا گیا کہ وہ مسلمان نہیں ہے تو اُنہوں نے کہا، ”کوئی ہرج نہیں۔ اُس میں ایک صفت ہے جو ہم کسی اَور میں نہیں پاتے۔ وہ کھری اور بے لاگ سچی بات کرتا ہے۔ کسی کی طرف داری نہیں کرتا اور نہ کسی سے ڈرتا ہے۔ وہ ہمارے حالات سے واقف بھی ہے اورفراخ دل ہے، اور اُس پر ہمارا اعتبار اور بھروسا ہے۔“

یوں میاں صاحب نے اپنے مخلصانہ سلوک اورصبرو محبّت سے اپنے جانی دشمنوں پرفتح پائی۔ اگر وہ آزمائشوں کے وقت صبر کا پٹکا نہ باندھتے اور ایثارنفسی اورخود انکاری کا جوتا نہ پہنتے

تو وہ اُس خاردار زمین میں نہ چل سکتے جہاں کانٹے ہر جانب سے اُن کے دامن کو پکڑے ہوئے تھے۔ تب یہ نہ مُرجھانے والا سہرہ اُن کے سر پر نہ باندھا جاتا۔

وہ جس قدر کم گو اور نرم گو خاموش طبیعت کے انسان تھے اُسی قدر وہ شیریں کلام تھے۔ اُن کی زبان میں اثر تھا، اُن میں کششِ ثقل کی سی کشش تھی۔ لوگ خود بخود اُن کی طرف کھِنچے چلے آتے تھے۔ اگرچہ اُن کی طبیعت میں نرمی تھی، لیکن وہ ارادے کے پکّے تھے۔ چنانچہ 50 برس سے زائد عُمر میں اُنہوں نے یک لخت حُقّے کا استعمال ترک کر دیا حالانکہ وہ حُقّے کے اِس قدر عادی تھے کہ اُن کی اہلیہ صبح کے وقت اُنہیں جگانے سے پہلے حُقّہ تیار کر کے اُن کے مُنہ کے پاس رکھ دیا کرتیں۔ کیونکہ حُقّے کے کش لینے کے بعد اُن کے جسم میں دم پھرا کرتا تھا۔

جھوٹ، گالی گلوچ اور جلی کٹی سُنانے سے اُنہیں سخت نفرت تھی۔ جو اُن کی صُحبت میں بیٹھتا اُس سے یہ باتیں خود بخود چُھٹ جاتیں۔ اُنہوں نے "ست پرچارک سبھا" قائم کی جس کا جلسہ میرے دفتر میں ہر مہینے میں دو بار ہوا کرتا تھا۔ اُس کی

ممبری کی ایک شرط تھی کہ ممبر خود سچ بولے گا اور دوسروں کو سچ بولنے کی تلقین کرے گا۔ اِس سبھا کا ایسا اچھا اثر ہوا کہ لوگ اپنے چھوٹے موٹے مقدّمے اور پیچیدہ معاملے اِس سبھا کے سامنے لانے لگے۔ کیونکہ اُنہیں رحمت اللّٰہ پر اعتبار تھا۔ جب وہ مسلمان تھے تو انجمنِ شیعاں کے صدر تھے، لیکن اب تو وہ تمام نارووال کے صدر ہو گئے۔

جب لوگ اُن سے رفتہ رفتہ سودا مول لینے لگے تو وہ ایک ہی دام مُنہ سے کہتے تھے اور گاہکوں سے ایک پیسہ کم و بیش نہیں لیتے تھے۔ بعض اوقات میرے سامنے ایک آنے پر پچاس ساٹھ روپئے والے گاہک کو موڑ دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک زبان اور پورا تول خداوند کو پسند ہے۔ جب رفتہ رفتہ گاہکوں کو اُن کے سچ بولنے کا علم ہو گیا تو اُن کی دُکان چل پڑی اور سینکڑوں روپوں کا مال بغیر کسی تکرار اور مغز خوری کے بِکنے لگا۔

میاں صاحب کی دُکان کیا تھی، منادی کا اچھا خاصہ مقام تھا۔ جب کبھی مَیں اُدھر سے گزرتا یہی دیکھتا کہ پانچ سات آدمی

اُن کے پاس بیٹھے ہیں، اور وہ اُنہیں انجیل سُنا رہے ہیں۔ جن دنوں میں اُن کا بائیکاٹ تھا، اُس زمانے میں کوئی گاہک تو اُدھر جانے کا نام بھی نہیں لیتا تھا گو میاں صاحب کا روزانہ مشغلہ ہی یہ تھا کہ لوگوں سے بحث مباحثہ کریں۔

اُن کی مالی تباہی کو دیکھ کر مشن والوں نے اُنہیں کہا کہ آپ کلارک آباد کے گاؤں کے مینجر ہو جائیں۔ لیکن اُنہوں نے یہ بات منظور نہ کی تا کہ لوگ یہ خیال نہ کریں کہ وہ لالچ کی خاطر عیسائی ہو گئے ہیں۔ اُن کا دینی جوش دیکھ کر جماعت والوں نے اُن سے کہا، "آپ خادم الدین بن جائیں۔ لیکن اُنہوں نے آزادانہ تبلیغ کی خدمت کرنے کا تہیّہ کر لیا ہوا تھا۔ کیونکہ اُنہوں نے دیکھا تھا کہ اُن کے بڑے بھائی احسان اللّٰد فقیرانہ زندگی بسر کر کے نجات کی خوش خبری سُنایا کرتے تھے۔ حق تو یہ ہے کہ میاں رحمت اللّٰد خداوند کے جاں نثار عاشق تھے اور ہر چھوٹے بڑے کو نجات کی بشارت دینا تو اپنا اوّلین فرض خیال کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح پولس رسول خیمے سلائی کرنے سے پیٹ پالتے اور انجیل کی بشارت

سُناتے تھے وہ بھی دکان داری کرکے انجیل شریف کا پیغام لوگوں کو سُنائیں۔

وہ قرآن کے حافظ تھے اور انجیل اُنہیں زبانی یاد تھی۔ وہ اُس کی اصل یونانی زبان اور انگریزی زبان بھی سیکھ رہے تھے۔ اُنہیں کتابِ مقدّس کی زیادہ واقفیّت پانے کا ازحد شوق تھا۔ جب کبھی ہمارے ہاں سمرسکول ہوتے وہ اپنی دُکان بند کرکے اور مالی نقصان کی طرف سے بے پروا ہوکر دو تین ہفتے جماعت میں بیٹھتے اور نوٹ لیتے رہتے تھے۔ اتوار کے روز وہ کبھی دُکان نہیں کھولتے تھے اور تمام دن عبادت اور کلام پڑھنے میں صَرف کر دیتے تھے۔

اکثر اوقات جب مَیں یا دوسرے خادم الدین گاؤں میں نکل جاتے تو ہر بُدھ کی شام کی عبادت کے وقت وہ وعظ کیا کرتے تھے۔ ہفتے کی دُعائیہ عبادت میں وہ ہمیشہ آیا کرتے اور دُعا کیا کرتے تھے۔ وہ بازاری منادی میں ہر جمعے ہمارے ساتھ جایا کرتے تھے اور اکثر اوقات نجات کی خوش خبری لوگوں کو سُناتے تھے۔ بریار کے میلے کے دنوں میں دُکان بند کرکے وہ

اپنا تمام وقت انجیل کی بشارت میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے وہ کتابِ مقدّس کے مقامات کو جو زبانی یاد تھے وِردِ زبان کرتے، پھر 51 زبور پنجابی میں گاتے، اِس کے بعد حمد و ستائش کے گیت گاتے اور آخر میں دُعا کر کے سویا کرتے تھے۔ وہ اکثر عبرانیوں کا یہ حوالہ مجھے سُنایا کرتے تھے،

> ایمان کے پہلے دن یاد کریں جب اللہ نے آپ کو روشن کر دیا تھا۔ اُس وقت کے سخت مقابلے میں آپ کو کئی طرح کا دُکھ سہنا پڑا، لیکن آپ ثابت قدم رہے۔ کبھی کبھی آپ کی بےعزتی اور عوام کے سامنے ہی ایذا رسانی ہوتی تھی، کبھی کبھی آپ اُن کے (یعنی احسان اللہ) ساتھی تھے جن سے ایسا سلوک ہو رہا تھا۔ جنہیں جیل میں ڈالا گیا آپ اُن کے دُکھ میں شریک ہوئے اور جب آپ کا مال و متاع لُوٹا گیا تو اُنہوں نے یہ بات خوشی سے برداشت کی۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ وہ مال ہم سے نہیں چھین لیا گیا جو پہلے کی نسبت کہیں بہتر ہے اور ہر

صورت میں قائم رہے گا۔ چنانچہ اپنے اِس اعتماد کو ہاتھ سے جانے نہ دیں کیونکہ اِس کا بڑا اجر ملے گا۔ لیکن اِس کے لئے آپ کو ثابت قدمی کی ضرورت ہے تاکہ آپ اللہ کی مرضی پوری کرسکیں اور یوں آپ کو وہ کچھ مل جائے جس کا وعدہ اُس نے کیا ہے۔ (عبرانیوں 10:32–36)

کیونکہ ہماری موجودہ مصیبت ہلکی اور پل بھر کی ہے، اور وہ ہمارے لئے ایک ایسا ابدی جلال پیدا کر رہی ہے جس کی نسبت موجودہ مصیبت کچھ بھی نہیں۔

(2۔کُرِنتھیوں 4:17)

اگر اُنہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ فلاں مسلمان یا عیسائی بیمار ہے تو وہ ضرور اُن کے گھر جاتے اور دُعا کرتے تھے۔ ہمارے سب مُبلّغین اُنہیں اپنا ہم درد جان کر پہلے اُن کے پاس جاکر اُن کے اپنے نجی معاملات میں صلاح لیتے تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے نارووال کی چرچ کمیٹی کے ممبر چُنے جاتے تھے اور وہاں سے ڈسٹرکٹ مشن کونسل اور اسقفی کونسل کے لئے چنے جاتے رہے۔

جب وہ بیمار ہوئے تو بیمار پُرسی کرنے والوں کا تانتا لگ گیا، اور جب وہ اگست 1912ء میں فوت ہوئے تو اُن کے جنازے کے ساتھ نہ صرف عیسائی تھے بلکہ ہندوؤں، سکھوں، شیعوں اور سُنّیوں کی ایک بھاری تعداد تھی حالانکہ اُس روز بارش ہو رہی تھی۔

مرتے دم اُن کے مُنہ پر یہ الفاظ تھے، "خداوند بھلا ہے۔ اُس کی رحمت ابدی ہے۔ اُس کی وفاداری پُشت در پُشت ہے۔" اپنے خاندان کی طرف آخری دم متوجّہ ہو کر کہا، "خداوند تمہاری رکھوالی کرے اور تم کو برکت پر برکت دے۔" پھر آسمان کی طرف نگاہ کر کے کہا، "اے خداوند، میری روح کو قبول کر۔" وفات کے وقت اُن کی عُمر چھپّن سال کی تھی۔ اُن کے بعد اُن کی رفیقۂ حیات 29 سال زندہ رہیں اور اسّی سال کی عُمر پا کر اِس جہان سے رِحلت کر کے اپنے خاوند سے اور اپنے بیٹے عنایت اللہ اور بیٹی برکت بی بی سے جا ملیں۔

جب والد صاحب کی وفات ہوئی تو میرے مُنہ سے نکلا،

> رب کرے کہ مَیں راست بازوں کی موت مروں، کہ میرا انجام اُن کے انجام جیسا اچھا ہو۔ (گنتی 10:23)

13
جھنگ بار کا مشنری انچارج

جھنگ بار پر تقرر

احسان اللہ 1900ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچے تھے۔ اِس کے ایک سال بعد بیٹ من 1902ء کے شروع میں ہمیشہ کے لئے اپنے وطن کو واپس چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد ہولڈن کچھ عرصہ رہے۔ جب وہ بھی چلے گئے تو بشپ لیفرائے کے اشارے پر احسان اللہ جھنگ بار کے تمام علاقے کے مشنری انچارج مقرر کئے گئے۔ وہ پہلے ہندوستانی

خادم تھے جن کے سپرد یہ ذمّے داری کی گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اُنہوں نے اِس ذمّے داری کو خوب نبھایا۔ ایسا کہ اُن کے حاسد مشنری تک بھی اُن کا لوہا مان گئے۔ ایک انگریز مشنری جو گاؤں میں اَن تھک کام کرنے کے لئے مشہور تھا لکھتا ہے،

> مَیں خدا سے یہی دُعا کرتا ہوں کہ وہ وقت جلدی آئے جب پنجاب کے تمام ہندوستانی خادم احسان اللّٰہ کی سی جاں فشانی اور قابلیّت کے ساتھ کام کریں۔

اُنہوں نے تمام علاقے کی جماعتوں کو منظّم کر کے اُن کی دُنیاوی اور دینی تعلیم کا انتظام کیا، جا بہ جا لڑکوں اور لڑکیوں کے سکول کھولے۔ اُن کے مبلّغین ہی اُن سکولوں کے استاد ہوتے تھے۔ وہ ہر سال مبلّغین کو ایک ماہ کے لئے مختلف جگہوں میں اکٹھا کر کے اُنہیں تعلیم دیتے تھے، اُنہیں الہٰیات کے امتحانات پاس کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور اُنہیں خود پڑھاتے تھے۔

1905ء میں اُنہوں نے منٹگُمری والہ میں ایک ماہ کے لئے مبلّغین کو تعلیم دی جس طرح وہ نارووال کے علاقے میں رعیّہ میں تعلیم دیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے پانچ مبلّغین کو "ولیج بورڈ" کے امتحانات کے لئے تیار کیا اور پانچوں پاس ہو گئے۔ اگلے سال پھر پونے دو ماہ کے لئے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں مبلّغین کو تعلیم کے لئے جمع کیا۔ 1909ء میں اُنہوں نے نہ صرف مبلّغین کو بلکہ تمام علاقے کے مختلف گاؤں اور قصبوں کے سربراہ عیسائی لیڈروں کو جمع کیا تاکہ وہ انجیل جلیل کے اصولوں سے اور مسیح کی نجات سے واقف ہو کر ہندوؤں اور مسلمانوں کو صلیب کی خوش خبری کا پیغام سُنائیں۔ اُس سال اُنہوں نے سات سو اشخاص کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اور ایک ہزار نفوس کو منٹگُمری والہ میں اکٹھا کر کے اُنہیں جوش دلایا کہ وہ جس جگہ بھی جائیں خداوند مسیح کے نام کا پرچار کریں۔ ساتھ ساتھ وہ عیسائیوں کو ہر جگہ بیدار کر کے مضبوط بنائیں تاکہ ہر

ایک جگہ کی جماعت اپنے مبلّغ کے اخراجات کی ذمے دار ہو جائے اور اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اَن پڑھ اور ناخواندہ لوگ بے دھڑک ہو کر اپنے نجات دہندے کا پیغام غیر مسیحیوں کو سُنانے لگے اور اِس کوشش میں رہے کہ مختلف مقامات کی جماعتیں اپنے استادوں کی تنخواہ کی ذمے دار ہو جائیں۔

احسان اللہ پپتسمے دینے میں کبھی جلد بازی سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ اپنے مبلّغین کو اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے تعداد کی ضرورت نہیں۔ مجھے اِس بات کی ضرورت ہے کہ جس شخص کو تم پپتسمے کے لئے پیش کرو اُسے اپنے گناہوں کی مُعافی کا احساس ہو اور انجیل جلیل کے اصولوں کو خاطر خواہ جانتا ہو۔ مجھے کَوڑیوں کی ضرورت نہیں۔ مجھے سونے اور خالص سونے کی ضرورت ہے۔ کَوڑیوں کا ڈھیر عموماً ایک روپئے کے برابر بھی نہیں ہوتا۔ اِسی طرح وہ استحکام کی رسم کے واسطے

بہت کم لوگ پیش کیا کرتے تھے اور ہمیشہ اِس بات کے خواہاں ہوتے تھے کہ جو اُمیدوار پیش کیے جائیں اُنہیں نئی زندگی کا تجربہ ہو۔ بشپ لیفرائے بھی یہی چاہتے تھے۔ جب کبھی وہ مستحکم کرنے کی خاطر ٹوبہ ٹیک سنگھ آتے تو دونوں مردِ خدا ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر ملتے اور ایک دوسرے کے روحانی تجربوں سے مستفید ہوتے تھے۔ 1906ء میں اُنہوں نے جھنگ بار کے تمام علاقے سے صرف تیس مردوں اور عورتوں کو استحکام کے لئے پیش کیا۔

ملتان میں جلسے

اِسی سال احسان اللہ نے مُلتان میں مقدّس ہفتے کی عبادتوں میں وعظ کیے۔ وعظ کیا تھے، اُنہوں نے لوگوں کے دلوں کو ہلا دیا۔ ملتان کی جماعت کو جھنجوڑے دے کر خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ ایک تو دن ہی مقدّس ہفتے کے تھے، پھر وعظ احسان اللہ کے! سونے پر سُہاگے کا کام ہوا۔ اُن

کے ولولہ انگیز وعظوں نے مبارک جمعے کے منظر کو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ایسے الفاظ میں پیش کیا کہ وہ بے اختیاری کی حالت میں رونے اور اپنے گناہوں کا اقرار کر کے خدا سے مغفرت مانگنے لگے۔ اُن کی تقریروں کی دھوم مچ گئی، اور بعض مخدوم اُنہیں ملنے کے لئے آئے جن کو اُنہوں نے خداوند مسیح کی نجات کی خوش خبری سُنائی۔ جماعت کے شرکا نے وعدے کئے کہ وہ آئندہ ایسی زندگی گُزاریں گے جو مسیح خداوند کے نام کے لائق ہو گی اور اپنے مسلمان اور ہندو بھائیوں میں نجات دہندے کا پیغام سُنایا کریں گے۔

دہرہ دون میں جلسے

اِس سال میں وہ اپنی رُخصت کے ایّام میں دہرہ دون گئے۔ اُن کے لئے حسبِ سابق جلسوں کا انتظام کیا گیا، اور اُنہوں نے جا بہ جا شہر میں اور گاؤں میں تقریریں کیں جن سے بیداری کی لہر وہاں کی جماعتوں میں از سرِ نو چل پڑی۔

اُن دنوں میں ایک نہایت شریف اور روحانی طبع کے خادم بنام بَینیٹ[a] وہاں متعیّن تھے جو نہایت جاں فشانی سے خداوند کی خدمت کیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے اور دیگر جماعتوں کے خادموں نے اُن جلسوں کا انتظام کیا تھا۔ جب لوگوں کو خبر ملی کہ احسان اللہ تقریریں کریں گے تو وہ بڑے شوق کے ساتھ آئے بلکہ اِس تعداد میں آئے کہ مُنتظمین بھی حیران ہو گئے۔ اُنہوں نے خدا کا شکر کیا جس نے میاں صاحب کے ذریعے دہرہ دون اور علاقے کی جماعتوں کو برکت بخشی۔ خاص کر جو جلسے چُوہڑ پور (اَین فیلڈ) میں ہوئے اُنہوں نے اُس عیسائی گاؤں کی کایا پلٹ دی جس جگہ آئے دن پارٹی بازی کی وجہ سے جماعت میں جھگڑے فساد ہوتے رہتے تھے۔ وہاں کی فضا بدل گئی۔ پارٹیوں کے سربراہ لیڈروں نے اقرار کیا کہ وہ آئندہ ایک دوسرے سے محبّت اورصُلح سے رہیں گے اور پارٹی بندی سے توبہ کی۔ اُس جگہ

Bennet[a]

آٹھ روز تک متواتر جلسے ہوتے رہے۔ چُوہڑ پور کے بعد بَینیٹ اُنہیں راجپور اورمسوری پہاڑ کی جماعتوں میں تقریریں کرنے کے لئے لے گئے۔ وہاں خدا نے میاں صاحب کو ایسا استعمال کیا کہ جو مشنری مرد اورعورتیں وہاں تفریح کے لئے آئے تھے وہ روحانی تازگی پاکر واپس گئے۔ اُنہوں نے خدا کا شکر کیا کہ اُنہیں میاں صاحب کی معرفت دوبارہ خدا کی نزدیکی حاصل ہوئی ہے۔ اُنہوں نے ازسرِنَو اپنی زندگی خدا کے سپرد کر دی تاکہ وہ اُنہیں استعمال کرے۔

غیرمسیحیوں سے مناظرے

احسان اللہ نے جنوری اورفروری 1908ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے قصبے میں ہندوؤں مسلمانوں کے درمیان ایک ایسے زبردست پیمانے پر تبلیغِ انجیل کی خدمت کی کہ وہاں کے باشندے نہایت متاثّر ہوکر انجیل جلیل کا مطالعہ کرنے لگے۔ چاروں طرف ایک شور سا مچ گیا۔ اُن کے سرکردہ لیڈروں نے

اپنے مولویوں اور پنڈتوں کو بُلایا تاکہ میاں صاحب سے مناظرہ کریں۔ میاں صاحب اکیلے سب کے ساتھ مناظرہ کرتے رہے۔ جلسے گاہ میں اِتنے لوگ مباحثہ سُننے کے لئے آتے کہ جگہ نہ رہتی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو اور مسلمان مناظروں نے علانیہ اقرار کیا کہ جہاں وہ ہٹ دھرمی سے کام لیتے تھے وہاں میاں صاحب خدا لگتی کہتے تھے اور راستی کے ساتھ ہر بات کرتے تھے۔ میاں صاحب نے پہلے ہی دن اُن سے کہہ دیا تھا کہ اِس مباحثے اور مناظرے کی اصل غرض حق کی تلاش ہے۔ اگر اُن کا مقصد محض فتح اور شکست ہے تو

> بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است
> آؤ، ہم سپر پھینک دیں اگر جنگ ہے۔

اِس بات کا اثر تمام باشندوں پر ہوا، اور وہ انجیل کے مطالعے کے لئے میاں صاحب کے پاس آنے لگے۔ ایک مولوی نے

جو ٹوبہ میں رہتا تھا اُنہیں کہا کہ آپ دُعا کریں کہ مَیں راہِ حق پر چلنے کی توفیق پاؤں۔

اِن مباحثوں کو سُننے کے لئے نہ صرف ہندو اور مسلمان باشندے بلکہ ارد گرد کے دیہات کے عیسائی بھی آئے۔ نتیجے میں اُن کے ایمان کو بڑی تقویّت حاصل ہوئی۔ اُنہوں نے اپنے گاؤں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دلیری سے خداوند کی نجات کا پیغام سُنانا شروع کر دیا۔ جب دیہات کے مولوی اور پنڈت اُن سے مسیحی ایمان کی نسبت سوال کرتے تو وہ ٹوبہ آ کر میاں صاحب سے اُن کے جوابات پوچھ کر معترضین کو جا کر جواب دیتے اور اُن کی تسلّی کرتے۔ اِس طرح اُن کا ایمان حد سے زیادہ مضبوط ہو جاتا تھا۔ نتیجے میں جھنگ بار کے علاقے کی جماعتیں ایمان میں ترقی کرتی گئیں۔

جھنگ کے چرچ مشن کے علاقے کے مُبلّغین اور اُستاد اِن مناظروں سے بہت متاثّر ہوئے۔ اُنہوں نے واپس اپنے

اپنے علاقوں میں جا کر تبلیغی مہمّیں شروع کر دیں اور تبلیغی جوش سے معمور ہو کر ہر وقت غیر مسیحیوں کو انجیل کی نجات کا پیغام سُنانے لگے۔

اُس سال جب وہ مئی میں سمر سکول کے لئے آئے تو میاں صاحب کے چھوٹے بھائی شیخ رحمت اللہ بھی وہاں موجود تھے تاکہ وہ اپنے بھائی کے قدموں میں بیٹھ کر کلامِ پاک کے رموز و نکات پائیں۔ شیخ صاحب کی موجودگی نے اُن مُبلّغوں اور اُستادوں کے تبلیغی ولولوں کو اَور بھی تیز کر دیا۔ سب بازاری منادی بڑے ذوق و شوق سے کرتے رہتے تھے۔

ٹوبہ کے مناظروں اور مُبلّغین کے جوش کی دھوم دُور دُور تک پھیل گئی۔ نتیجتاً کلارک آباد کے مسیحیوں نے ستمبر میں احسان اللہ کو اور لاہور کے طالب الدین صاحب کو دعوت دی کہ وہ آ کر جماعت میں ویسے ہی کریں تاکہ اُس گاؤں کی جماعت اپنی ذمے داری کو محسوس کرے۔ اِن جلسوں کا

انتظام بڑے اہتمام سے کیا گیا۔ اُس کی کامیابی کے لئے ہر طرف دُعائیں کی گئیں۔ نتیجے میں نہ صرف کلارک آباد خورد اور کلارک آباد کے عیسائی بلکہ اردگرد کے دیہات اور چونیاں، پتّوکی سے بھی ایمان داروں نے اِن جلسوں میں شرکت کی۔

احسان اللہ کی ہنگامہ انگیز تقریروں اور طالب الدین صاحب کے قیامت خیز وعظوں نے کلارک آباد کے مسیحی گاؤں کی فضا کو پورے طور پر بدل دیا۔ یہ گاؤں ہمیشہ پارٹیوں اور تفرقوں کا گھر بنا رہا ہے جہاں ہر شخص اِسی خیال میں مبتلا رہا کہ ہمارے برابر کوئی نہیں۔ احسان اللہ نے کُلُسّیوں 3:12–17 پر ایسی زبردست تقریریں کیں کہ گاؤں کے چھوٹے بڑے سب کانپ اُٹھے اور بے خودی میں خود فراموش ہو گئے۔ میاں صاحب کے دلی جذبات کی گرمی اور گداز نے دلوں کی سختی پگھلا دی۔ اُن کے وعظوں کے زندگی بخش تاثّرات نے جماعت کی مُردہ روحانی زندگی میں جان

ڈال دی۔ ہر طرف سے لوگ اپنے گناہوں سے نادم اور پشیمان ہو کر بے ساختہ اُن کا اقرار کرنے لگے اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگے۔ جو گناہ اُنہوں نے پڑوسیوں کے خلاف دُشمنی اور کینہ وری سے کیئے تھے اُن کا علانیہ اقرار کر کے ایک دوسرے سے اور خدا سے مُعافی مانگی۔

جھنگ میں طلبا کے پریکٹیکل

لاہور کے سینٹ جانز کالج کے طلبا ہر سال دو تین ماہ کے لئے احسان اللہ کے پاس جھنگ بار کے علاقے میں بھیجے جاتے تاکہ وہ اُن کی تعلیم اور تربیّت کریں اور اُنہیں سکھائیں کہ قصبوں اور گاؤں کی جماعتوں میں کس طرح کام کریں۔ ساتھ ساتھ وہ اُنہیں انجیل جلیل کے پیغام کے پھیلاؤ کے صحیح طریقے بتائیں۔ یہ طلبا نہایت ذوق و شوق سے اِس انتظار میں رہتے کہ کب وہ وقت آئے جب وہ میاں صاحب سے

ملیں اور اُن کی تعلیم و تربیّت سے مستفیض ہوں۔ کالج کے پرنسپل وگرم صاحب احسان اللّٰد کے بڑے مداح تھے اور ہمیشہ مجھے کہا کرتے تھے کہ تم بڑے خوش قسمت ہو کہ جماعت کے ایک زبردست ستون کے بھتیجے ہو۔ وہ نہایت اخلاق کے ساتھ مجھے ملتے اور مجھے دیکھ کر ہمیشہ خوش ہوتے۔

مَیں 1900ء سے 1910ء تک سینٹ جانز ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اُن سالوں میں سادھو سُندر سنگھ بھی علمِ الٰہیات کی تحصیل کے لئے وہاں آئے ہوئے تھے اور طلبا کے ساتھ احسان اللّٰد کے پاس گئے۔ جب واپس آئے تو اُنہوں نے مجھے کہا، "آپ کے تایا صاحب سے مَیں نے روحانی برکات پانے کے عالاوہ فقیرانہ زندگی کے حقیقی مطالب و مقاصد سیکھے ہیں۔ اُن کے ساتھ رہنے سے مجھ پر

> او درمن و من در او اُفتادہ
>
> وہ مجھ میں اور مَیں اُس میں گِرا پڑا ہوں۔

کا رازکُھل گیا ہے، اور اب مَیں بہتر طور پر پولس رسول کے الفاظ سمجھ سکتا ہوں کہ

> یوں مَیں خود زندہ نہ رہا بلکہ مسیح مجھ میں زندہ ہے
>
> (گلتیوں 20:2)

> او درمن ومن در وے چون بُو بہ گلاب اندر
>
> وہ مجھ میں اور مَیں اُس میں، کیونکہ خوش بو گلاب کے اندر ہے

اُنہوں نے مجھے اپنے تجربے سے مستفیض کیا اور مجھے تصوّف اورمعرفت کے لباس میں ملبوس کیا۔ خدا کرے کہ مَیں یہ سبق عُمر بھر نہ بھولوں۔ اُن کے رموز اشارے نہیں بلکہ شرارے تھے۔"

میاں صاحب اِن طلبا کے ساتھ خود ہر جگہ جاتے۔ دن کو وہ بازاروں اور نُکڑ کی جگہوں میں غیر مسیحیوں کو انجیل کی بشارت دینے کے طریقے بتا کر خود منادی کرتے اور اُن سے بھی منادی کرنے کو کہتے۔ دن بھر وہ مختلف گاؤں میں اُنہیں

پیدل لے کر جاتے اور راہ میں اُن سے خداوند مسیح کے اور پولس رسول کے طریقِ عمل پر گُفتگو اور تبادلۂ خیالات کرتے۔ رات کو وہ میجک لالٹین کے ذریعے کتابِ مقدّس کی کہانیوں پر اُنہیں بولنے کو کہتے تھے۔

جب یہ طلبا واپس آتے تو جماعت کی خدمت اور انجیل کی تبلیغ کے جوش میں بھرے واپس آتے اور اپنی زندگیوں کو از سرِ نَو خداوند کی خدمت کے لئے مخصوص کر دیتے تھے۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے، "آپ کے تایا صاحب تو ہزاروں میں ایک ہیں۔ ہم نے بہتیرے خادموں کو دیکھا ہے، لیکن وہ لاثانی شخص ہیں۔ وہ میلوں ہمارے ساتھ پیدل چلتے ہیں۔ ہم جوان ہیں، لیکن اُن کی طرح ہم میں سے کوئی تیز نہیں چل سکتا۔ وہ لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔ تھکاوٹ کو تو وہ جانتے ہی نہیں، اور اُن کا جوش اب جوانی پر آ رہا ہے اور ہمارے جوش کو شرمندہ کرتا ہے۔ اُن کی نوائے شُعلہ اثر ہمارے دلوں میں آگ لا دیتی ہے۔ وہ صاحبِ رائے اور صائب

الرائے[a] ہیں۔ ایسے مشوروں سے ہم کو مستفید کرتے رہے ہیں جو کبھی کوئی دوسرا خادم نہیں دیتا اور نہ دے سکتا ہے۔"

اِن طلبا کا اُن کے لئے وہی مقام تھا جو پولس رسول کے نزدیک تیمُتھیُس کا تھا۔ اُن کی ہمیشہ یہی کوشش تھی کہ اِن طلبا کے دلوں میں روحوں کی تڑپ پیدا ہو جائے۔ میاں صاحب اپنے کلام سے اور اپنے کام کے نمونے سے یہ تڑپ اُن کے دلوں میں پیدا کر دیتے تھے۔ وہ اُنہیں کہا کرتے تھے، "تم ڈیکن کے عُہدے کے لئے تیاری کرتے ہو، لیکن اُس وقت کا انتظار نہ کرو جب بِشپ تم پر ہاتھ رکھے گا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ وقت کبھی آئے ہی نہ۔ تم ابھی سے مسیح کا ہاتھ اپنے سر پر رکھوا لو اور اب سے ہی آدمیوں کا شکار کرو، لوگوں کو اُن کے نجات دہندہ کے پاس لے آؤ۔"

وہ کہتے تھے، "مسائل دین سے یا رسولوں اور نیکایاہ کے عقیدوں سے وابستگی نہ رکھو بلکہ مسیح سے۔" وہ یہ حقیقت اُن

---

[a] جن کی رائے دُرست ہو

کے ذہن نشین کرتے تھے کہ مختلف عیسائی فرقوں میں مختلف قسم کی سچائیاں محفوظ ہیں جن کو اُنہوں نے ضابطوں اور پنجروں میں جکڑ رکھا ہے۔ یہ مغرب کے فرقے والے ہم کو بھی اِن ہی پنجروں میں قید رکھنا چاہتے ہیں، لیکن لازم ہے کہ ہندوستانی جماعتیں اپنے اپنے پنجروں سے نکل کر اُن صداقتوں کو بھی دیکھیں جو دیگر فرقوں میں موجود ہیں اور انجیل کے نور سے منوّر ہیں۔ جب تم اپنی جماعتوں میں جاؤ تو پولس رسول کی طرح عیسیٰ مسیح اور مسیحِ مصلوب کے سوا اَور کچھ نہ جانو۔" قبلہ واعظ دُرست لکھتے ہیں،

احسان اللہ اِس قسم کے خادم نہ تھے جس طرح آج کل خادم بن جاتے ہیں۔ اِس پاک خدمت کے واسطے وہ اپنی ماں کے پیٹ ہی سے چُنے ہوئے تھے۔[a] مسیح کے اِس جان نثار خادم کی زندگی اگر معجزہ نہیں تو کیا ہے؟"

---

[a] دیکھئے گلتیوں 15:1

14

اپنی مدد آپ کی تحریک

1896ء میں احسان اللہ نے اپنی مدد آپ کی تحریک کی نیو ڈالی۔ نتیجے میں گنڈا مل، ملو چند اور لبھّو مل نے غیرممالک کے روپئے سے دست بردار ہو کر یو۔پی مشن کی جماعتوں میں خدمت شروع کی اور جماعتوں نے اپنی دہ یکی اور دیگر طریقوں سے اُن کے اور جماعت کے اخراجات کی ذمّے داری اپنے اوپر لے لی۔ اُس وقت اُن میں سے کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا کہ ابلیس اپنی مدد آپ کا طریقہ اپنے مقاصد کے لئے کبھی استعمال کر سکے گا۔ لیکن جوں جوں

یہ نیک تحریک زور پکڑتی گئی شیطان نے بھی اپنا زور مارنا شروع کر دیا۔ ہوتے ہوتے ایسے نااہل لوگوں کو خادم کے عُہدے پر مامور کیا گیا جو مسیح اور اُس کی انجیل کی خدمت کے لائق نہ تھے۔ یہ نام نہاد لالچی خادم کہنے کو تو اپنی مدد آپ کے پاسبان ہو گئے، لیکن اُنہوں نے اپنی آمدنی پر جو جماعت سے اُنہیں ملتی تھی قناعت نہ کی۔ وہ خداوند کے احکام بھول گئے کہ

> اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے پریشان نہ رہو کہ ہائے، مَیں کیا کھاؤں اور کیا پیوں۔ اور جسم کے لئے فکرمند نہ رہو کہ ہائے، مَیں کیا پہنوں۔ کیا زندگی کھانے پینے سے اہم نہیں ہے؟ اور کیا جسم پوشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا؟... تمہارے آسمانی باپ کو پہلے سے معلوم ہے کہ تم کو اِن تمام چیزوں کی ضرورت ہے۔ پہلے اللہ کی بادشاہی اور اُس کی راست بازی کی

> تلاش میں رہو۔ پھر یہ تمام چیزیں بھی تم کو مل جائیں گی۔
>
> (متی 6:25، 32–33)

یہ وہ خادم تھے جن پر پولس رسول کے الفاظ صادق آتے تھے کہ

> ایسے لوگ ہمارے خداوند مسیح کی خدمت نہیں کر رہے بلکہ اپنے پیٹ کی۔ وہ اپنی میٹھی اور چکنی چپڑی باتوں سے سادہ لوح لوگوں کے دلوں کو دھوکا دیتے ہیں۔
>
> (رومیوں 18:16)

جھنگ بار کے علاقے میں احسان اللہ کو خود ایسے لوگوں کے ساتھ واسطہ پڑا تھا جنہوں نے دو فرقے کھڑے کر دیئے تھے۔ ایک کا نام "یسوع کی فوج" اور دوسرے کا نام "یسوع کی ہندوستانی فوج" تھا۔ اِن فرقوں کے بانی چُوہڑوں کو دھڑا دھڑ بپتسمے دیئے جاتے تھے تاکہ اُن سے روپیہ بٹورا جائے۔ اُنہوں نے خداوند مسیح کے نام کی آڑ میں اللہ کے

گھر یعنی مسیح کے بدن کو "ڈاکوؤں کا اڈّا" بنا رکھا تھا۔ اُنہیں اپنے حلوے مانڈے اور عیش و عشرت سے کام تھا۔

احسان اللّٰہ یہ دیکھتے تھے اور کُڑھتے تھے۔ جہاں موقع ہوتا وہ ایسے نام نہاد خادموں کے ناشائستہ بدکرداریوں کے خلاف جہاد کی آواز بُلند کرتے تھے۔ لیکن وہ دیکھتے تھے کہ یہ بُرائیاں بڑھتی جاتی ہیں اور خود خدا سے اُن لوگوں کے لئے دُعاگو رہتے تھے تاکہ پنجاب کی جماعت ایسے لوگوں کے چنگُل سے رہائی پائے۔

اُن ایّام میں ایک کتاب چھپ گئی جس کا عنوان تھا، "مشنری طرزِ عمل: پولس رسول کا اور ہمارا۔"[a] اِس کتاب میں پولس رسول کے خطوط کی روشنی میں بشارتی کام کے مُختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ مشن کے مالی پہلو پر جو بحث کی گئی ہے وہ نرالی ہے۔ احسان اللّٰہ کی یہ عادت تھی کہ وہ نئی کتابوں کو پڑھ کر نئے خیالات سے فائدہ اُٹھایا کرتے

R. Allen, *Missionary Methods: St. Paul's and Ours*[a]

تھے۔ جب یہ کتاب اُن کے ہاتھ میں آئی تو یہ حقیقت اُن کے ذہن نشین ہوگئی کہ پولس رسول کسی شہر یا قصبے کی جماعت کی مالی امداد سے اپنا پیٹ نہیں پالتے تھے بلکہ وہ خیمہ سلائی کرکے اپنا گُزارہ کرتے تھے۔ اُن کے ساتھی بھی اِسی طرح خداوند کی خدمت آزادانہ مُفت کرتے تھے۔ اِس بات نے اُن کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا، کیونکہ وہ اپنی روز مرّہ کی زندگی میں دیکھتے تھے کہ گاؤں کے مسلمانوں کے امام عموماً جولاہے، بڑھئی، لوہار، درزی وغیرہ ہوتے تھے جو اپنی مزدوری خود کما کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے اور ساتھ ہی دینی امور میں مسلمانوں کے امام اور استاد تھے۔ اُنہیں یقین آیا کہ عیسائی جماعتوں میں یہ بات قابلِ عمل ہو سکتی ہے۔

اپنے دستور کے مطابق اُنہوں نے اِس طرزِ عمل کا ہر چھوٹے بڑے کے سامنے ذکر کرنا شروع کر دیا تاکہ پنجاب کی جماعت پولس رسول کے خیالات کے مطابق غیر ممالک کے روپوں سے

آزاد ہو جائے اور اپنے بندھنوں سے چھُوٹ کر رہائی پائے۔ اُنہوں نے منٹگُمری والہ اورعیسیٰ نگری کے عیسائی گاؤں کے لیڈروں، اپنے مبلّغوں اور اُستادوں اور اپنے ماتحت خادموں کو اِس حقیقت سے روشناس کرایا۔

جب مشن ڈسٹرکٹ کونسل اورسنٹرل مشن کونسل کے اجلاس ہوئے تو اُنہوں نے اُن میں اِس موضوع پر تقریریں کیں۔ اپنی جماعت کے خادموں کے علاوہ اُنہوں نے دیگر فرقوں کے خادموں سے بھی کہا کہ پولس رسول کے طرزِ عمل کو پنجاب کی جماعت میں اختیار کرکے تجربہ کرنا چاہیۓ۔ وزیر چند لکھتے ہیں،

میری پہلی مُلاقات احسان اللہ سے 1896ء میں ہوئی جب مَیں سکول میں پڑھتا تھا۔ اُنہوں نے پنجاب کی جماعتوں میں روحانی بیداری کی لہر جاری کر دی۔ وہ جدھر جاتے مسیحی جماعتوں میں ایک نئی روح پھونک دیتے تھے۔ روح القدس بڑی قُدرت سے اُن میں اور اُن کے وسیلے کام کر رہا تھا۔ ہم

جو طالب علم تھے بڑے شوق سے اُن کے قدموں میں بیٹھ کر خدا کا کلام سُنا کرتے تھے جس سے میری عُمر کے ابتدائی مراحل پر بہت اثر پڑا۔

جب مَیں لائل پور (فیصل آباد) میں تھا تو میری اور اُن کی مُلاقات کسی ریلوے سٹیشن پر ہوگئی۔ اُنہوں نے مجھے رولینڈ ایلن کی کتاب دکھا کر فرمایا کہ اِسے ضرور پڑھو۔ یہ وہ کتاب تھی جس نے مشنری حلقوں میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مجھ پر اِس اتفاقیہ مُلاقات کا عجیب اثر ہوا، اور مجھے یہ سوچ کر اپنی زندگی پر شرم آئی کہ یہ خادم مُعمّر ہونے کے باوجود بشارتی خدمت کا عاشق اور جماعت کی فلاح و بہبود کا کیسا دلدادہ ہے۔ وہ پنجاب کی جماعت کے اُن ابتدائی معماروں میں سے تھے جنہوں نے پنجاب میں جماعت کی بنیاد پر پہلے ردّے رکھے۔ اِس گُلشنِ جماعت میں بعض شجر جو اب بارونق ہیں وہ اُن ہی کے ہاتھوں نے لگائے ہوئے ہیں۔ جب کبھی پنجاب کی جماعت کے بکھرے ہوئے اوراق جمع کئے جائیں گے تو بزرگ احسان اللہ کی کہانی جلّی قلم سے لکھی جائے گی۔

غرض، احسان اللہ ہر چھوٹے بڑے سے پولس رسول کے طرزِ عمل پر بات کرکے اُنہیں یہ مشورہ دیتے کہ بے شک جماعت میں بعض ایسے قابل خادموں کی ضرورت ہے جو اپنا تمام وقت انجیل کی خدمت میں صَرف کرکے جماعت سے اپنا گُزارہ لیں۔ لیکن پنجاب کے گاؤں اور قصبوں میں پولس رسول کے طرزِ عمل کا تجربہ ضرور کرنا چاہیئے تاکہ جماعت جلد از جلد آزاد ہوکر مغرب کے روپوں سے بے نیاز ہو جائے۔ میاں صاحب پنجاب کی جماعت کو کہتے تھے،

> بال بکشاد صغیر از شجرِ طوبیٰ زن
> حیف باشد چوتو مُرغے کہ اسیرِ قفسی!
> اے چھوٹے، اپنے پر پھیلا کر طوبیٰ نامی درخت سے چل۔
> افسوس اے مُرغ، کیونکہ تُو پنجرے کا اسیر ہے۔

وہ لیڈروں کو نصیحت کرکے کہتے تھے کہ مصیبت اور بے حالی کے تمام بندھن توڑ دو تاکہ مُرغِ ہمّت عقاب کی طرح

فضائے آسمانی کی لامتناہی میں اُڑے۔ اگر پولس رسول کے طرزِ عمل پر چلو گے تو بے طاقتی توانائی میں، غفلت بیداری میں، بے پر و بالی بُلند پروازی میں اور موت زندگی میں پلک جھپکتے بدل جائے گی۔ اگر جماعت مغرب کے قفس سے آزاد ہو کر بُلند پرواز نہ ہوئی تو اُس کے بال و پر کا سارا سامان بے کار ہے۔ لیکن جماعت کے عاقبت نااندیش لیڈر مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کر کے کہتے تھے،

> غنیمت ہے قفس، فکرِ رہائی کیا کریں ہم دم
> نہیں معلوم اب کیسی ہَوا چلنی ہے گُلشن میں!

نتیجے میں ہندوستان میں انقلاب ہر طرف ہو گیا اور ملک مغرب کے ہاتھوں سے آزاد ہو گیا ہے، لیکن جماعت میں اثر پذیری کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ اُس کے بال و پر گرے ہوئے ہیں جن میں زندگی کی کوئی تڑپ نظر نہیں آتی۔ اُس کا جسم بے طاقتی کے مارے کھڑا نہیں ہوتا۔ اُس کے چاروں

طرف زندگی اور حرکت کا ہنگامہ برپا ہے اور ہر جانب بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن جماعت کا دل ایسا ٹھنڈا پڑا ہے کہ باہر کی گرم جوشی بھی اُسے گرم نہیں کر سکتی۔ مغرب کی فرقہ بندیوں کا اثر زوروں پر ہے۔

حجی نبی کا کلام جماعت پر صادق آتا ہے،

> تم نے بہت بیج بویا لیکن کم فصل کاٹی ہے۔ تم کھانا تو کھاتے ہو لیکن بھوکے رہتے ہو، پانی تو پیتے ہو لیکن پیاسے رہتے ہو، کپڑے تو پہنتے ہو لیکن سردی لگتی ہے۔ اور جب کوئی پیسے کما کر اُنہیں اپنے بٹوے میں ڈالتا ہے تو اُس میں سوراخ ہیں۔ رب الافواج فرماتا ہے، "اپنے حال پر دھیان دے کر اُس کا صحیح نتیجہ نکالو!" (حجی 1:6–7)

سود اور نقصان کی اِس محفل میں کام یابی کا جام کبھی عاقبت نااندیشوں اور کوتاہ دستوں کے لئے نہیں بھرا گیا۔

15
آرچ ڈیکن آف دہلی

آرچ ڈیکن کا عُہدہ

جب بشپ لیفرائے لاہور کے بشپ ہوئے تو اُنہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستانی جماعتوں کے لئے ایک آرچ ڈیکن ہو۔ یہ آرچ ڈیکن انگریز نہ ہو بلکہ ہندوستانی ہو۔ اِس عُہدے کے لئے اُنہوں نے احسان اللہ کا نام پیش کیا۔ یہ سُن کر سرکاری حلقوں میں کھلبلی مچ گئی اور مشنری گھبرا اُٹھے کہ ایک دیسی، اور وہ بھی احسان اللہ جیسا شخص اُن پر آرچ

ڈیکن مقرّر ہو۔ اُنھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ بشپ صاحب کسی انگریز مشنری کو آرچ ڈیکن ہونے کے لئے پیش کریں۔ لیکن اُن کی ایک نہ چلی۔ احسان اللہ کو اِس عُہدے پر پانچ سال کے لئے مقرر کیا گیا۔ اُنہیں 1911ء میں دہلی کا اولین آرچ ڈیکن بنایا گیا۔ اُن کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ وہ ہندوستانی جماعتوں کی روحانی زندگی کی نگاہ داشت کریں۔ مشن سکولوں میں انجیل کی تعلیم کا خاص خیال رکھیں۔ ہندوستانی جماعتوں کے ضبط کا کام اُن کے ہاتھوں میں دے دیا گیا۔ اور جو مسیحی دُور و دراز مقامات میں اکیلی جگہوں میں رہتے تھے وہ اُن کی نگرانی میں کر دیئے گئے۔

جس روز اُنہیں اِس عُہدے پر متمکن کیا گیا اُنھوں نے لاہور کے کتھیڈرل میں انگریزی زبان میں وعظ کیا۔ اُن کی سند کی آیت یہ تھی،

> ابنِ آدم بھی اِس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ اِس لئے کہ خدمت کرے اور اپنی جان فدیہ کے طور پر دے کر بہتوں کو چھڑائے۔ (متی 28:20)

اُنہوں نے دورانِ وعظ یوحنا 13:1-20 کو اور فلپّیوں 7:2 وغیرہ مقامات کو اِس طور سے پیش کیا کہ تمام کتھیڈرل کی جماعت پر بے خودی طاری ہوگئی۔ اُن کے الفاظ کا انتخاب اور تراش خراش، اُن کا اندازِ بیان، اُن کے کلام کی بے ساختگی اور جوش نے تمام جماعت کو یک سر محو و مدہوش کر دیا۔ اُن کی نوائے شُعلہ اثر نے کتھیڈرل میں محشر برپا کر دیا۔ اُن کے لفظ کیا تھے، چلتی ہوئی شمشیریں تھیں جو لوگوں کے سینوں اور دلوں کو بے اختیار زخمی کرتی گئیں۔ اِس بڑے کتھیڈرل کی تاریخ میں پہلی دفعہ آہ و بکا اور گریہ و زاری کی آوازیں وعظ کے دوران بُلند ہوئیں۔ بشپ لیفرائے نے لکھا،

> آرچ ڈیکن نے آج اپنا وعظ کتھیڈرل میں شام کی عبادت میں کیا۔ اُن کا وعظ نہایت پُرجوش تھا۔ جماعت کے لوگ متاثّر

بلکہ مسحور ہو گئے۔ ایک خاتون نے رونا شروع کر دیا، اور لفٹننٹ گورنر کا دل بھی دہل اُٹھا۔

دہلی کے آرچ ڈیکن ہونے کی حیثیّت سے احسان اللہ نے لاہور کے اسقفی علاقے کی اُن تمام جماعتوں کا دَورہ کیا جو پنجاب، صوبۂ سرحد، سندھ، بلوچستان، صوبۂ دہلی اور "دیسی ریاستوں" میں قائم تھیں۔ اُن کا صدر مقام ٹوبہ ٹیک سنگھ تھا جہاں سے وہ متعدّد دفعہ اُن جماعتوں میں گئے۔ اپنے خصوصی وعظوں سے اُنہوں نے تمام اسقفی علاقے کو نہ صرف بیدار کر دیا بلکہ جماعتوں میں نئی زندگی پھونک دی۔

چرچ مشن کے کچھ انگریز مشنری حسد کے مارے اُن سے جلتے تھے، لیکن وہ اُن کی باتوں کی رتّی بھر پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک مشنری نے تو یہاں تک جرُأت کی کہ عبادت گاہ میں عبادت سے پہلے داخل ہونے کے وقت اُن کے پیچھے کھڑا ہو گیا گویا وہ عُہدے میں آرچ ڈیکن سے بڑا ہے۔ اُنہوں نے اُسے اپنے آگے چلنے کا اشارہ کیا جس سے اُسے بڑی

خفّت حاصل ہوئی۔ امرتسر کے مشنریوں نے یہ اُڑا دیا کہ وہ انگریزی میں وعظ نہیں کر سکتے حالانکہ یہ ایک سفید جھوٹ تھا، کیونکہ وہ انگریزی زبان میں قادر الکلام تھے اور نہ صرف انگلینڈ، امریکہ اور کینیڈا کے ممالک میں وعظ کرتے رہے تھے بلکہ ہر انگریزی عبادت گاہ کی جماعت میں اُن کی زبان میں وعظ کر کے اُن کے دلوں کو ہلا دیا کرتے تھے۔

جب وہ آرچ ڈیکن کے عُہدے پر مُمتاز تھے تو پہلی عالم گیر جنگ چھڑ گئی۔

ہندوستان کے برطانوی حکمران ہر جائز و ناجائز طریقے سے بھرتی کرتے چلے جاتے تھے۔ کچھ انگریز مشنری منبر پر سے لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے کی نصیحت کرتے تھے بلکہ چند مشنری تو انجیل جلیل کے پرچار کا کام بھی چھوڑ کر تمام وقت لوگوں کو بھرتی کرنے میں صَرف کرتے تھے۔

اُن ایّام میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے میاں صاحب کو بُلا کر کہا کہ آپ کے ذمے مَیں نے ایک ہزار لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنے کا کام کیا ہے۔

اُنہوں نے اُسے جواب دیا، "جناب، زمین کے بادشاہوں کے لئے بھرتی کرنا میرا کام نہیں ہے۔ مَیں بادشاہوں کے بادشاہ کے لئے بھرتی کرنے پر مامور ہوں۔ خداوند مسیح نے فرمایا ہے کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرو۔ جنگ کرنا کسی عیسائی کا کام نہیں ہے۔" یہ ٹکا سا جواب سُن کر لفٹنٹ گورنر اپنا سا مُنہ لے رہ گیا۔

میاں صاحب روسی مصنّف ٹالسٹائے کے بڑے مدّاح تھے، کیونکہ وہ کہتا تھا کہ خداوند کے پہاڑی وعظ کے احکام پر چلنا ہر انفرادی، مِلّی اور قومی زندگی کے لئے لازم ہے۔ میاں صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ گاندھی جی گو ہندو ہیں، لیکن اُنہوں نے ٹالسٹائے سے پہاڑی وعظ کے احکام پر عمل کرنا سیکھا ہے، اور وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے خداوند کے زرّیں

اصولوں کا قومی زندگی پر اطلاق کیا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ انگریز بغیر خون خرابے کے ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں گے اور ہندوستان کی غلام جماعتیں مصائب میں مُبتلا ہو جائیں گی۔

لکھنؤ کی کانفرنس (1911ء)

1911ء میں میاں صاحب لکھنؤ کی اُس کانفرنس میں شریک ہوئے جس میں غیر ممالک کی وہ چیدہ ہستیاں آئیں جو اہلِ اسلام میں مدّت العُمر کام کرتی رہی تھیں۔ ڈاکٹر سموایل زویمر اُس کانفرنس کے صدر تھے۔ تمام ایشیا اور افریقہ کے نُمائندے وہاں اِس غرض سے جمع ہوئے کہ ایک دوسرے کے طریقوں سے واقف ہوں جو اہلِ اسلام میں تبلیغی خدمت کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ نمائندے مدّت سے میاں صاحب کو دیکھنے کے خواہش مند تھے، کیونکہ اُن کا نام چرچ

مشن پنجاب اور لندن، امریکہ اور کینیڈا کے اخباروں کے ذریعے اُن ممالک میں پہنچ چکا تھا۔

یہ کانفرنس لکھنؤ میں ایک ہفتے تک[a] ہوتی رہی۔ میاں صاحب نے اِس میں نُمایاں حصّہ لیا اور مُسلمانوں میں انجیل جلیل پھیلانے کے لئے بعض نہایت مفید مشورے دیئے۔ اگر اُس کانفرنس کی روداد پر غور کیا جاتا اور ہندوستان میں اُس کی قراردادوں پر عمل کیا جاتا تو اب تک ہزاروں مسلمان خداوند مسیح کے فرماں بردار ہو گئے ہوتے۔ لیکن یہاں اب ایسے مشنری آ گئے تھے جنہوں نے اپنی تمام توجّہ اُس کام میں لگا دی تھی جو اچھوت ذاتوں میں ہو رہا تھا۔ اُنہوں نے تعلیم یافتہ طبقوں کی طرف سے بے پروائی اختیار کر لی تھی، کیونکہ اُن میں تبلیغی کام کرنے کے لئے عربی، فارسی، قرآن و حدیث و فِقہ کے علم کی ضرورت تھی، اور اُن بے چاروں میں نہ لیاقت و قابلیّت تھی اور نہ صبر تھا۔ وہ فوری نتائج چاہتے تھے۔

---

[a] از 23 جنوری تا 28 جنوری

مجھے یاد ہے کہ اُن دنوں میں ایک مشنری سے یہ سُن کر کہ اُس نے کبھی قرآن نہیں پڑھا مَیں نے اُسے قرآن کا انگریزی ترجمہ پڑھنے کو دیا۔ یہ کتاب چھ ماہ تک اُن کی الماری کے اوپر پڑی رہی حتّٰی کہ اُس پر گرد جم گئی۔ اُس مشنری کا رویّہ دیکھ کر کتاب اُٹھا لایا۔ اب مسلمانوں میں کام کرنے کا احساس مسیح کی جماعت میں اِس قدر مدھم اور دُھندلا ہو گیا ہے کہ اِس کو ازسرِنَو اُجاگر کرنے میں کئی سال درکار ہوں گے۔ خدا کرے کہ یہ احساس جلدی پنپنے پائے۔

> کام تھے بہت، پر میر،
> ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے!

اپنی مدد آپ پر زور

آرچ ڈیکن کے عُہدے کے ایّام میں میاں صاحب ہمیشہ ہندوستانی جماعت کی حاجت مندی کا سوال ستاتا رہا۔ وہ خدا سے دُعا کرتے تھے کہ خدا اُنہیں وہ دن جلد دکھائے جب

ہندوستانی جماعت مغرب کے روپوں سے آزاد ہو کر اِس سونے کے ہار کو اپنے گلے سے اُتار پھینکے اور مغربی جماعتوں کی فرقہ بندی کی تفریق سے آزاد ہو جائے۔ چرچ مشن کی 1912ء رپورٹ میں وہ لکھتے ہیں،

جماعت اُس بچے کی طرح ہے جو ڈیڑھ فُٹ قد کا ہے۔ وہ اپنے پنگورے کو پسند کرتا ہے اور اپنے مغربی سر پرستوں کی دی ہوئی دودھ کی بوتل کو ہر دم مُنہ سے لگائے رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب اُسے بڑا قد پانے کی وجہ سے اپنے محبوب گہوارے کو مجبوراً چھوڑنا پڑتا ہے تو وہ دو بے ساکھیوں کے سہارے کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ جماعت کے دو سہارے پردیسی مبلّغین اور روپیہ ہے جو مغربی ممالک سے آتا ہے۔ وہاں کی سوسائٹیوں نے اِس ملک کی جماعت کو فیّاضی سے زر و مال دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری جماعت کے شرکا نے خداوند کے مبارک قول کو پسِ پُشت پھینک دیا ہے کہ دینا لینے سے زیادہ مبارک ہے۔

اِن ہی ایّام میں شہر لاہور میں ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں امریکہ کے مشہور ڈاکٹر ماٹ[a] آئے ہوئے تھے تاکہ مختلف مشنوں کی باہمی مخالفت کو دُور کرنے کے لئے ایک مجلسِ شوریٰ قائم کریں جس میں تمام مشنوں کے مشنری اور جماعتوں کے سربراہ شامل ہوں اور خدمت ایک دوسرے کے تعاون سے ہو۔ اِس جلسے کے صدر بشپ لیفرائے تھے۔ ڈاکٹر یوئنگ اور ڈاکٹر کے۔سی چیٹر جی جیسی ہستیاں موجود تھیں۔ تمام مشنوں کے سربراہ موجود تھے۔

جب مختلف جماعتوں کی رسوم و رواج کی پابندیوں اور مختلف مشنوں کے ضابطوں کی پیچیدہ قیود کا ذکر آیا تو احسان اللہ نے تقریر کے دوران کہا،

ہندوستانی عیسائیوں کے لئے مختلف غیر ملکی جماعتوں کی پابندیاں اور اُن کے ضابطوں کی پیچیدگیاں بھول بُھلیوں کی مانند حیران اور پریشان کُن ہیں۔ مَیں اِن بھول بُھلیوں میں

Dr. Mott[a]

بپتسمے کے وقت سے لے کر اِس وقت تک پریشان پھرتا رہا ہوں۔ اِن کی تنگ وتار گلیاں مسیح کے نور سے منوّر نہیں ہیں۔ جب تک ہم اِن میں پھرتے رہیں گے ہم کو روشنی نظر نہ آئے گی اور نہ آ سکتی ہے۔ ہم داؤد کی طرح ہیں جس کو ساؤل نے زبردستی اپنی زِرہ بکتر پہنا کر پیتل کا خود اُس کے سر پر رکھ دیا اور اپنی تلوار اُس پر کس دی۔ اِن چیزوں کو پہن کر وہ غریب ایک قدم بھی نہ چل سکا۔ اِسی طرح آپ کے مغربی فرقوں کی زِرہ بکتر اور آپ کے ضابطوں کی خودیں اور تلوار ہمارے کام کی نہیں۔ اُن سے نہ ساؤل جاتی جالوت کو قتل کر سکا اور نہ داؤد۔

مَیں آپ کو خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ یہ تفرقے جو آپ کی قومی تاریخ میں خون کے حرفوں سے لکھے ہیں ہمارے مُلک سے لے جائیں۔ ہم کو نہ اِن کی ضرورت ہے اور نہ یہ ہمارے دیش کی تاریخ کے ساتھ واسطہ رکھتے ہیں۔ ہم دیگر مذاہب سے اِن ہتھیاروں کو باندھ کر جنگ نہیں کر سکتے۔ اُلٹا لوگ ہمیں ٹھٹھا کرتے ہیں اور خداوند کے نام کی تکفیر ہوتی ہے۔

اُنہوں نے ہم کو اُس زِرہ بکتر میں جکڑ دیا ہے جس کو آپ ہمیں اُتارنے بھی نہیں دیتے۔ ہم اِن ہتھیاروں کے بغیر ہی اچھے ہیں۔ داؤد اپنی لاٹھی اور چِکنے پتھروں کو سیدھی سادی جھولی میں ڈال کر جالوت کے مقابلے میں کام یاب ہوا۔ ہم انجیل کا سادہ پیغامِ نجات اور سیدھی تعلیم سے ہندومت اور اسلام پر غالب آ سکتے ہیں جو زندہ خدا کو بدنام کرتے ہیں۔ اِن کو ہم خداوند مسیح کے اسمِ اعظم سے شکستِ فاش دے سکتے ہیں۔ مغرب کے لمبے چوڑے قوانینِ جماعت اور روپئے کی بجائے ہمارے نالے کے پانچ پتھر ہی کافی ہیں۔ آپ رحم کریں اور ہم کو ہمارے حال پر ہی چھوڑ دیں۔

جماعت کی قیود نے خداوند رب الافواج کی فوجوں کو بانٹ رکھا ہے۔ اتفاق کی بجائے یہاں نفاق ہے۔ ہم متحدہ کوشش کیسے کر سکتے ہیں؟ آپ کے ذریعے انگریزی فیشن جماعت میں آ گھسا ہے، اور وہ ایک ایسی بُری روح ہے جو دُعا اور روزے سے ہی نکل سکتی ہے۔ ہم نہ پنجابی رہے اور نہ انگریز بن سکے۔ کوّا ہنس کی چال چلا اور اپنی بھی گنوا بیٹھا۔ ہم اپنے

دیس میں رہتے ہوئے بدیشی بن رہے ہیں۔ نتیجے میں ہم میں
اور ہمارے غیر مسیحی بھائیوں میں جُدائی کی دیوار کھڑی ہوگئی
ہے۔ مسیحی ایمان کو ایک بدیشی مذہب تصوّر کیا جا رہا ہے اور
مشرقی مسیح کو اُس کے اپنے مشرق کے لوگ مغربی مسیح خیال
کر رہے ہیں۔ ہمارے مُلک میں سودیشی کی لہر شروع ہوگئی
ہے۔ اب وقت ہے کہ مغربی مشنوں اور فرقوں کے لیڈر اور
اُن کے حامی اِس حقیقت کو مدِنظر رکھ کر اپنی پالیسی اور طرزِ
عمل کو پورے طور پر تبدیل کر دیں۔ اگر کچھ دیر یہی حال رہا
تو اِن فرقہ بندیوں کی وجہ سے ہمارے مُلک میں مسیحی ایمان کا
مستقبل تاریک ہو جائے گا۔

ہولی ٹرینٹی پر تقرر

1914ء کے آخر میں ہولی ٹرینٹی چرچ لاہور کی جماعت نے
درخواست کی کہ احسان اللہ اُن کے پاسبان ہوں۔ لیکن
میاں صاحب نے کہا کہ اگر مَیں لاہور کی جماعت کا پاسبان

ہوا تو مَیں اپنے عُہدے کے فرائض کو جو خدا نے میرے سپرد کیئے ہیں پورا نہیں کرسکوں گا۔

لوگوں کے اصرار پر اُنہوں نے یہ منظور کرلیا کہ وہ دو سال لاہور میں رہ کر جماعت کی پاسبانی کے لئے کسی شخص کی تربیّت کر دیں۔ 1918ء کے آغاز میں وہ لاہور آئے اور اپنے پرانے ہم وطن دوست دینا ناتھ کے بیٹے کانشی ناتھ کو لاہور کی جماعت کی پاسبانی کے لئے تیار کرتے رہے۔ اُن دنوں میں وہ لاہور کی پاسبانی کے علاوہ جھنگ بار کی نگرانی کرتے تھے اور آرچ ڈیکن کے عُہدے کے فرائض کو بھی سرانجام دیتے تھے حالانکہ اُن کی عُمر ساٹھ سال کے قریب ہو گئی تھی۔

جب وہ لاہور آئے تو اُنہوں نے جماعت میں یہ تحریک شروع کی کہ وہ اپنے اخراجات کی خود ذمے دار ہو۔ کیونکہ یہاں کی جماعت اُن دنوں ایک مال دار جماعت تھی جس کے شرکا اچھے اچھے عُہدوں پر فائز تھے۔ چنانچہ اِس تحریک

کے شروع کئے جانے کے چند ماہ کے اندر اندر یہ جماعت اپنی مدد آپ کی جماعت ہوگئی۔

اُس زمانے میں عبادت گاہ کے سامنے ایک وسیع احاطہ خالی پڑا تھا۔ پاسبان کا مکان کھنڈرات سے بہتر نہ تھا۔ لاہور کا شہر ترقی کرتا جاتا تھا، اور عبادت گاہ کے چاروں طرف دُکانیں اور بنک تھے۔ یہ دیکھ کر احسان اللہ نے یہ تجویز پیش کی کہ احاطے کی سفید زمین پر دُکانات اور عمارات تعمیر کی جائیں اور پاسبان کے لئے ایک گھر بنایا جائے۔ لیکن دِقّت یہ تھی کہ احاطہ اور عبادت گاہ سب لندن کی سوسائٹی کے نام سرکاری کاغذات میں درج تھے۔ لہٰذا قانونی مشورہ لے کر میاں صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک ہولی ٹرینٹی چرچ ٹرسٹ قائم کی جائے جس کے نام عبادت گاہ اور اُس کے ساتھ کی تمام مُلحقہ زمین مُنتقل کی جائے۔ جب سرکاری طور پر انتقال ہو جائے تو اُس خالی زمین پر دُکانیں اور عمارتیں بنائی جائیں جن کے کرائے سے نہ صرف لاہور میں تبلیغی اور

جماعت کا کام چلایا جائے بلکہ اسقفی علاقے کے کام کو بھی مدد دی جائے۔ یوں رفتہ رفتہ پنجاب کی تمام جماعتیں مغربی روپے سے آزاد ہو جائیں۔

لندن کی چرچ مشنری سوسائٹی کے کارکُنوں نے یہ تجویز منظور کر لی۔ میاں صاحب کی تجویز کے مطابق ایک ہولی ٹرینٹی چرچ ٹرسٹ قائم کیا گیا جس کے صدر آرچ ڈیکن تھے۔ اِس ٹرسٹ کے نام عبادت گاہ اور سفید زمین مُنتقل کی گئی۔ اِس قانونی کارروائی کا پورا ہونا ہی تھا کہ ہر طرف سے درخواستیں آنی شروع ہو گئیں کہ دُکانات اور عمارات ہمیں کرائے پر دیئے جائیں۔ چرچ مشن نے بھی فراخ دلی سے کام لے کر اِن دُکانوں اور عمارتوں کے بنانے میں مالی امداد دی۔ سنٹرل بنک آف انڈیا نے چند شرائط کے ماتحت وہاں عمارت بنا لی۔ زر و مال پاسبان کے لئے نیا مکان بن گیا، اور میاں صاحب کی کوششوں کی بدولت ہزاروں روپئے سالانہ کی آمدنی اُس وقف شدہ جائداد سے آنے لگی۔

میاں صاحب کی دلی خواہش تھی کہ اسقفی علاقے کے تمام بڑے شہروں میں لاہور کی طرح وقف قائم ہو جائیں تاکہ اِن اوقاف اورجائدادوں کے ذریعے پنجاب کی ہر جماعت مختلف مغربی مشنوں کے بندھنوں سے آزاد ہوکر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے اورغیر مسیحیوں کو خداوند کے قدموں میں لائے۔ یوں مغرب کی فرقہ بندیوں کی زنجیریں کٹ جائیں گی اور ایک واحد آزاد ہندوستانی جماعت وجود میں آئے گی۔

جب میاں صاحب لاہور کے پاسبان تھے تو وہ لاہور کے مسیحیوں کو ہمیشہ یہی نصیحت کیا کرتے تھے کہ مغرب کی عادات و اطوار سے بچے رہو اورفیشن کے دل دادہ ہونے کے بجائے پنجابی بن کر رہو۔ وہ اکثر اِس مضمون پر وعظ بھی کیا کرتے تھے، کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ جماعت میں روز بروز "انگریزیّت" بڑھتی جاتی ہے اور مسیحی ہر جگہ اِس کا شکار ہو رہے ہیں۔

بعض عیسائی جب اپنے گھروں سے نکلتے تو کوٹ پتلون اور ہیٹ پہن کر سڑکوں پر اپنے بھائی اور باپ سے بات کرنا تو درکنار، اُن کی طرف دیکھنا بھی باعثِ شرم خیال کرتے تھے۔ بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو تھے تو سو فی صدی پنجابی، لیکن اپنے آپ کو اینگلو انڈین کہتے اور اپنے عیسائی بھائیوں کی طرف تکتے بھی نہ تھے۔ یہ باتیں دیکھ کر میاں صاحب کُڑھتے تھے۔ وہ ہر ایسے شخص کو کُھلّم کھلّا ملامت کرنے سے ذرا نہ جھجکتے تھے۔ اُن دنوں میں ریلوے کی گاڑیوں کے بعض ڈبے صرف یورپینوں اوراینگلو انڈین لوگوں کے لئے مخصوص ہوا کرتے تھے۔ جس میں انٹر کلاس اورتھرڈ کلاس کے ٹکٹ والے سفر کیا کرتے تھے۔ اگر کہیں میاں صاحب ہندوستانی عیسائیوں کو اُن ڈبوں میں سفر کرتے پا لیتے تو اُن بے چاروں کی شامت آ جاتی۔ وہ آرچ ڈیکن ہوتے ہوئے اور لاہور جیسے مغرب زدہ شہر میں سکونت کرتے ہوئے بھی

ہمیشہ پنجابی لباس میں ملبوس رہے۔ وہی پگڑی، وہی کھلے پانچوں والے پاجامہ۔ لمبا کوٹ اور پنجابی جوتی پہنتے رہے۔

وہ اکثر جماعتوں کو کہا کرتے تھے، "وقت کو غنیمت جانو، کیونکہ بُرے دن آرہے ہیں۔ ہندوستان میں آزادی کی لہر بے پناہ ہے اور ہمارا ملک سلطنتِ برطانیہ سے آزاد ہو کر رہے گا۔ کچھ تو عاقبت اندیشی سے کام لو۔ زمانے کی رفتار دیکھو اور اپنی چال پر نظر کرو۔ تمام قوم تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ مسیح کی جماعت بہت پیچھے رہ گئی ہے۔"

خداوند مسیح نے سچ فرمایا ہے،

> ریاکارو! تم آسمان وزمین کے حالات پر غور کر کے صحیح نتیجہ نکال لیتے ہو۔ تو پھر تم موجودہ زمانے کے حالات پر غور کر کے صحیح نتیجہ کیوں نہیں نکال سکتے؟ (لوقا 12:56)

ایک دفعہ اُنہوں نے لاہور کی جماعت کو کہا، ”مَیں گاؤں کی جماعتوں کے بعد نبی یرمیاہ کی طرح آپ کے پاس آیا ہوں۔“

> مَیں نے سوچا، ”صرف غریب لوگ ایسے ہیں۔ یہ اِس لئے احمقانہ حرکتیں کر رہے ہیں کہ رب کی راہ اور اپنے خدا کی شریعت سے واقف نہیں ہیں۔ آؤ، مَیں بزرگوں کے پاس جا کر اُن سے بات کرتا ہوں۔ وہ تو ضرور رب کی راہ اور اللہ کی شریعت کو جانتے ہوں گے۔“ لیکن افسوس، سب کے سب نے اپنے جوئے اور رسّے توڑ ڈالے ہیں۔ (یرمیاہ 5:4–5)

> مجھے خدا نے آپ لوگوں کے پاس بھیجا ہے تاکہ وہ میرے وسیلے سے نڈھال ہاتھوں کو تقویت دوں، ڈانواں ڈول گھٹنوں کو مضبوط کروں۔ (یسعیاہ 35:3)

> میرے پیارے بچو! اب مَیں دوبارہ آپ کو جنم دینے کا سا درد محسوس کر رہا ہوں اور اُس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک مسیح آپ میں صورت نہ پکڑے۔ (گلتیوں 19:4)

16
خدمت کے آخری ایّام

کینن کا عہدہ

دسمبر 1916ء کے آخر میں جب آرچ ڈیکن کے عُہدے کی میعاد ختم ہونے والی تھی تو احسان اللہ نے بشپ ڈرنٹ سے جو بشپ لیفرائے کے جانشین تھے کہا، "مَیں سُنتا ہوں کہ بعض لوگوں نے آپ سے درخواست کی ہے کہ اِس میعاد کی توسیع کی جائے۔ لیکن مَیں یہ نہیں چاہتا۔"

جب اُنہوں نے سبب دریافت کیا تو میاں صاحب نے کہا، ”اب میری جسمانی طاقت وہ نہیں رہی جو پانچ سال پہلے تھی، اور یہ میری عادت نہیں کہ مَیں کوئی ذمّے داری اُٹھاؤں جس کو مَیں اچھی طرح نباہ نہیں سکتا۔ گُزشتہ پانچ سال میں مجھے اسقفی علاقے کے ہر شہر اور قصبے کی جماعت میں دَورہ کرنا پڑا ہے۔ دُور اُفتادہ عیسائیوں کی نگرانی کرنی پڑی ہے جو اکیلے کسی کونے میں پڑے تھے۔ جھنگ بار کا علاقہ میرے سپرد رہا ہے اور لاہور کی جماعت کا بھی پاسبان رہا ہوں۔ اِن فرائض کی ادائگی میں مجھے بہت دَوڑ دُھوپ کرنی پڑی ہے۔ اِس بوجھ کو میرا جسم برداشت نہیں کر سکا۔ اِس کے علاوہ ابھی پانچ ماہ ہوئے ہیں میرا چھوٹا بھائی رحمت اللہ فوت ہوگیا ہے جو میرے لئے ایک جان کاہ صدمہ ثابت ہوا ہے۔ میری روح تو مستعد ہے، لیکن جسم کمزور ہوگیا ہے۔“

بشپ صاحب نے کہا، "مَیں نہیں جانتا کہ آپ کی مدد کے بغیر مَیں کس طرح اِس لمبی چوڑی ڈایوسیس کا کام چلا سکوں گا۔ مجھے بشپ ہوئے ابھی تین سال بھی نہیں ہوئے، لیکن مَیں آپ کی بات پر عمل کروں گا۔"

چنانچہ جب میاں صاحب کی پانچ سالہ میعاد ختم ہوئی تو وہ اِس عُہدے سے سبک دوش ہو گئے۔

لیکن چونکہ بشپ نئے تھے اور اُنہیں جماعتوں کا کوئی تجربہ نہ تھا کیونکہ وہ بشپ ہونے سے پہلے مشن کالج آگرہ کے پرنسپل تھے اِس لئے اُنہوں نے میاں صاحب کو لاہور کے کیتھیڈرل کا کینن بنا دیا تاکہ اُن کے دانشمندانہ مشوروں سے اور اُن کے روحانی تجربوں سے خود مستفید ہوسکیں۔ میاں صاحب 1917ء کے شروع سے 1922ء کے آخر تک چھ سال لاہور کیتھیڈرل کے اعزازی کینن رہے اور بشپ کو اسقفی علاقے کی انگریزی اور ہندوستانی جماعتوں کے مسائل کو حل کرنے میں مدد دیتے رہے۔

کینن کے دورے

جب احسان اللہ لاہور سے ٹوبہ ٹیک سنگھ واپس گئے تو گو محنت ومشقّت کرنے اورتقریباً تمام وقت اسقفی علاقے کی جماعتوں میں دَورہ کرنے سے اُن کا مضبوط اورتناورجسم اب نڈھال ہو چکا تھا تاہم چرچ مشن لندن کی رپوٹ ہمیں بتاتی ہے کہ

> واپسی پر اُنہوں نے اپنے علاقے کا دَورہ شروع کر دیا اور مشکل سے کوئی گاؤں رہ گیا ہو گا جس میں وہ نہ گئے ہوں۔

اِس دَورے میں اُنہوں نے 70 بچوں کو بپتسمہ دیا اور جگہ بہ جگہ جماعتوں کو اُبھارا کہ وہ اپنے فرائض کو پہچانیں۔ وہ خاندانی پاکیزگی کا خاص خیال رکھیں تاکہ اُن کے گھر خدا کے پاک روح کے مَسکِن ہونے کے لائق ہوں۔ وہ جماعت میں باہمی محبّت کے ساتھ رہیں تاکہ سب لوگ جان لیں کہ وہ مسیح خداوند کے شاگرد ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ نجات کا پیغام

اپنے گاؤں کے ہندو، مسلمان، سکھ اور بُت پرست ہمسایوں کو سُنایا کریں۔ اُنھوں نے جسمانی کمزوری کے باوجود اپنا دَورہ مقدّس ہفتے سے پہلے ختم کر لیا۔

عیدِ قیامت کے بعد پسرور کی جماعت نے اُنہیں دعوت دی کہ آپ ہمارے خادموں اور گاؤں کے مبلّغوں اور اُستادوں کے سمر سکول میں آ کر جلسے کریں تاکہ جن جماعتوں کا پَودا آپ نے بیس برس ہوئے لگایا تھا وہ زیادہ پھل لا کر خدا کے جلال کا باعث ہو۔ احسان اللّٰہ گرمیوں میں پسرور گئے اور وہاں دو ہفتے قیام کر کے ایسی دل کو ہلا دینے والی تقریریں کیں کہ حاضرین کی طبیعت کا سکون ہل گیا۔ اُن کے ضمیر کانٹوں کی طرح اُن کے دلوں میں چُبھنے لگے۔ اپنی مدد آپ کے نام نہاد پاسبانوں کی سرمستیاں ختم ہوئیں، اور اُنھوں نے خدا سے عہد کر لیا کہ ہم مخلص اور پاک عمل زندگیاں بسر کر کے نیک نیّتی سے خدا اور اُس کی انجیل کی خدمت کریں گے۔

جب وہ پسرور سے ٹوبہ گئے تو اُن کی طبیعت زیادہ نڈھال ہو گئی۔ لیکن اِس کے باوجود منہ اندھیرے اُٹھنے کی عادت اور مصروفیات پہلے کی طرح برابر جاری رہیں۔ اُن کا گھر ہر وقت کُھلا رہتا تھا، اور ملازموں کو تاکید تھی کہ کسی شخص کو آنے سے نہ روکیں۔ تو بھی ملازم دوپہر کے وقت بعض اوقات جُرأت سے کام لے کر لوگوں کو روک دیتے تھے۔ اگرچہ جب میاں صاحب کو معلوم ہو جاتا تو وہ اُن سے ناراض ہوتے تھے۔ ایک موقعے کا ذکر ہے کہ وہ کسی گاؤں سے آئے اور تھکاوٹ سے چُور ہو کر لیٹ گئے۔ نیند آ گئی۔ اِتنے میں ایک شخص آیا۔ ملازم سے کہنے لگا، "پاسبان صاحب سے کہو کہ مسٹر..."

ابھی وہ اِتنا ہی کہنے پایا تھا کہ ملازم جس کا نام لدّھو تھا بِپھر کر بولا، "تم لوگ بے چارے بُوڑھے کو دم لینے نہیں دو گے۔ اِس کو ختم کر کے ہی چھوڑو گے۔ وہاں بیٹھ جاؤ۔ اور دم لو۔"

ملازم کی آواز اِتنی اونچی تھی کہ میاں صاحب جاگ پڑے۔ اُنہوں نے ملازم کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اُنہوں نے اونچی بولنے کا سبب دریافت کیا اور حکم دیا کہ اُس شخص کا نام دریافت کرو اور اُسے اندر بھیج دو۔ باہر جاکر اُس نے نام دریافت کیا تو جواب ملا کہ "مشٹر۔"

ملازم کو جھڑک مل چکی تھی۔ وہ طیش میں آکر کہنے لگا، "اوہ، مشٹر تو ہم سبھی ہیں، تم اپنا نام پتا بتاؤ۔" جب ملازم اُسے اپنے ساتھ اندر لے گیا تو میاں صاحب نے مُلاقاتی کو خاطرداری سے اپنے پاس بٹھایا اور ملازم کو کہنے لگے، "لڈّھو، ہم تم سے اِس بات پر خوش نہیں ہیں۔"

لڈّھو نے جواب دیا، "جناب، مَیں بھی آپ سے خوش نہیں ہوں۔ آپ ذرا بھی آرام نہیں کرتے۔ یہ شخص ایک دو گھنٹے بیٹھ سکتا تھا۔"

لیکن جسم کی ناتوانی اور کمزوری کے باوجود میاں صاحب ہر مُلاقاتی سے خوشی سے ملتے۔ بسا اوقات جماعتوں کے معاملات

اور گھریلو حالات کی وجہ سے وہ پریشان ہوتے لیکن جب کوئی شخص اُنہیں ملنے آتا وہ اُسے دیکھ کر ایسے خوش ہو جاتے کہ اُس کا دل فکروں کے بوجھ سے ہلکا ہو جاتا اور اُن کے بشاش چہرے کو دیکھ کر وہ خوش ہو جاتا تھا۔

غرض میاں صاحب کی جسمانی کمزوری بڑھتی گئی۔ جب مشن کے سیکرٹری کو خبر ملی تو اُس نے یہ تجویز کی کہ وہ دو ماہ کے لئے کراچی چلے جائیں تاکہ وہاں جا کر صحت مند ہو جائیں۔ کراچی کی آب و ہوا اُن کے موافق آئی۔ جب وہ ستمبر کے آخر میں واپس ٹوبہ آئے تو اُن کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہو چکی تھی۔ اُنہوں نے پھر آتے ہی گاؤں گاؤں کا دَورہ شروع کر دیا۔ جماعتوں میں جا بہ جا گئے۔ مبلّغوں کے کام کو دیکھا۔ اُستادوں کے سکولوں اور نائٹ سکولوں کا معائنہ کیا۔ ہر کارندے کو صلاح مشورہ دیا تاکہ وہ خداوند کے ہاتھ میں بہتر

اوزار ہو اور تُندہی سے جماعت کی خدمت کرے۔ استحکام پانے والے اُمید واروں کا ہر گاؤں میں جاکر امتحان لیا۔

1918ء کا سال انفلوئنزا کا سال تھا۔ جب لوگ دھڑا دھڑ مر رہے تھےتو میاں صاحب نِڈر ہو کر بیماروں کے پاس جاتے۔ اُن کے ساتھ دُعا کرتے، اُنہیں خدا کے پاس جانے کے لئے تیار کرتے، اُنہیں عشائے ربانی دیتے اور اُن کی بیواؤں اور یتیم بچوں کی پرورش وغیرہ کا انتظام کرتے رہے۔ اُس سال اموات اِس کثرت سے ہوئیں کہ جب بشپ ڈرنٹ ٹوبہ آئے تو استحکام کے ایک سَو سے زیادہ اُمیدواروں میں سے صرف 47 پیش ہو سکے۔ باقی اُمیدوار جن کی اکثریّت جوانوں کی تھی انفلوئنزا کا شکار ہو چکے تھے۔ بشپ صاحب حیران تھے کہ جسم کی کمزوری کے باوجود میاں صاحب جوانوں کی سی ہمّت اور جوش کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔

وہ خداوند کی خدمت دل و جان سے کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ اپنی طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ اور اِس طبیعت کا سانچہ اِتنا پُختہ ہو چکا تھا کہ وہ توڑا جا سکتا تھا، لیکن موڑا نہیں جا سکتا تھا۔ بشپ صاحب لکھتے ہیں،

مجھے احسان اللہ کا کام دیکھ کر از حد خوشی ہوئی ہے۔ بوڑھاپن اورضُعف کے باوجود وہ اپنے کام کو اِس محنت اورجاں نثاری سے کرتے ہیں اور اُسے اِس خوبی سے سرانجام دیتے ہیں کہ انسان عش عش کرتا رہ جاتا ہے۔

اُسی سال ڈاکٹر دینا ناتھ پریتو دِتّا اُن کی ملاقات کرنے کو ٹوبہ آئے، کیونکہ اُنہوں نے سُنا تھا کہ میاں صاحب کی طبیعت ناساز رہتی ہے۔ وہ اُن کے ساتھ چند ایک جگہوں میں گئے اور خدا کا کام دیکھ کر خدا کی بڑائی کرنے لگے جس نے اُنہیں اپنی خدمت کے لئے بُلایا ہے۔ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نائٹ سکول کا کام دیکھ کر بہت خوش ہوئے جس میں ساٹھ بالغ عیسائیوں کو گُورمکھی سکھائی جا رہی تھی تاکہ وہ خدا کا کلام

پڑھ سکیں۔ دونوں قدیم دوست دُعا کے بعد ایک دوسرے سے جُدا ہوئے اور جاتے جاتے کہہ گئے، "احسان، اپنی صحت کا خیال رکھو۔ خدا نے جو جسم تم کو دیا ہے اُس پر رحم کرو اور اُس سے اُس کی طاقت سے زیادہ کام نہ لو۔"

حق تو یہ ہے کہ احسان اللہ کی دل کی دھڑکنیں اُنہیں کہاں آرام لینے دیتی تھیں۔ وہ خدا کے کام میں بدستور اپنی خصوصی سرگرمی اور گرم جوشی سے مشغول رہے۔ وہ نہ سردی کا لحاظ کرتے تھے، نہ گرمی کا۔ نہ دن کا لحاظ کرتے تھے، نہ رات کا۔ جسم کی تھکاوٹ کی پروا کئے بغیر خداوند کا یہ عاشق کام کرتا گیا اور پروانے کی طرح انجیل کی شمع کے چوگرد فِدا ہوتا گیا۔ لیکن ساتھ ہی جسم بھی روز بروز نڈھال ہوتا گیا۔

چرچ مشن کے سیکرٹری اُس وقت گف تھے جو اُنہیں نارووال سے جانتے تھے۔ 1921ء میں اُنہوں نے میاں صاحب کو شملہ سے چالیس میل پرے کوٹ گڑھ بھیج دیا اور

کہا، ”آپ وہاں قیام کریں اور وہاں سے ٹوبہ کے علاقے کے کام کی نگرانی کریں۔ ساتھ ساتھ وہاں کے مسٹر ڈیوڈ کو پریسٹ کے عُہدے کے لئے تیار بھی کر دیں۔“ چنانچہ میاں صاحب نے گرمیوں کے مہینے کوٹ گڑھ میں کاٹے۔ وہاں عبادتوں میں وہ وعظ کرتے تھے جن کی اعلیٰ روحانیّت دُور دُور سے لوگوں کو کوٹ گڑھ کھینچ لاتی تھی۔

جب سادھو سُندر سنگھ نے سُنا کہ میاں صاحب کوٹ گڑھ آئے ہوئے ہیں تو وہ اُن سے ملنے گئے اور اُن کے پاس دس دن قیام کیا۔ ہم خیال کر سکتے ہیں کہ یہ دونوں مرد جنہوں نے اپنی زندگیاں دیوانہ دار خداوند کی انجیل کی خاطر وقف کر دی تھیں ایک دوسرے کی ملاقات سے کس قدر محظوظ ہوئے ہوں گے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ روحانی یگانگت میں راتوں خداوند سے دُعا کرنے اور اُس کی تعریف و حمد کرنے میں گُزار دیتے تھے۔ اِس ملاقات کے دوران سادھو جی نے ایک اتوار کو وہاں وعظ بھی کیا۔ اِن دونوں مقدّسوں کی یہ

آخری ملاقات تھی۔ اِس کے بعد وہ ایک دوسرے سے خدا کی حضوری میں آسمان پر ملے۔

جب میاں صاحب کوٹ گڑھ سے اکتوبر میں واپس آئے تو اُن کی طبیعت قدرے سنبھل چُکی تھی۔ پہاڑ کی آب و ہوا نے اُن کی صحت کو ایک حد تک بحال کر دیا تھا۔ وہ کوسوں چلنے کے عادی تھے، اور کوٹ گڑھ میں حسبِ عادت میلوں پیدل نکل جاتے۔ دھن سنگھ صاحب اور ڈیوڈ صاحب اُن کے ہمراہ ہوتے تھے جن سے وہ لُطف و محبّت کی باتیں کیا کرتے اور انُہیں روحانی برکات سے مالامال کیا کرتے تھے۔ اُن کی صحبت اور پہاڑ کے قیام نے اُن کی خرابیٔ صحت کو بہت حد تک درست کر دیا، اور وہ ٹوبہ آ کر حسبِ دستور اپنے کام میں اپنے خصوصی جوش کے ساتھ مشغول ہو گئے۔

جب 1922ء کا موسمِ بہار گزُر گیا تو میاں صاحب کی طبیعت موسمِ گرما میں خراب ہونی شروع ہوگئی۔ اُنہوں نے کمیٹیوں کے سلسلے میں لاہورجانا تھا۔ اِس سلسلے میں اُنہوں نے وہاں

کے ڈاکٹروں سے معائنہ کروایا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ وہ یا تو اپنے کام میں تن آسانی اختیار کریں یا خدمت سے فارغ ہو جائیں۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ انجیل کی تبلیغ اور جماعت کی خدمت اور پھر آرام اور تن آسانی! یہ دو باتیں متضاد ہیں۔ مجھے مشن کی خدمت سے سبک دوش ہونا منظور ہے لیکن مَیں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ انجیل کی سی شان دار خدمت میں تن آسانی سے کام کروں جس میں محنت کی ضرورت ہے۔

احباب نے مشورہ دیا کہ آپ اِس گرمیوں کے موسم کو اَور دیکھ لیں اور پہاڑ چلے جائیں۔ اِس پر بھی اگر طبیعت کمزور ہی رہی تو فارغ الخدمت ہو جائیں۔ آپ کی عمر بھی 65 سال کی ہو جائے گی۔

اگر احسان اللہ کی رفیقۂ حیات اُن کے ساتھ ہوتیں اور اُن کے کھانے پینے سونے وغیرہ کی دیکھ بھال کرتیں تو جیسا اُن کا بدن تنومند تھا اور اُن کی عادات فطرت کے مطابق تھیں وہ اِس عُمر میں نہ صرف جواں ہمّت اور جواں بخت ہوتے بلکہ

جوانوں سے بھی بڑھ کر کام کرتے اور پھر بھی جسم پر کوئی بُرا اثر نہ پڑتا۔ لیکن گھر کا آرام اُن کے نصیب میں نہ تھا۔ اُن کی رفیقۂ حیات کو ٹوبہ آنے کے بعد جنون کے شدید دَورے ہونے لگے۔ اگرچہ اُنہوں نے علاج کیا، مگر بے فائدہ۔ اُنہوں نے اپنی رضامندی ظاہر کی کہ اُن کی رفیقۂ حیات کو مینٹل ہسپتال میں داخل کیا جائے۔ لیکن ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ جب جنون کی تشدّدانہ صورت میں افاقہ ہو مجھے اطلاع دی جائے تاکہ مَیں اُنہیں اپنے ساتھ گھر لے جاؤں اور اُن کی خدمت خود کروں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب اُن کی بیماری میں اصلاح کی صورت نظر آئی تو وہ اُنہیں اپنے ساتھ لے آئے۔ گھر میں آ کر اُن کی طبیعت سنبھل گئی۔ سب نے خوشی منائی اور خدا کا شکر کیا۔ لیکن یہ حالت دیرپا نہ رہی، اورمرض پہلے سے بھی زیادہ زور کے ساتھ بڑھ گیا یہاں تک کہ اُنہیں دوبارہ آگرہ کے مینٹل ہسپتال میں بھیجنا پڑا جہاں وہ کئی سال رہیں۔

اِس بیماری کا اثر میاں صاحب پر یہ ہوا کہ اُنہیں کبھی گھر کا آرام نہ ملا۔ لیکن اُنہوں نے کبھی اضطراب کا اظہار نہ کیا۔ یہ قلبی اضطراب ہمیشہ دل ہی میں رہا۔ گو دل اشک بار تھا لیکن آنکھیں ہمیشہ خُشک ہی رہیں۔ وہ اپنی طبیعت کو ضبط میں لانے کے عادی ہو چکے تھے۔ اُنہوں نے اِس صورتِ حال کو پورے صبر اور سکون سے برداشت کیا، ایسا کہ اُن کے وقار کے دامن پر کبھی پریشانی کا دھبّہ نہ لگا۔ وہ پولس رسول کی طرح کہتے تھے،

> لیکن مجھے اِن اعلیٰ انکشافات کی وجہ سے ایک کانٹا چبھو دیا گیا، ایک تکلیف دہ چیز جو میرے جسم میں دھنسی رہتی ہے تاکہ مَیں پھول نہ جاؤں۔ ابلیس کا یہ پیغمبر میرے مُکے مارتا رہتا ہے تاکہ مَیں مغرور نہ ہو جاؤں۔ تین بار مَیں نے خداوند سے التجا کی کہ وہ اِسے مجھ سے دُور کرے۔ لیکن اُس نے مجھے یہی جواب دیا، "میرا فضل تیرے لئے کافی ہے، کیونکہ میری قدرت کا پورا اظہار تیری کمزور

> حالت ہی میں ہوتا ہے۔" اِس لئے مَیں مزید خوشی سے اپنی کمزوریوں پر فخر کروں گا تاکہ مسیح کی قدرت مجھ پر ٹھہری رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں مسیح کی خاطر کمزوریوں، گالیوں، مجبوریوں، ایذا رسانیوں اور پریشانیوں میں خوش ہوں، کیونکہ جب مَیں کمزور ہوتا ہوں تب ہی مَیں طاقت ور ہوتا ہوں۔ (2۔کُرِنتھیوں 12:7–10)

حوصلہ شکن حالات میں وہ انجیل جلیل کی تبلیغ اور جماعت کی خدمت اِس انہماک کے ساتھ کرتے رہے کہ گویا اُن کی زندگی میں اُن کی رفیقۂ حیات کی بیماری اور دیگر مُشکلات و مصائب کا سایہ بھی نہیں پڑا۔ وہ پولس رسول کی طرح کہہ سکتے تھے،

> اگرچہ مَیں سب لوگوں سے آزاد ہوں پھر بھی مَیں نے اپنے آپ کو سب کا غلام بنا لیا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جیت لوں۔ (1۔کُرِنتھیوں 9:19)

مَیں اُن سے زیادہ مسیح کی خدمت کرتا ہوں۔ مَیں نے اُن سے کہیں زیادہ محنت مشقت کی...بار بار مرنے کے خطروں میں رہا ہوں ...میرے بےشمار سفروں کے دوران مجھے کئی طرح کے خطروں کا سامنا کرنا پڑا، دریاؤں اور ڈاکوؤں کا خطرہ، اپنے ہم وطنوں اورغیریہودیوں کے حملوں کا خطرہ۔...جھوٹے بھائیوں کی طرف سے بھی خطرے رہے ہیں۔ مَیں نے جاں فشانی سےسخت محنت مشقت کی ہے اورکئی رات جاگتا رہا ہوں، مَیں بھوکا اور پیاسا رہا ہوں، مَیں نے بہت روزے رکھے ہیں۔ مجھے سردی اور ننگے پن کا تجربہ ہوا ہے۔ اور یہ اُن فکروں کے علاوہ ہے جو مَیں خدا کی تمام جماعتوں کے لئے محسوس کرتا ہوں اور جو مجھے دباتی رہتی ہیں۔ جب کوئی کمزور ہے تو مَیں اپنے آپ کو بھی کمزور محسوس کرتا ہوں۔ جب کسی کو غلط راہ پر لایا جاتا ہےتو مَیں اُس کے لئے شدید رنجش محسوس کرتا ہوں۔ اگر مجھے فخر کرنا پڑے تو مَیں اُن چیزوں پر فخر کروں گا جو میری کمزور حالت ظاہر کرتی ہیں۔ (2۔کرِنتھیوں 11:23–30)

لیکن یہ باتیں جسم پر اثر کیے بغیر نہیں ہو سکتیں۔ اُن کا مضبوط اور تناور جسم اندر ہی اندر گھل گیا۔ اِس کے پیشِ نظر اُنہوں نے خدا سے دُعا کرنے کے بعد یہ فیصلہ کر لیا کہ اِس سال کے آخر میں جہاں تک مشن کا تعلّق ہے مَیں اپنی خدمت سے سبک دوش ہو جاؤں گا۔

اُس سال گرمیوں میں وہ پالم پور گئے جہاں سے وہ ستمبر کے مہینے میں واپس ٹوبہ ٹیک سنگھ چلے گئے۔ فارغ الخدمت ہونے سے پہلے اُنہوں نے یکم نومبر 1922ء سے دو ماہ کی رُخصت لے کر ٹوبہ ٹیک سنگھ کو بائیس سال کی خدمت کے بعد چھوڑ دیا۔ جھنگ بار کے علاقے کی جماعتوں اور خاص کر ٹوبہ ٹیک سنگھ کی جماعتوں کو ایسا معلوم ہوا کہ اُن کے سر پر سے باپ کا سایہ جاتا رہا اور وہ یتیم ہو گئے ہیں۔ اُنہوں نے سب کو خدا کے سپرد کیا، اور سب نے اُنہیں خدا کے سپرد کیا۔

17

زندگی کے آخری ایّام

احسان اللہ یکم جنوری 1923ء سے مشن کی خدمت سے فارغ ہو گئے، لیکن انجیل جلیل کی خدمت سے وہ نہ کبھی فارغ ہو سکتے تھے اور نہ تا دمِ مرگ ہوئے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے وہ اپنے دوستوں اور رشتے داروں کے گھروں میں گئے۔ لیکن جہاں کہیں گئے اپنے نجات دہندے کا پیغام سُناتے رہے۔ نیز، جس خادم کو ملے اُسے وہ اپنے مفید مشوروں اور روحانی تجربوں سے مُستفید کرتے رہے۔

اُنہوں نے دُنیا کی چیزوں کو جوڑنے اور بٹورنے کا کبھی خیال بھی نہ کیا تھا۔ پولس رسول کے الفاظ اُن پر لفظ بلفظ صادق آتے ،

> ہم غریب حالت میں بہتوں کو دولت مند بنا دیتے ہیں۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے، توبھی ہمیں سب کچھ حاصل ہے۔ (2۔کرِنتھیوں 10:6)

اُنہوں نے انجیل کا خالص پیغام ہر چھوٹے بڑے تک پہنچایا اور اُس میں ہر قسم کی آمیزش کے خلاف صدائے احتجاج بُلند کی۔ مشن کی خدمت سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے احباب کے ہاں گئے، رشتے داروں کے پاس قیام کرتے رہے، لیکن جہاں بھی گئے اپنے جوش کو متعدّی کر کے ہر جگہ اور ہر قسم کے لوگوں میں پھیلاتے گئے۔

1923ء میں مَیں ڈیکن کے عُہدے پر مامور ہو کر نارووال بھیجا گیا۔ اُن دنوں میں وہاں طاعون کی وبا زوروں پر تھی۔

1924ء میں وہ میرے پاس آئے اور چند ہفتے قیام کر کے مجھے نہایت مفید مشورے دیتے رہے۔ وہ یہ کہہ سکتے تھے

> مجھے مسیح کے ساتھ مصلوب کیا گیا اور یوں مَیں خود زندہ نہ رہا بلکہ مسیح مجھ میں زندہ ہے۔ (گلتیوں 2:19–20)
>
> کیونکہ میرے لئے مسیح زندگی ہے اور موت نفع کا باعث ...ایک طرف مَیں کوچ کر کے مسیح کے پاس ہونے کی آرزو رکھتا ہوں، کیونکہ یہ میرے لئے سب سے بہتر ہوتا۔ لیکن دوسری طرف زیادہ ضروری یہ ہے کہ مَیں آپ کی خاطر زندہ رہوں۔ (فلپّیوں 1:21–24)

وہ جسم میں کمزور تھے،

> لیکن رب سے اُمید رکھنے والے نئی طاقت پائیں گے اور عقاب کے سے پَر پھیلا کر بلندیوں تک اُڑیں گے۔ نہ وہ دوڑتے ہوئے تھکیں گے، نہ چلتے ہوئے نڈھال ہو جائیں گے۔ (یسعیاہ 40:31)

وہ میری رفیقۂ حیات کو شادی سے پہلے دہرہ دون سے جانتے تھے۔ ہم دونوں کا عقد بھی اُنہوں نے ہی باندھا تھا۔ اور وہ اُن سے بے حد اُنس و محبّت رکھتے تھے۔ اہلیہ بھی اُن کا ہر طرح سے خیال رکھتیں۔ جب وہ میرے پاس آئے تو اُنہیں رعشے کی بیماری شروع ہو چکی تھی۔ عبادت گاہ میں باقاعدہ عبادت کے وقت جاتے اور غیر مسیحیوں کو نجات کا پیغام سُنایا کرتے تھے۔ وہ مجھے روحانی تجربوں سے مستفید کیا کرکے انجیل جلیل اور خداوند کی زندگی سے ایسے نکات اور رموز بتاتے تھے جو مَیں نے کبھی کسی تفسیر میں نہ پڑھے تھے۔

ہر بحر کا ساحل ہوتا ہے، اِس بحر کا ساحل کوئی نہیں۔

اگرچہ وہ بیمار تھے، لیکن وہ دوسروں سے اپنی بیماری کا ذکر کرکے ہم دردی کے کبھی طالب نہ ہوتے تھے۔ اِس کے برعکس وہ ہر وقت صابر، راضی برضائے الٰہی اور خوش نظر آتے تھے۔ اُنہیں خدا کی طرف سے عجب اطمینان حاصل تھا، کیونکہ

اُن کی زندگی ہمیشہ پاکبازوں کی زندگی تھی۔ وہ پولس رسول کے ہم زبان ہو کر کہہ سکتے تھے،

> ہم کسی کے لئے بھی ٹھوکر کا باعث نہیں بنتے تاکہ لوگ ہماری خدمت میں نقص نہ نکال سکیں۔ (2۔کُرِنتھیوں 3:6)

یہ بھی خدا کا انتظام تھا کہ جب مَیں ڈیکن ہوا تو وہ میری تجربہ کاری کے دنوں میں مجھے اپنے تجربے سے مستفیض کرتے رہے۔ ایک دن مَیں کسی سے باتوں باتوں میں کچھ کہہ گیا جس سے شیخی کی بُو ٹپکتی تھی۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا، "لڑکے، اِدھر آ۔" اور اپنے پاؤں کو زمین پر سختی سے رگڑ کر کہنے لگے، "جب تک کہ تُو اِس مٹی کی طرح پاؤں کے نیچے پِسنا خوشی سے قبول نہ کرے گا تُو خدا کا اچھا خادم نہیں بن سکے گا۔ ے

> خاک شَو پیش از آنکہ خاک شوی
>
> خاک بن جا، اِس سے پہلے کہ تُو خاک بن جائے۔

ہمیشہ عاجزی سے کام لو۔ طبیعت میں خداوند مسیح کا سا حِلم رکھو اور یاد کرو کہ

> نہد شاخِ پُر میوہ سر بر زمین
> پھل سے لدی ہوئی شاخ اپنا سر زمین پر رکھ دیتی ہے۔"

ایک اتوار کی بات ہے جب مَیں عبادت گاہ میں وعظ کر کے گھر آیا تو وہ فرمانے لگے، "تُو نے آج یہ کیا وعظ کیا تھا؟ کیا تُو خیال کرتا ہے کہ تیرے سامنے کالج کے لڑکے بیٹھے ہیں اور تُو لیکچر دے رہا ہے؟ وعظوں میں گرمی اور گُداز ہونی چاہیے۔ اُن میں زندگی نواز تاثّرات ہونے چاہئیں۔ اُن میں مثالوں پر مثالیں ہونی چاہئیں تاکہ وہ سادہ لوگوں کے دلوں میں اثر آفرین ہوں۔ تیرے وعظوں کا رنگ پُختہ نہیں ہوتا۔ تُو خیال کرتا ہے کہ وعظوں میں نازک اور لطیف تصوّرات اور عالمانہ خیالات ہونے چاہئیں جن میں مناسب الفاظ استعمال ہوں۔ لیکن وعظوں میں تو دل کی دھڑکنیں ہونی

چاہئیں۔ اُن میں جذبات کا جوش نہیں چاہیئے، کیونکہ اعلیٰ روحانیّت کا واعظانہ سیمابیّت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

ایک دفعہ مجھے اپنے اپریشن کے لئے روپئے کی ضرورت پڑی۔ مَیں نے ارادہ کیا کہ مشن کے سیکرٹری کو لکھوں۔ اُنہوں نے منع کیا اور کہا، "برکت، یاد رکھو،

> آنکہ شیراں راکُند روباہ مزاج
>
> احتیاج است، احتیاج است، احتیاج
>
> جو کچھ شیروں کو لومڑیوں کا سا مزاج دلا دیتی ہے
>
> وہ ضرورت ہے، ضرورت ہے، ضرورت۔

اگرتم روپئے کی امداد مانگ بیٹھے اور اُنہوں نے دے بھی دی توتمہاری نظریں عُمر بھر نیچے رہیں گی۔ اورتم اپنے وقار کو ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھو گے۔ اپنے اخراجات اورضروریات کوکم کر دو توتم کوکبھی روپئے کی کمی نہ ہو گی۔"

اُن کا یہ سبق مَیں مُدّت العُمر نہیں بھولا۔ اور مَیں نے مشن کے سامنے کبھی کچھ نہ مانگا۔اُن دنوں میں وہ اکثر کہا کرتے

تھے، "میرے کوچ کا وقت آ پہنچا ہے۔ مَیں اچھی کُشتی لڑ چکا۔ مَیں نے دَوڑ کو ختم کر لیا ہے۔"

ایک دفعہ ایک اَور خادم نے وعظ کے دوران چند ایک لوگوں کو منبر پر سے کوسا۔ اُنہوں نے عبادت کے بعد اُسے اپنے پاس بُلایا اور شفقت سے کہا، "میرے جوان بھائی۔ منبر لوگوں کو کوسنے کے لئے نہیں ہوتا۔ اگر جو تم نے کہا ہے سچ بھی ہو پھر بھی حقائق کو تلخ نوائی سے بیان کرنے سے مقصد پورا نہیں ہوتا۔ جلی کٹی سُنانے سے ہمیشہ پرہیز کرو۔" پھر اپنے دل پر مُکّا مار کر کہنے لگا، "بیٹا، پہلے یہاں اپنے آپ کو مُکّے مارو۔ تو یہ مُکّے خود بخود لوگوں کے دلوں پر لگیں گے۔ اور تم کو کسی کے خلاف ایک لفظ کہنے کی بھی ضرورت نہ پڑے گی۔ ورنہ لوگ تم کو یہی کہیں گے کہ

> خود را فضیحت، دیگراں را نصیحت
>
> خود بُرے کام کرنا اور دوسروں کو نصیحت کرنا۔"

ایک اَور پاسبان منبر پر سے اپنی بھیڑوں کی بُری طرح خبر لے رہے تھے۔ عبادت کے بعد اُنہوں نے اُسے کہا، "بیٹا، چرواہے کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ بھیڑوں کو اپنی لاٹھی سے مارے بلکہ اُس کا کام یہ ہے کہ بھیڑوں کو چَرائے۔"

ایک دفعہ ایک خادم نے پوچھا، "جناب، مَیں تو سالوں سے خدا کی خدمت کر رہا ہوں۔ کیا وجہ ہے کہ کسی شخص کا دل میرے وعظوں سے تبدیل نہیں ہوا حالانکہ مَیں بڑی کوشش سے اُنہیں تیار کرتا ہوں؟"

اُنہوں نے اُس سے پوچھا، "کیا تم خود یہ کبھی خیال کرتے ہو کہ جب تم اپنا مُنہ کھولو تو تمہارے کلام سے کسی کی زندگی میں تبدیلی واقع ہو جائے گی؟"

اُس نے جواب دیا، "نہیں، صاحب، مَیں یہ اُمید کبھی نہیں کرتا۔"

اُنہوں نے کہا، "بس، یہی وجہ ہے کہ اب تک تمہارے ذریعے کسی کے دل کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ولیم کیری کا مقولہ یاد رکھو کہ خدا سے بڑی بڑی باتوں کی اُمید رکھو اور اُس کے لئے بڑی بڑی باتوں کی کوشش کرو۔"[a]

جب وہ میرے پاس نارووال آتے تو مجھے کہتے کہ تحریر و تقریر سے جماعت کو مغرب کی فرقہ بندیوں کی قیود سے آزاد کرانے کی کوشش کرو تاکہ پنجاب کی جماعت اپنے پاؤں پر کھڑی آزادانہ زندگی گزار سکے۔ لیکن یہاں مغرب کے زر نے اور ضابطوں نے ایسا جکڑ رکھا ہے کہ ؎

> اپنی رہائی کی تمنّا بھی ہے ناپاک۔

نارووال سے وہ اکثر گوجرانوالہ تشریف لے جاتے اور چودھری عنبر صاحب کے گھر میں رہتے۔ مسز عنبر صاحبہ جو اُن کے دیرینہ دوست رحمت مسیح واعظ کی بیٹی تھیں اُن کی خدمت میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتی اور ہر طرح سے اُن سے

Expect great things from God; attempt great things for God[a]

بیٹی کا سا سلوک کرتی تھیں۔ مسز عنبر کا ہنس مُکھ چہرہ اُن کی طبیعت میں بشاشت پیدا کر دیتا اور وہ اپنے مرض تک کو بھول جاتے تھے۔ گوجرانوالہ میں مسز عنبر صاحبہ کے گھر میں اُن کے پُرانے چیلے اور رفیق اُنہیں ملنے کے لئے آ جایا کرتے تھے۔ لبُّھو مل بھی وہیں مقیم تھے۔ غرض، اُس شہر میں اُن کا وقت بہت اچھی طرح کٹتا تھا۔

گوجرانوالہ کے علاوہ وہ بابو رمّال شاہ کے پاس جا کر کئی ہفتے کاٹ آتے اور گہنا مل صاحب سے بھی ملاقات کر آیا کرتے تھے۔ لیکن وہ اپنا اکثر وقت اپنے بیٹے قربان کے پاس ملتان میں کاٹتے یا میرے پاس نارووال آ جاتے یا گوجرانوالہ میں مسز عنبر صاحبہ کے پاس قیام کرتے تھے۔

آخری دفعہ جب وہ گوجرانوالہ گئے تو اُن کی ملاقات مارچ 1929ء میں قبلہ رحمت مسیح سے ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں،

میاں صاحب نے آخری ایّام بہت ہی تکلیف میں گزارے۔ رعشے سے تمام بدن کا رُواں رُواں اِس طرح کانپتا رہتا تھا

جس طرح سخت آندھی میں درخت کی شاخیں جُنبش کرتی ہیں۔ حرکت کسی وقت بھی نہیں ٹھہرتی تھی۔ اُن کی تکلیف دیکھ کر میرے آنسو نکل پڑے۔ وہ نہ بیٹھ سکتے تھے، نہ کھڑے رہ سکتے تھے، نہ زیادہ دیر لیٹ سکتے تھے۔ گو وہ ہر وقت بے چین رہتے تھے لیکن اُن کے مُنہ سے "ہائے، ہائے" یا خدا کی نسبت شکایت کا ایک لفظ بھی کبھی نہ نکلا۔ ایّوب کی طرح اُنہوں نے صبر سے سب کچھ برداشت کیا۔ خواہ آسمان صاف تھا یا تاریک، احسان اللّٰہ کا ایمان کبھی متزلزل ہونے نہ پایا۔ واقعی خدا ہم کو دُکھوں سے کامل کرتا ہے۔

جب مَیں نے سُنا کہ اُن کی وفات ہوگئی ہے تو خدا کا شکر کیا کہ اُس نے اپنے بندے پر رحم کرکے دُنیا کے جسمانی دُکھوں سے آرام بخشا۔ اب وہ وہاں ہیں جہاں نہ دُکھ ہے، نہ غم، جہاں حمد وثنا اور قدوس قدوس کی آوازیں ہر طرف سے آتی ہیں۔

اُن کے آخری ایّام اپنے بڑے بیٹے قربان کے گھر ملتان میں گُزرے۔ وفات سے پہلے وہ پندرہ روز بستر پر ہی پڑے

رہتے تھے، کیونکہ وہ رعشے کے سبب بہت کمزور ہو گئے تھے۔ لیکن اِس کے باوجود اُن کا چہرہ سُرخ تھا اور اُس پر بدستور رونق، شگفتگی اور شادابی تھی۔ اور وہ تندرست معلوم ہوتے تھے۔ وہ قربان اور اُس کی بیوی بچوں سے باتیں کیا کرتے تھے اگرچہ آواز قدرے دھیمی ہو گئی تھی۔ 22 ستمبر بروز اتوار اُنہوں نے قبض کی شکایت کی جس کا فوراً علاج کیا گیا، اور وہ دو پہر کے وقت ہلکی غذا کھا کر سو گئے۔ نیند کی حالت میں اُنہیں بخار ہو گیا جو اچانک سخت ہو گیا۔ اگلے روز بخار اِس سے بھی تیز ہو گیا، اور اُن پر غشی طاری ہو گئی۔ 23۔ ستمبر 1929ء کی رات کو ساڑھے دس بجے اُن کی نبض کی رفتار نہایت مدھم ہو گئی اور گیارہ بجے اُنہوں نے اپنے نجات دہندے کی آغوش میں آرام پایا۔ وفات کے وقت اُن کی عُمر تقریباً 72 سال کی تھی۔

جب اُن کی وفات کی خبر مختلف مقاموں میں پہنچی تو پنجاب کے طول و عرض میں ماتم کی آواز بُلند ہوئی۔ گنڈا مل لکھتے ہیں،

> جب اُن کے انتقال کی خبر مجھے ملی تو مَیں غم کے مارے کھڑا نہ ہو سکا اور گر پڑا۔ بے ساختہ میرے مُنہ سے نکلا، "ہائے میرے باپ، میرے باپ! اسرائیل کے رتھ اور اُس کے گھوڑے! (2۔سلاطین 11:2)"

دہلی کے ایس۔اے۔ سی گھوش نے لکھا،

> احسان اللہ اُس گروہ میں شامل ہو چکے ہیں جو کھجور کی ڈالیاں ہاتھ میں لئے ہوئے تخت اور برّے کے سامنے دن رات اُس کی تمجید میں مشغول ہیں۔ جب آسمان پر عبرانیوں کے خط کے گیارھویں باب کی ترمیم شدہ جلد نکلے گی تو اُس میں لکھا ہو گا، "ایمان ہی سے احسان اللہ نے..."

احسان اللہ کا جسم ملتان کے قبرستان میں مدفون ہے، لیکن احسان اللہ وہاں مدفون نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے، اور اُس کے

کام اُس کے پیچھے پنجاب کی جماعت میں زندہ ہیں۔ وہ سَوگُنا اور ساٹھ گُنا پھل لا رہے ہیں۔

> پھر مَیں نے آسمان سے ایک آواز یہ کہتی ہوئی سنی، ”لکھ، مبارک ہیں وہ مُردے جو اب سے خداوند میں وفات پاتے ہیں۔“
> ”جی ہاں،“ روح فرماتا ہے، ”وہ اپنی محنت مشقت سے آرام پائیں گے، کیونکہ اُن کے نیک کام اُن کے پیچھے ہو کر اُن کے ساتھ چلیں گے۔ (مکاشفہ 14:13)